www.urducouncil.nic.in
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

فروری 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

17واں کل ہند اردو کتابی و تہذیبی میلہ

اورنگ آباد: کتاب دوستی کی روشن مثال

کتاب میلے کے دلکش مناظر

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:02 فروری 2015

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون: 040-24415194

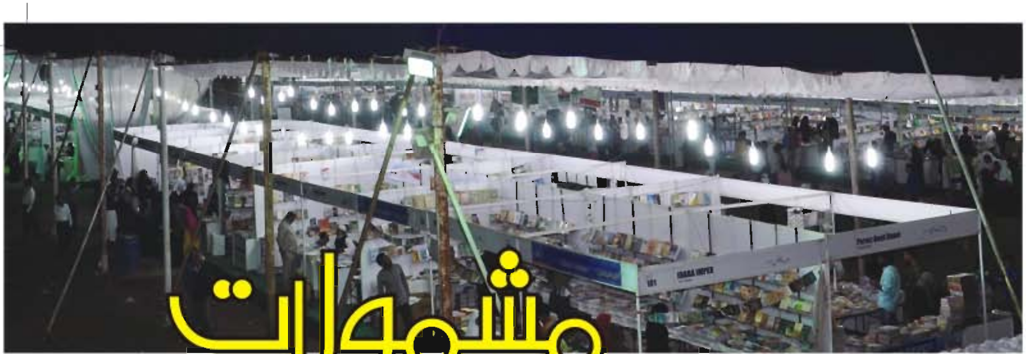

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
میں جو کچھ ہوں اردو کی بدولت ہوں: پروفیسر حنیف کیفی — کوثر مظہری 9

کور اسٹوری
کل ہند تہذیبی و کتابی میلہ — امتیاز وحید 13

زبان و تعلیم
اردو ریسرچ اسکالر کے مسائل اور حل — آمنہ آفرین 27

ولادت صدی
عزیز احمد: فن اور شخصیت — محمد مطیع الرحمن 29
عزیز احمد کے افسانوی امتیازات — ایم نسیم اعظمی 33
قاتل کبیر — عزیز احمد 36
ملکہ ترنم بیگم اختر — شمس الہدیٰ 39

یوم پیدائش پر
ذاکر حسین: ایک سوانحی خاکہ — کامل قریشی 41
ذاکر حسین کی شخصیت: مولانا عبدالماجد دریابادی سے خط و کتابت کی روشنی میں — سلیم قدوائی 47

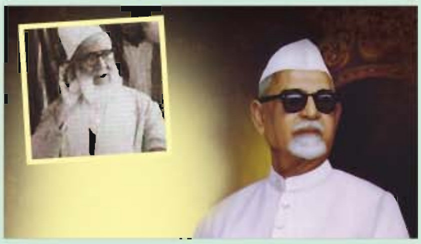

ادبی مباحث
’وحیِ منظوم‘ کی ادبی اہمیت وانفرادیت — رشید اشرف خان 51
برج پریمی ایک مطالعہ — پریمی رومانی 54
کشمیر میں اقبالیاتی ادب — رخسانہ رحیم 57

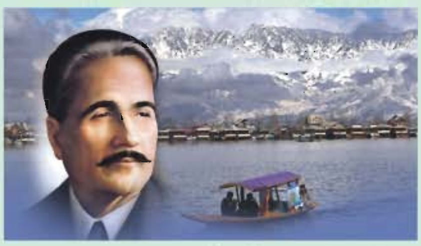

ہم نے جنھیں بھلا دیا
شاہد کبیر: نئی غزل کا شاعر — ثمیر کبیر 59

کریئر
نئے سال کا فائدہ اٹھائیں — سمیع الدین خاں 61

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 64

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 73

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 76

ہماری بات

کتابوں کے میلے سجانا قومی اردو کونسل کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ اپنے قیام سے لے کر اب تک کونسل ہر سال ملک کے مختلف حصوں میں کتاب میلوں کا اہتمام کرتی آئی ہے۔ کبھی کبھی ایک سال میں دو میلوں کا بھی انعقاد ہوا ہے۔ ان کتاب میلوں میں اردو والوں کی شرکت کے تعلق سے بھی کئی طرح کے تجربات ہوئے۔ کبھی عوامی دل چسپی توقع کے مطابق دیکھنے میں آئی تو کونسل کے کارکنوں نے، جو مکمل نظم وضبط اور جوش وخروش کے ساتھ میلے کے انتظام میں جٹے رہتے ہیں، آئندہ میلے کو اور بھی خوب صورت اور دل چسپ بنانے کے نقشے مرتب کیے۔ کبھی توقع سے بہت کم لوگ میلے میں آئے تو ان ہی کارکنوں کے دل اداس ہو گئے اور پھر انھوں نے خود ہی محاسبہ بھی کیا کہ اپنے کام میں ہم نے ایسی کیا کمی چھوڑ دی جو میلہ توقع کے مطابق کامیاب نہیں ہوسکا۔ لیکن پھر ایسے مرحلے بھی آئے جب کتاب میلوں نے توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی اور عوامی شرکت کے ساتھ کتابوں کی فروخت کے بھی نئے ریکارڈ قائم ہوئے اور ہمارے کارکن، مسرت وشادمانی کے تاثرات لے کر نئے جوش اور ولولے کے ساتھ کونسل کے صدر دفتر واپس آئے۔

مغربی ہندوستان میں اردو کے سب سے بڑے مرکز اورنگ آباد کا اردو کتاب میلہ بھی ایک ایسا ہی میلہ ثابت ہوا جس میں نہ صرف بھرپور عوامی شرکت کے حیرت افزا نظارے دیکھنے کو ملے بلکہ کتابوں کی فروخت کا بھی ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا۔ 9 دن کے اس میلے میں 1 کروڑ 29 لاکھ روپے کی کتابیں خریدی گئیں جو اردو کتاب میلوں کا آج تک کا سب سے بڑا ریکارڈ ہے اور یہ صرف کونسل کے کتاب میلوں کا نہیں بلکہ دیکھا جائے تو حصول آزادی کے بعد اب تک ہندوستان میں منعقد ہونے والے سبھی طرح کے اردو کتاب میلوں کے لیے ایک نیا ریکارڈ ہے۔ خود اردو کونسل نے بھی اس مرتبہ اپنی سب سے زیادہ کتابوں کی فروخت کا ریکارڈ قائم کیا ہے جس کی تفصیل آپ زیر نظر شمارے کی کور اسٹوری میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اگر چہ کتابوں کی فروخت کے اعداد وشمار اپنے آپ میں سب کچھ نہیں ہیں لیکن ان سے اتنا اشارہ ضرور ملتا ہے کہ زبان کس طرف جارہی ہے۔ اورنگ آباد میں حاصل ہونے والی اس کامیابی کو وسیع تناظر میں دیکھا جانا چاہیے کہ یہ صرف ایک علاقے کی نہیں پورے ملک کی کامیابی ہے۔ یہی نہیں اس کامیابی کا اس طور پر بھی تجزیہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف مراٹھواڑہ کے ان علاقوں میں اردو پھل پھول رہی ہے جو لسانی تاریخ کے کسی دور میں اردو کے گڑھ نہیں رہے اور دوسری طرف شمالی ہندوستان کے وہ علاقے اردو سے تقریباً خالی نظر آتے ہیں جہاں اردو پروان چڑھی، اور جہاں ماضی قریب تک اردو زبان کا ہی بول بالا تھا۔ قومی اردو کونسل اپنی طرف سے بھرپور کوشش کر رہی ہے کہ اردو کو زندگی کے ہر شعبے تک پھیلا دیا جائے۔ اس نے اردو کی تعلیم کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے جوڑا ہے۔ اردو دنیا، بچوں کی دنیا اور فکر وتحقیق جیسے اپنے جریدوں کو ہندوستان کے اس نوع کے تمام جریدوں سے زیادہ معیاری اور خوب صورت شکل میں پیش کر کے اردو قارئین تک پہنچایا ہے۔ ان سیکڑوں اہم کتابوں کو بہت کم قیمت پر شائع کیا ہے جنھیں چھاپنا کاروباری لحاظ سے گھاٹے کا سودا تھا۔ ایسے موضوعات پر کتابیں چھاپی ہیں جن پر کسی اور ادارے نے کام نہیں کیا۔ یہی نہیں اپنی تمام اشاعتوں کو انٹرنیٹ پر بھی اردو کی دنیا کے لیے دست یاب کر دیا ہے۔ اسی طرح سالانہ کتاب میلوں کا سلسلہ ہے۔ کہنے کو تو ضرور یہ کتاب میلے ہیں لیکن کونسل نے جو فارمیٹ ان کا وضع کیا ہے اس سے یہ صرف اردو کی کتابوں کے میلے نہیں رہ گئے ہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے اجتماع بن گئے ہیں۔ ان میں مختلف ادبی اور لسانی موضوعات پر سیمینار اور مذاکرے ہی نہیں ہوتے بلکہ موسیقی، شاعری اور اسٹیج ڈراموں سے متعلق رنگا رنگ، صحت مند تفریحی پروگرام بھی منعقد ہوتے ہیں۔ کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ کتاب میلہ صرف اردو کتابوں کی خرید وفروخت اور ملک کے مقتدر اردو پبلشروں میں باہمی ربط وضبط کا ایک کاروباری ایونٹ Event بن کر نہ رہ جائے۔ کونسل متعلقہ علاقے کی اردو تنظیموں، تعلیمی اداروں اور کلچرل سوسائٹیز کے تعاون واشتراک سے اس تقریب کو متعلقہ علاقے کی عام زندگی سے جوڑنے میں سرگرم رہتی ہے۔ اس حکمت عملی کا اورنگ آباد میں خاطر خواہ نتیجہ سامنے آیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ جب قومی اردو کونسل شمالی ہندوستان کے کسی علاقے میں اردو کتاب میلہ منعقد کرے گی تو وہاں کے اردو والے اورنگ آباد کا بھرپور جواب دیں گے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ اردو کا کارواں مغربی ہندوستان میں ہی نہیں شمالی ہند میں بھی آگے بڑھ رہا ہے!

فروری کا مہینہ ہم اردو والوں کے لیے ایک نیا موقع لے کر آرہا ہے۔ 21 فروری کو پوری دنیا میں یومِ مادری زبان منایا جائے گا، جس کی طرف حکومتِ ہند بھی خاص توجہ دے رہی ہے۔ قومی اردو کونسل کے سبھی شعبے اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے اس کے مراکز اس موقع پر مادری زبان کی سماجی وتہذیبی اہمیت اور اس تناظر میں اردو زبان کی ترویج وترقی کی مناسبت سے پروگرام منعقد کریں گے۔ امید ہے اردو سے وابستہ سبھی تنظیمیں اس موقع پر مناسب اور موزوں تقریبات کے انعقاد سے ان لوگوں کو اردو کی اہمیت کا خاص احساس دلائیں گی جن کی یہ مادری زبان بھی ہے اور تہذیبی شناخت بھی!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

ڈاکٹر سید احمد خاں

کنوینر: عالمی یومِ اردو آرگنائزنگ کمیٹی، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کامیابی کے ساتھ اپنے اغراض و مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل ہے۔ یقیناً آپ کا اور آپ کی ٹیم کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' نے سرکاری سطح پر شائع ہونے والے اردو ماہنامے و رسائل کی اشاعت میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ شاید اس میں عوامی سرگرمیوں کی شمولیت بھی بڑی وجہ ہے۔ زیادہ تر مضامین بہت معلوماتی اور دستاویزی ہوتے ہیں مگر افسوس کہ آج کل پھر خبروں کے انتخاب میں کسی وجہ سے جانب داری سے کام لیا جارہا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ '9 نومبر، عالمی یوم اردو 2014' کی خبریں نہ تو دسمبر 2014 کے شمارے میں جگہ پاسکیں اور نہ ہی جنوری 2015 کے شمارہ میں۔ البتہ ایک فرسودہ خبر غالب اکادمی میں سیمینار کے عنوان سے علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے حوالے سے شائع کی گئی ہے۔ اس خبر میں نہ تو آرگنائزر کا ذکر ہے اور نہ ہی آرگنائزنگ کمیٹی کا۔ ظاہر ہے کہ خبر پڑھنے والے کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ سیمینار کس مقصد سے اور کس تنظیم نے منعقد کیا۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر یوم اردو کا انعقاد ہوا مگر 'اردو دنیا' میں ہی یوم اردو کی خبریں نہ آنے کا افسوس ہوا۔

اردو دنیا کا 'خبرنامہ' اخبارات میں شائع شدہ خبروں، رپورٹوں، پریس ریلیز وغیرہ کی مدد سے تیار کیا جاتا ہے۔ آپ نے جس خبر کا حوالہ دیا ہے اس کے تعلق سے آپ کو اخبار سے رابطہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ متعلقہ معلومات اخبار میں نہیں شائع ہوئی ہیں۔ جبکہ ہم نے یہ خبر اخبار کے حوالے سے شائع کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ خبروں کے انتخاب میں جانب داری برتنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ بہت ساری خبروں کو ایڈٹ کرنا مجبوری ہوتی ہے ورنہ 100 صفحے کے اردو دنیا میں صرف خبریں ہی شائع کرنی پڑیں گی۔ آپ ہمیں براہِ راست بھی خبریں بھیج سکتے ہیں۔ (ادارہ)

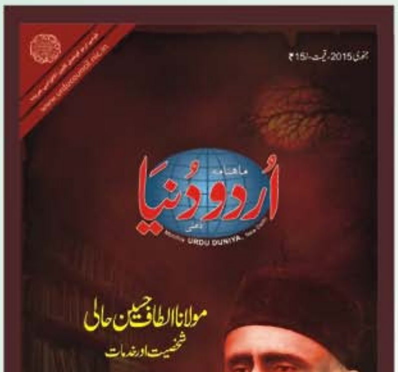

فاروق اعظم قاسمی

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

جنوری 2015 کا اردو دنیا تازہ شمارہ ملا۔ بطور خاص بابائے تنقید مولانا الطاف حسین حالی مرحوم پر خاص گوشہ بے حد پسند آیا۔ مجھے مشاہیر کے انٹرویوز کے مطالعے کا بڑا شوق ہے اور بہت سی نئی نئی چیزوں کے سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس مہینے مرزا حامد بیگ کا انٹرویو پڑھ کر بھی بڑا لطف آیا اور علم میں اضافہ بھی ہوا۔ اسی شمارے میں دوسرا انٹرویو کونسل کے نئے چیرمین عزت مآب جناب مظفر حسین صاحب کا تھا، ان کی گفتگو بھی اچھی لگی۔

ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ

24 پارک ہل ڈرائیو، بریڈفورڈ بی ڈی 8، اوڈی ایف (یوکے)

اس وقت میرے سامنے ماہنامہ اردو دنیا کا شمارہ عالمی اردو کانفرنس ہے۔ خاصا بھاری ہے۔ ان معنوں میں کہ سو 100 صفحات پر مشتمل بلند معیار اور جاذب نظر رنگین تصاویر سے مزین اور لطف مطالعہ کا حامل۔ آپ اور آپ کے معاونین کی محنت کا منہ بولتا ثمر و ثبوت ہے۔ کوئی شک نہیں بیچ کا فاصلہ طویل ہے ورنہ میں چند نسخوں کا حصول ممکن بناتا اور اپنے حلقۂ احباب میں تحفہ پیش کرتا۔ آپ کی یہ پیشکش اس لائق ہے اور یقیناً ہے۔ میں وقتاً فوقتاً ورق گردانی کررہا ہوں۔ جب جب یہ جریدہ اٹھایا، نگاہ ڈالی طبیعت نے ایک خوشگوار اثر لیا۔ تزئین و ترتیب قابل داد ہے۔ چن چن کر الفاظ زیر قلم لاؤں، تحسین کا قرض نہیں اترے گا۔ اس کا معیار اور پیغام بار بار نئی سوچ ابھارتا ہے۔ پہلے ایک چھوٹا سا نقطہ۔ ادھر ہماری بات اور سامنے آپ کی بات۔ مدیر و قاری نزدیک آگئے۔ رفاقت کا آغاز ہوگیا۔

رسالے کی پرکھ سے پہلے، مناسب ہے اولین صفحات پر رائے زنی کروں۔ سرورق خوبصورت اور روشن روشن فہرست مشمولات معمول سے کسی قدر ہٹ کر پھر جناب مدیر/ ادارے کی ہماری بات، سامنے آپ کی بات گویا ادارہ و مدیر اور قارئین آمنے سامنے۔ تکلف اور حجاب اٹھ گیا۔ کچھ تم کہو، کچھ ہم کہیں اور کارواں چلتا رہے۔ ابتدائیے میں عالمی اردو کانفرنس کے حوالے سے وقیع کارکردگی کے قول اور عمل کی تجویز پر عمل خوشگوار نتائج لاسکتا ہے۔ اب اس خیال، تصور اور تجویز کو پس پشت نہ جانے دیجیے گا۔

آپ ایک بڑے ادارے کے سربراہ ہیں جس کی کارکردگی میں تعلقات عامہ کی فعالیت از خود گندھی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے آپ کی آواز میں زور ہے۔ دوسروں بلکہ عوامی حمایت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ با اثر، با رسوخ شخصیات کا تعاون مل سکتا ہے اور سارک کی طرز پر اردو کے اہل قلم کو ہر سال اکٹھا کر سکتے ہیں۔ میں فرد واحد اپنے سالانہ جریدے مخزن کے ذریعے برصغیر کے قلمکاروں اور ناقدین کو ہر شمارے میں باہم شائع کر کے تنقید و تبادلہ و باہمی فکر کی پرکھ کی جوت جگاتا رہا مگر میں ایک فرد تھا۔ وسائل میسر نہ تھے۔ دس سال بعد تھک گیا۔ ویسے اردو کے عشق میں نئی نئی مہم چلاتا رہا ہوں۔ ایک بار کتابوں کو سستی قیمتوں پر فروخت کی مہم شرع کی۔ اپنی کتابوں کی قیمت ہمیشہ کم رکھی۔ جب معلوم ہوا انڈیا میں درسی کتابیں کم قیمت پر فراہم کی جاتی ہیں تو خادم نے یہاں انگلستان سے آواز اٹھائی پاکستان میں بھی ایسا ہونا چاہیے۔ اس طرح شرح تعلیم میں اضافہ ہوگا۔ فرد واحد

کی آواز نہ سنی گئی۔صرف روزنامہ نوائے وقت لاہور نے حمایت میں ایک دفعہ چھوٹا سا اداریہ لکھا۔اسی طرح انجمن جرائد سے سفارش کی بلکہ لاہور گیا تو اہم مدیران سے گزارش کی کہ کتابوں کے تبادلے اور رسائل وکتب پر محصول ڈاک کم کرنے کے لیے آواز اٹھائیں۔یہ ان کے مفاد میں تھا مگر ہم لوگ الگ الگ ڈان کی ہوتی Don Quixote بنتے ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے۔کہنے کا مدعا ہے کہ آپ فرد واحد نہیں ایک ادارہ ہیں اور اگر ملکوں ملکوں سے اہل علم وقلم کے اجتماع کا خیال آیا ہے تو میدان میں پرعزم ہو کر کھڑے ہو جایئے۔لوگ آتے جائیں گے اور کارواں بنتا چلا جائے گا۔ دیکھیے تجارت کے لیے اعلیٰ سطح پر سرکاری وفد مل کر معاہدے کر سکتے ہیں تو جن ملکوں میں شرح تعلیم کم ہے وہاں علم وادب اور عوام و معاشرے میں اجالا کرنے کے لیے تاریخ رقم کرنے کے لیے کوئی قدم کیوں نہ اٹھایا جائے؟

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

حسن طباعت و کتابت سے مزین گراں قدر اور محققانہ مضامین کے مشمولات کے مجموعے کے ساتھ اردو دنیا کا دسمبر 2014 کا شمارہ موصول ہوا۔حسب ذیل مضامین خاص طور سے بہت زیادہ پسند آئے۔اردو شاعری میں روزمرہ، غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری، اردو تنقید کی ایک ہی رہ گزر حسن عسکری، ہم نے جنھیں بھلا دیا کے تحت شاہد احمد دہلوی، احوال میر تقی میر، عربوں کی کلاسیکی شاعری۔

نصر ملک

سابق ایڈیٹر: اردو سروس، ڈینش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، ریڈیو ڈنمارک، کوپن ہیگن ڈنمارک

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا 'عالمی اردو کانفرنس نمبر' کیا ملا، اِک جہانِ اردو ادب سے آشنائی کا موقع ملا۔اردو کانفرنس دہلی کے حوالے سے 'ہماری بات' کے زیر عنوان پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی 'بات' سے سو فیصد متفق ہوں اور ان کے اس مشورہ پر تو فوری اقدامات کی ضرورت ہے کہ ''سارک ممالک (ساؤتھ ایشین ریجنل کوآپریشن) کی سطح پر ایک اردو کانفرنس کا انعقاد کیا جائے۔'' میں تو یہ بھی کہوں گا کہ سارک میں شامل ممالک کے اردو مصنفین کی تخلیقات پر مشتمل ایک 'انتھالوجی' شائع ہونی چاہیے تاکہ ہم ایک دوسرے کی تخلیقی سوچ و فکر سے استفادہ کرسکیں۔خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے خطبے میں بڑا اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ ''دنیا بھر میں بسی اردو کی نئی بستیوں سے رابطہ کرکے ان کے ساتھ مل جل کر اردو کو آگے بڑھایا جائے اور عالمگیریت کے تناظر میں اردو کے فروغ کے

امکانات تلاش کیے جائیں۔'' اس سلسلے میں آپ کا ادارہ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو خود پہل کرسکتا ہے۔

عبدالحی صاحب نے جس خوبصورتی سے دوسری عالمی کانفرنس کی مفصل رپورٹ تحریر کی ہے اور کانفرنس کے مندوبین کے پیش کردہ مقالہ جات کے اقتباسات پیش کیے ہیں ان سے اِن صاحبانِ علم وادب کے ان خیالات سے کسی حد تک آگاہی ہوتی ہے جو وہ اردو کو لاحق عصری چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے رکھتے ہیں۔میرے خیال میں اپنی اس رپورٹ میں عبدالحی صاحب نے عالمی کانفرنس کے مقررین کی تقاریر کے جو جو اقتباسات پیش کیے ہیں وہ 'کوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہیں' اور اردو زبان کو عالمگیریت کے پس منظر میں عصر حاضر اور مستقبل کے ممکنہ خطرات سے محفوظ رکھتے ہوئے اس کے فروغ کے لیے سوچ وفکر کی راہیں کھولتے ہیں بس ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

عالمی اردو کانفرنس میں پروفیسر شمیم حنفی کا کلیدی خطبہ تو بہت ہی اہم ہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ''اردو بولنے والوں کو ہندوستان کے قومی دھارے میں لانے اور ان کی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی خوہشات کے لیے اردو میں نئے پروگرام کا آغاز کیا جائے۔'' میرے خیال میں یہ پروگرام صرف ہمالیہ سے کنیا کماری تک نہیں بلکہ خیبر سے کراچی اور ہمالیہ سے کنیا کماری تک ہونا چاہیے۔ہندوستان ہو یا پاکستان یا پھر وہ مقامات جہاں اردو کے بولنے والے ہیں، ان سبھی جگہوں پر اردو زبان کا فروغ تبھی ممکن ہے جب اردو کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے گا۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے توسط سے آپ جس طرح اردو زبان کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں وہ قابل صد ستائش ہے اور عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد اسی سلسلے کی ایک کامیاب سعی ہے۔ جن دنوں دہلی میں اردو کانفرنس تھی میں آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کی جانب سے منعقد کی گئی ساتویں عالمی اردو کانفرنس میں شامل تھا اور وہاں اپنا مقالہ بھی پیش کیا تھا۔وہاں ہندوستان سے آئے ہوئے محترم عبید صدیقی، ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور محترم ڈاکٹر قاضی افضال حسین سے بھی ملاقاتیں رہیں۔

کرشن بھاوک

کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر k-18، گورونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' کا دسمبر ماہ کا شمارہ از حد حسین سرورق سے مزین دیدہ زیب و جاذب نظر ظہور پذیر ہوا ہے۔ شمارے میں عبدالحی صاحب نے اپنے معیاری مقالے میں '21ویں صدی میں اردو کے سماجی وثقافتی فروغ' جیسے مفید موضوع پر منعقد دوسری اردو کانفرنس میں علما و فضلا کے پیش کردہ مقالات میں موجودہ صدی کے سیاق وسباق میں مختلف تجاویز و درپیش مسائل پر جو غور وخوض کیا گیا تھا، ان کو بخوبی نشان زد کرنے میں اپنی قابل رشک لیاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔اسی طرح قومی کونسل کے ڈائرکٹر و پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب نے اسی موضوع پر اور 4 سے 6 ستمبر گزشتہ سال سنہ 2013 میں منعقد اول عالمی سیمینار پر مبنی مقالات پر بطور مرتب جو دو کتب شائع کروائی ہیں۔ مجلّے کے آخر میں ان کے تبصروں سے پتا چلتا ہے کہ قومی کونسل کم سے کم قیمت میں از حد مفید جو تمام تر کتب شائع کرتی جارہی ہے، انھیں خرید کر طلبا، اساتذہ و محققین بے حد مستفید ہوسکتے ہیں۔شمیم حنفی صاحب کے اپنے کلیدی خطبہ (Key-address) میں پیش کیے گئے اس مقولہ سے تمام قارئین صد فی صد اتفاق کرسکتے ہیں کی اردو زبان کی قیمت ''تاج محل سے بھی ہزاروں گنی زیادہ ہے۔''

لاہور کی ناقدہ محترمہ سعدیہ حسن بلوچ نے ایک نئے موضوع 'غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری' پر ایک بے حد معلوماتی مضمون رقم کیا ہے۔اس میں بہی (بھی)، نمظر (منظر) جیسے املا کے اغلاط تو قطع نظر کیے جاسکتے ہیں، لیکن ایک غلط املا ہے۔'تعینات' (صفحہ 35)۔قومی کونسل سے شائع مفید کتاب 'صحتِ الفاظ' میں عالم و فاضل جناب سید بدرالحسن لکھتے ہیں کہ ''تعینات': یہ لفظ غلط ہے، صحیح لفظ 'متعین' ہے، یعنی مقرر۔اس سے ملتا جلتا ایک لفظ 'تعینات' ہے، جو 'تعیّن' کی جمع ہے۔(صفحہ 142)۔اردو کے مصنف و ناقدین عموماً اقدامات وغیرہ کی ہی مانند 'تعینات' لفظ کا غلط املا میں جو تصرف کر رہے ہیں، وہ غلط العام کے زمرے یا قبیلے میں ہی شمار کیا جاسکتا ہے۔ محمد مصطفیٰ خاں مداح اپنی معیاری لغت 'اردو ہندی' شبد کوش میں ایسے الفاظ کو غلط الفصیح کا نام دیتے ہیں۔اسی مضمون

میں صفحہ 36 پر ماہرِ لسانیات و عالم و فاضل کا غلط نام رام بابو (سکسینہ) شائع ہوا ہے، جو کہ اصلاً بابو رام درکار تھا۔

ذاکر فیضی کا معیاری مضمون مقبولِ عام شاعر قائم چاندپوری کے عہد و شاعری کی بخوبی خط کشی کرتا ہے۔ جن کا ایک مشہور شعر ہے۔ ''قسمت کو دیکھو ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند، کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا (ص 41)۔ خلیق الزماں نصرت صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'برمحل اشعار اور ان کے ماخذ' میں قسمت تو دیکھ کہ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند۔'' ('کلیاتِ قائم، ص 4، دیکھیے کہ، مخزنِ نکات، ص 9، قسمت کو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند۔'' گلستانِ سخن') اس طرح کے مختلف مصرعوں سے خاص مغالطے در آیا کرتے ہیں؛ جو کہ الگ سے ایک موضوع ہے۔ اسی صفحے 41 پر 'کانوں میں نیل کی جگہ 'تیل' لفظ درکار تھا۔ اگلے ہی صفحے پر آخری محولہ شعر میں 'انداز کو' کی جگہ 'انداز تو' الفاظ درکار تھے۔

اسی طرح ای آر محمد عادل نے اردو غزلیات میں سائنسی حقائق جیسے نایاب و کمیاب موضوع پر جو بے بہا تحقیق پیش کی ہے، وہ بھی لائقِ تحسین ہے۔ فقط اس میں حالی پانی پتی کے محولہ مقبولِ عام شعر میں دوئم مصرعہ اول ہونا چاہیے تھا۔ ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں.....'' یہی اول ہونا درکار تھا، لیکن برمحل اشعار اور ان کے ماخذ' کتاب میں نصرت صاحب نے دوسرے مصرعے کی صورت یہ دی ہے۔ ''اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں...'' یہ بھی کاملاً متنازعہ مصرعہ ہے۔

بالآخر، میری ایک تجویز یہ ہے کہ اردو شاعری میں غلط املا و متن کی تصحیح وغیرہ کے نظریے سے خصوصی کتب تیار کی جانی چاہیے۔ کلی طور پر آپ کے اس جریدہ کی پیش رفت و بلند پایہ معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام قارئین اس خیال سے کاملاً متفق ہو سکتے ہیں کہ ''ایسا کہاں سے لائیں/کہ تجھ سا کہیں جسے!۔''

شمس بدایونی

(بریلی)

'اردو دنیا' کے دسمبر 2014 کے شمارے میں جناب محمد متین (سرونج) کا ایک خط میرے مضمون 'شبلی کے سیاسی تدبر کی بازیافت' (مطبوعہ اکتوبر 2014) کے حوالے سے شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے ندوۃ العلما کو انگریز حکومت کی جانب سے ملنے والی امداد پر شبہ ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے سند کا مطالبہ کیا ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ 10 نومبر 1908 سے ندوۃ کو -/500 روپے ماہانہ کی امداد انگریزوں کی طرف سے جاری ہوئی تھی جو 1920 تک بلاتوقف ندوہ کو ملتی رہی۔ تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں ندوہ نے اس رقم کو از خود لینے سے انکار کر دیا۔ (دیکھیے حیاتِ شبلی، طبع اوّل، ص 477) علاوہ ازیں ندوۃ العلما آج جس زمین پر قائم و استوار ہے وہ زمین بھی انگریزوں نے ندوۃ سے وابستہ افراد کی طلب پر لیز پر دی تھی (حیات شبلی 480)۔ نومبر 1908 میں جب ندوہ کی عمارت کا اسی زمین پر سنگ بنیاد رکھا گیا تو اس وقت کے انگریز گورنر نے مع اہلیہ مجمع علما میں شریک ہو کر اس کا سنگِ بنیاد رکھا اور علما کو خطاب کیا۔ حیات شبلی میں اس جلسے کی مکمل تفصیلات نہیں ملتیں۔ راقم الحروف کے پاس ہفتہ وار ذوالقرنین بدایوں 7 دسمبر 1908 کا وہ شمارہ محفوظ ہے جس میں اس جلسے کی تفصیلی روداد پیش کی گئی ہے۔ اس میں مولانا حالی و شبلی کی تہنیتی نظمیں، گورنر بہادر کی خدمت میں اربابِ ندوہ کا سپاسنامہ بہ زبانِ انگریزی، گورنر بہادر کا مکمل خطاب اور اجلاس جلسہ کی مکمل روداد محفوظ ہو گئی ہے۔ کبھی وقت ملا تو اس شمارے کا تعارف کرا دیا جائے گا۔

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو یوپی

دسمبر ماہ کا رسالہ وقت پر مل گیا۔ جس میں عالمی اردو کانفرنس کی مکمل روداد شائع ہوئی ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابی کی بات ہے کہ ہندستان اور دیگر ممالک کے مندوبین نے اس میں شریک ہو کر کانفرنس کو کامیاب کرایا۔ اب سارک کانفرنس کی ضرورت ہے۔ تیاری شروع کیجیے۔ صحت سے متعلق مضمون کا ایک صفحہ ضرور مقرر کر دیجیے تا کہ قارئین حضرات زیادہ سے زیادہ معلومات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

وی اے ماجد حسین

موظف KAS آفیسر، HIG1، بڑا مکان میسور 7

دسمبر 2014 اکیسویں صدی کے ابتدائی دور کا دستاویزی شمارہ ہے۔ گو ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور'' یہ مرنجاں مرنج مگر سخت جان زباں، اب ملکِ ہند کی سرحدوں کو طے کر کے، دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جانے کے بعد خلا میں بھی اپنے جھنڈے گاڑ چکی ہے۔ اردو کے حق میں اپنی آواز پارلیمنٹ میں بلند کرنے والوں کو گزرے ابھی صرف چند دہائیاں ہی گزری ہیں، جو اردو کو اپنے ماں کی زبان، اپنے باپ کی زبان کہہ کر گرج جایا کرتے تھے۔ دستورِ ہند میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے علیحدہ سے گنجائش موجود ہے۔ NCPUL کی معرفت سے اردو کو اپنا جائز مقام حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ، جھارکھنڈ

دسمبر 2014 کا ماہنامہ 'اردو دنیا' معلوماتی مضامین اور اپنی امتیازی شناخت کے ساتھ موصول ہوا۔ سرورق پر دوسری عالمی اردو کانفرنس کے ڈائس پر فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزیر محترمہ اسمرتی ایرانی و خواجہ پروفیسر اکرام الدین کی تصویر 'اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ' نوشتہ دیکھ کر خواہش مطالعہ بڑھ گئی۔ عالمی اردو کانفرنس کے مختلف مناظر نے ماہنامے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

''زبانیں ملک میں اتحاد و سلامتی قائم رکھ سکتی ہیں۔'' اسمرتی ایرانی نے کور اسٹوری کے تحت مادری زبان کا احترام کرنا چاہیے کی مثال مالی اور ماں سے خوب دی ہے۔ کرشن بھاوک کا 'اردو شاعری میں روزمرہ' ادبی مباحث کے تحت معین الدین عقیل کا 'غلام عباس کی اولین طبع زاد تخلیق' سے 'کھوئے ہوئے کھلونوں کی بستی' سعدیہ حسن بلوچ کا 'غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری' بہت ہی لاجواب ہے۔ احمد صغیر کا ذکیہ مشہدی سے لیا گیا انٹرویو کافی اچھا لگا۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کا یہ خیال کہ جس طرح اردو کی عالمی کانفرنس ہوتی ہے اسی طرح کیوں نہ ساؤتھ ایشین ریجنل کوآپریشن (سارک) کی بھی ایک اردو کانفرنس کا انعقاد کیا جائے تا کہ سارک ملکوں ہندوستان، پاکستان، افغانستان، نیپال، بنگلہ دیش، بھوٹان، مالدیپ اور سری لنکا میں اردو کا بول بالا ہو۔ موصوف کا اردو سارک سمیلن کے سلسلے میں دیا گیا مشورہ سر آنکھوں پر اور این سی پی یو ایل اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

احمد وصی

کے 304، ہنجر نگر، پمپ ہاؤس، اندھیری (ممبئی)

'اردو دنیا' کے نومبر کے شمارے میں اپنا انٹرویو پڑھ کر اپنے 'کچھ' ہونے کا احساس ہوا۔ اشتیاق سعید صاحب نے جب تنہائی میں اسے قلمبند کیا ہوگا تو یقیناً قلم کی سچائی اور فن کی دیانت داری کے ساتھ کیا ہوگا۔ ایک دو جگہ الفاظ بدل گئے ہیں، مثلاً میں بمبئ پہنچ آیا'' ظاہر ہے کہ یہ جملہ یوں ہے کہ میں بمبئ پہنچ گیا، یا میں بمبئ آیا، اسی طرح اپنے کلام سنائے، جب کہ فصیح یہ ہے اپنا کلام سنایا۔ خیر ان باتوں سے انٹرویو کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا عمداً نہیں بلکہ سہواً ہو جاتا ہے اور یہ غلطیاں DTP میں بھی 'ممکن ہیں' انٹرویو میری شاعری کے حوالے سے شروع ہوتا تو اچھا ہوتا۔ فلم سے نہیں، مگر خوشی اس بات کی ہے کہ میرا انٹرویو اس شمارے میں شامل ہے جس میں کرشن چندر کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں مضامین شائع ہوئے ہیں کیونکہ میں نے کرشن چندر کو کافی پڑھا ہے اور وہ میرے محبوب قلمکار اس لیے ہیں کہ اتنی شاعرانہ نثر لکھنا صرف کرشن چندر کے قلم کو ہی زیب دیتا ہے۔

نصرت ظہیر صاحب نے تو ایک صفحہ میں ہی کرشن چندر

کی دنیا دکھا کے ان کے فن کا احاطہ بھرپور طریقے سے کرلیا،علی احمد فاطمی، رفیعہ شبنم عابدی، اسلم جمشید پوری اور تاثیرنواز میر نے بھی کرشن چندر کو الگ الگ زاویوں سے دیکھا۔ حسن مثنیٰ کا مضمون 'صدیق مجیبی کی شاعری میں استعارات کربلا' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اسلام اعظمی

اعظمی پبلی کیشن، ایس 15، گولڈ سینٹر، احمد منیر شاہد روڈ، لاہور

تازہ 'اردو دنیا' انٹرنیٹ پر پڑھا۔ کرشن چندر کو اتنا خوبصورت خراج تحسین شاید ہی کسی اور نے پیش کیا ہو۔ میں 1980 میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے سے کرشن چندر کا قاری رہا اور دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اسے خوب پڑھا۔ کیا خوبصورت زمانہ اور لوگ تھے۔

این لال، دوناپوری

737 گوائر ہال، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ماہ نومبر کرشن چندر کے چاہنے والوں کے لیے بہت خوشی کا مہینہ ہے۔ نصرت ظہیر صاحب نے 'کرشن چندر کی دنیا' کو چند جملوں میں بخوبی بیان کیا ہے۔ افسانہ، ناول اور ڈرامے پر بات کرتے ہوئے محی الدین کشمیری نے اچھا مضمون پیش کیا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے 'جب کھیت جاگے' کے تناظر میں کرشن چندر اور ادب کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ آپ جس قابلیت کے لیے جانے جاتے ہیں اس کی جھلک اس مضمون میں صاف نظر آتی ہے۔ قادری صاحب کا مضمون کرشن چندر کے افسانوں کے حوالے سے اچھا مضمون ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی نے کرشن چندر کے تانیثی پہلوؤں کو روشن کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اسلم جمشید پوری نے کرشن چندر کے فن کا ایک اہم پہلو اٹھا کر ان کی انسان دوستی کا ثبوت پیش کیا ہے اور تقسیم ہند کے حوالے سے ان کو ایک بڑا افسانہ نگار ثابت کیا ہے۔ تاثیرنواز میر نے کرشن چندر کے گمنام گوشے پر گفتگو کی ہے۔ ستار فیضی کا مضمون بھی اہمیت کا حامل ہے۔ کرشن چندر کے تخلیقی کارناموں میں افسانوں کو اہمیت دی گئی ہے جبکہ ناول و دوسری اصناف کو نظرانداز کیا گیا لیکن اس شمارے میں ان کی دوسرے اصناف پر بھی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اس خاص شمارے میں شامل تمام مضامین عمدہ اور لائق مطالعہ ہیں۔

شکیل سہسرامی

پٹنہ (بہار)

نومبر 2014 کا تازہ ترین 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ موضوعاتی اداریہ پڑھ کر گزشتہ تمام خبریں نظروں کے سامنے پھر گئیں۔ صفائی مہم واقعی ایک منفعت بخش مہم ہے اس مہم سے کہیں زیادہ صفائی چھٹھ کے پاون تیوہار کے موقعے پر

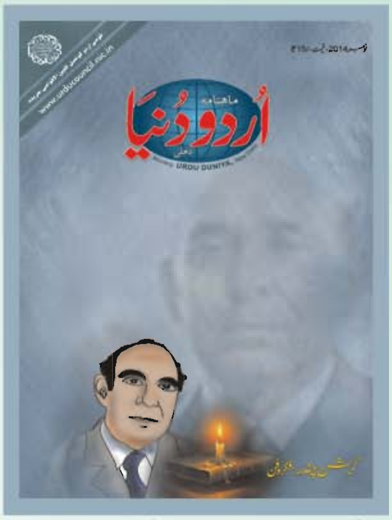

ہوجاتی ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ صفائی میں بڑھ چڑھ کر اس نیت سے ہاتھ بٹائیں کہ ہم بندگانِ خدا کی خدمت کررہے ہیں اور اس کی گراں قدر زمین کو صاف ستھرا کررہے ہیں۔

بھائی پرویز اشرفی کا مضمون پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں اور پرویز اشرفی صاحب دونوں تقریباً 2000 تک محلّہ کرنسرائے سہسرام میں ساتھ ساتھ رہے۔ سہسرام میرا مستقر ہے پرویز صاحب کے والد بزرگوار عبدالرحمٰن صاحب سہسرام سول کورٹ میں پیش کار تھے پرویز صاحب مع خاندان یحییٰ صاحب کے مکان میں کرایہ دار تھے۔ پرویز صاحب کا آبائی مکان مونگیر بہار ہے۔ میرے والد مرحوم مغفور مولوی عبدالوحید خاں شمسی مرحوم مصلح صاحب کے بارے میں اکثر کچھ نہ کچھ بتایا کرتے تھے۔ نومبر 14 کا یہ شمارہ اور یہ مضمون تو میں پٹنہ میں پڑھ رہا تھا لیکن روحانی طور سے میں سہسرام کی سیر کررہا تھا۔

سلمان جونپوری

23، اقرا ڈپلکس، احمد آباد

'اردو دنیا' کے نومبر کے شمارے میں اردو کے بہترین افسانہ نویس و ناول نگار کرشن چندر کے صد سالہ یوم پیدائش پر کور اسٹوری کی اشاعت کے لیے قومی اردو کونسل کو اور جن حضرات نے کرشن چندر کے فکروفن پر مضامین قلم بند کیے ہیں۔ سبھی کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ احمد وصی سے عصر حاضر کے معروف افسانہ نگار اشتیاق سعید نے بہت جامع انٹرویو لیا ہے۔ احمد وصی کا یہ شعر روح کو مسرور کرتا ہے:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت پر احمد امتیاز نے 'مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات' کے عنوان سے ایک گراں قدر مضمون سپردِ قلم کیا۔ عالمی اردو نامہ میں کامران غنی کی گفتگو خلیل طوق آر کے ساتھ بہت ہی دلچسپ ہے۔ بقیہ مشمولات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

صادق علی انصاری

نشیمن، 198 اے، شیخ سرائے، سیتاپور، یوپی

محبوب رسالہ 'اردو دنیا' نومبر 2014 ملا۔ سرورق سے ہی ادبیت ٹپکتی ہے رسالہ آنجہانی کرشن چندر سے منسوب ہے۔ معروف ناول نگار اور ادیب کو آپ نے خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ آپ نے اداریے میں ہندوستان کو ینگ انڈیا کہے جانے کی بابت جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بہتوں کو نہیں معلوم ہوگی۔ مجھے تو رسالہ پڑھ کر علم ہوا۔ تمام مضامین معلوماتی ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ کے مضمون میں کرشن چندر کے ساتھ ایک خاتون کو کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے پتہ نہیں ان کے ہمراہ یہ سرلا دیوی ہیں یا ان کی دوسری بیوی سلمیٰ صدیقی ہیں۔ تمام ادبی خبریں معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ احمد وصی کا انٹرویو اچھا ہے۔ گزشتہ دنوں سیتاپور آئے تو ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ صغیر اشرف کے مضمون میں چھپی تصویر (جو کشمیر کی ہے) اور صفحہ 74 پر مہاتما گاندھی کی تصویر بہت پسند آئی۔

یہ کرشن چندر کی اہلیہ سلمیٰ صدیقی کی تصویر ہے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ، ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد، ریاست تلنگانہ

نومبر 2014 کا اردو دنیا ملا۔ سرورق پر نظر ڈالنے پر معلوم ہوا کہ اس میں حسب روایت گوشہ بہ عنوان کرشن چندر فکروفن شائع ہوا۔ مدیر صاحب نے اداریے میں ہندوستان کی عصری ترقی کے حوالے سے کافی فکرانگیز باتیں بتائی ہیں۔ آپ کی بات کالم تنقیدی وادبی بصیرت کا پیکر ہے اس سے رسالے کا قد اور معائب ومحاسن کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اشتیاق سعید کا انٹرویو ادبی، تنقیدی، تخلیقی معلومات سے پر ہے اور بالی ووڈ یا ہندی فلموں کے بارے میں نئے انکشافات ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کے فکروفن اور تعارف وتعریف کا حصہ ادبی معلومات سے مزین ہے۔ جس سے کرشن چندر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کتابوں کی دنیا کا کالم بہت خوب ہے۔ اردو دنیا میں کتابوں پر تبصرہ شائع ہونا ادیبوں و شاعروں کے لیے باعث اعزاز وافتخار ہے۔

اقبال مجیداللہ

پلاٹ نمبر 69، یوسف کالونی، پربھنی

ماہ اکتوبر 2014 کے شمارے میں دو مضامین زیرعنوان 'مذہبی جستجو' اور 'حج اقتصادی تطہیر نفس کے دائرے میں' اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں ہی مضامین میں جو طرز نگارش اختیار کیا گیا ہے وہ لاجواب ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر اطہر فاروقی سے مدیر اردو دنیا کا لیا گیا انٹرویو دعوت فکر دیتا ہے۔

کوثر مظہری

میں جو کچھ ہوں اردو کی بدولت ہوں

حنیف کیفی

اردو ادب میں تخلیق و تنقید کی اعلیٰ اور مثبت روایتوں پر مکمل کمٹمنٹ کے ساتھ قائم اور کاربند رہنے والے پروفیسر حنیف کیفی کا شمار اردو کے معزز ترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ خاص طور سے تنقیدی و تحقیقی معاملات میں تمام اہل نظر ان کی باتوں کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ اردو شاعری میں سانیٹ کی روایت پر ان کے وقیع کام کو نہ صرف حرفِ اول بلکہ اس کی جامعیت کے لحاظ سے حرف آخر کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اسی طرح جدید اردو نظم پر ان کے کام کو بھی اردو کے علمی و تنقیدی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے۔ تنقیدی سرگرمیوں میں پروفیسر کیفی کی تخلیقی حیثیت قدرے پس منظر میں چلی گئی ہے لیکن ان کی شخصیت ان کی خوب صورت و خوب سیرت شاعری کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ حنیف کیفی صاحب اپنی تنقیدی بصیرت اور تبحر علمی کے باوصف مزاجاً سیدھے سادے ہیں اور ڈاکٹر کوثر مظہری نے جو خود بھی اردو تنقید کا ایک بڑا نام ہے، کیفی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا زیر نظر صفحات میں جس طرح احاطہ کیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ پیش ہیں 'اردو دنیا' کے لیے بطور خاص کیے گئے انٹرویو کے چند اقتباسات: ادارہ

کوثر مظہری: سب سے پہلے ہمیں اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے۔

حنیف کیفی: حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی ریاست روہیل کھنڈ کی راجدھانی بریلی میری جائے پیدائش ہے۔ 8 ستمبر 1934 کو پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔ شعر و ادب کے تعلق سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ بریلی میں کتنے ہی اچھے شعرا اور پختہ اساتذۂ فن ہوئے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ان میں میرے استاد محترم محمد شفیق عشرت بھی شامل ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ان تمام شعرا حضرات نے اپنے آپ کو صرف مشاعروں تک محدود رکھا۔ اس لیے عام طور پر لوگ ان کے کارناموں سے ناواقف ہیں۔ شعرا کے علاوہ بریلی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، یوسف سلیم چشتی، پرنسپل عبدالشکور، سید الطاف علی بریلوی، محمد حسین حسان جیسے بلند پایہ اور قابل قدر نثر نگار بھی گزرے ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کے بزرگ محقق سید لطیف حسین ادیب بفضل ربی ابھی بقید حیات اور مصروفِ کار ہیں۔

ک م: ابتدائی اور بعد کی تعلیم کے بارے میں بھی کچھ فرمائیں:

حنیف کیفی: ابتدائی تعلیم محلے کے میونسپل پرائمری اسکول میں حاصل کر کے ای آئی ایم اسکول میں داخل ہوا جس کا نام آزادی کے بعد آزاد ہائر سیکنڈری اسکول اور پھر آزاد انٹر کالج ہوا۔ انٹرمیجیئیٹ سائنس سے لے کر ایم اے (انگریزی ادب) تک کی تعلیم بریلی کالج سے حاصل کی۔ 1837 میں قائم شدہ اس کالج کا شمار ہندوستان کے چند قدیم ترین کالجوں میں ہوتا ہے۔ مدھیہ پردیش گورنمنٹ میں ہائر سیکنڈری اسکولوں میں ملازمت کے دوران ٹیچر امیدوار کی حیثیت سے پرائیویٹ طور پر وکرم یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کا امتحان 1968 میں پاس کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ملازمت کے بعد 1980 میں اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میرے والد حاجی حشمت اللہ صاحب (مرحوم) نے جو خود پڑھے لکھے نہیں تھے اُس زمانے میں تعلیم کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم سب بھائیوں کو تعلیم دلائی۔ یہ ان ہی کی توجہ اور دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں تعلیم و تدریس کے میدان میں اعلیٰ مراتب تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

ک م: اپنے پرانے اساتذہ میں سے سب سے زیادہ آپ کس سے متاثر ہوئے؟

حنیف کیفی: میری نظر میں درس و تدریس سے بھی زیادہ اہم استاد کا اخلاق و کردار ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے Example is better than precept اپنے عمل کے نمونے سے استاد طلبہ پر جو نقوش چھوڑتا ہے وہ اس کی تدریس سے کہیں زیادہ گہرے اور دیرپا ہو جاتے ہیں۔ میرے بڑے بھائی درجہ اول میں تھے جس کے کلاس ٹیچر ماسٹر لالتا پرشاد تھے۔ ایک مرتبہ بھائی صاحب سخت علالت کے باعث کافی دنوں تک اسکول نہ جا سکے تو ماسٹر لالتا پرشاد صاحب موسلا دھار بارش میں اور پانی سے بھری سڑکوں اور گلیوں سے ہو کر بہ نفس نفیس بھائی صاحب کی عیادت کے لیے ہمارے گھر تشریف لائے۔ ایسے عالم میں ماسٹر صاحب کا زحمت کرنا مجھ چھوٹے سے بچے کے دل پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا کہ میں اس واقعے اور اس سے متعلق باکردار شخصیت کو کبھی نہیں بھول سکا۔

جن اساتذہ سے میں متاثر ہوا ان میں میرے استاد عشرت صاحب بھی تھے، ان کی شفقت و قربت، رہ نمائی و

راہبری تو مجھے طالب علمی کے زمانے سے لے کر ساری عمر حاصل رہی۔ ان کے علاوہ اخلاق کے اعتبار سے نویں جماعت کے انگریزی کے مدرس ریاست اللہ صاحب میرے لیے ہمیشہ ایک نمونۂ عمل رہیں گے۔ ماسٹر صاحب اپنے چھوٹوں کو بھی سلام کرنے میں پہل کیا کرتے تھے اور کوشش کے باوجود ہمیں یہ حسرت ہی رہی کہ کاش ہم ماسٹر صاحب سے پہلے ان کو سلام کرنے کی سعادت حاصل کرسکتے۔ طریق تدریس میں پرنسپل عبدالرحمن صاحب سے متاثر ہوا۔ وہ اتنی بارعب شخصیت کے مالک تھے کہ اپنے راؤنڈ میں جس طرف نکل جاتے تھے، طلبہ کیا بہت سے استاد بھی کانپ جاتے تھے۔ لیکن کلاس میں وہ ایک بالکل بدلے ہوئے شخص نظر آتے تھے۔ کلاس کے سنجیدہ ماحول میں وہ ہنسنے ہنسانے کے لیے بھی خاصا وقت رکھتے تھے۔ کالج میں پروفیسر ڈی سی شرما (دیوی چرن شرما) پرنسپل عبدالرحمن کا بدل یا نعم البدل تھے۔ اپنے سخت ڈسپلن کی وجہ سے وہ طلبہ میں ہٹلر کے نام سے مشہور تھے۔ کلاس میں سبجیکٹ پر پوری گرفت کے ساتھ تدریس کا اتنا دلکش انداز کہ طلبہ اس میں اس طرح کھوجاتے تھے کہ سوئی گرے اور آواز ہو۔ ڈراما پڑھاتے تو کردار کی حرکات وسکنات کے ساتھ ساتھ کہانی کا پس منظر نظر کے سامنے لے آتے تھے۔ پروفیسر جے این مندر اور اوم پرکاش اوج بھی اپنی اس پرخلوص عنایت کی بدولت ہمیشہ شکرگزاری کے مستحق رہیں گے کہ میں اور میرے دوست اور ہم جماعت آلِ رسول اپنے اسباق کی تیاری کے لیے وقت بے وقت ان کے گھروں پر حاضر ہوجاتے تھے اور وہ ماتھے پر شکن لائے بغیر ہماری پوری مدد کرتے تھے۔

ک م: آپ نے انگریزی میں ایم اے کیا تھا لیکن کریئر اور اوڑھنا بچھونا اردو کو بنایا، ایسا کیوں؟

حنیف کیفی: اس میں کوئی شک نہیں کہ آج میں جو کچھ ہوں اردو کی بدولت ہوں لیکن یہ کہنا یا سمجھنا کچھ زیادہ صحیح نہیں ہوگا کہ میں نے صرف کریئر یا ادبی سرگرمیوں کے لیے اردو کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ایک طرح سے اور ایک حد تک اردو میرا اوڑھنا بچھونا اس وقت سے تھی جب میں بہت چھوٹی جماعتوں کا طالب علم تھا۔ ناولوں، افسانوی مجموعوں اور اسی طرح کی دیگر کتابوں میں میری دلچسپی زیادہ تھی۔ اسکول کی لائبریری سے غیر نصابی کتابیں حاصل کرنے کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ گھر پر پہلے 'پیامِ تعلیم' اور بعد میں 'کھلونا' کے اجرا کے بعد وہ بھی باقاعدگی سے آتا تھا۔ بڑی بہن 'خاتون مشرق' منگاتی تھیں۔ وہ اور 'آستانہ' بھی مطالعے میں رہتا تھا۔ تقسیم ہند کے آس پاس صرف افسانوں پر مشتمل دہلی سے جاری ہونے والا رسالہ 'کہکشاں' دلچسپی کا باعث رہا۔ اس رسالے میں پورے ہندوستان کے چوٹی کے افسانہ نگار حصہ لیتے تھے۔ اب رہا انگریزی میں ایم اے کرنے کا سوال، تو سچی بات یہ ہے کہ اس

حنیف کیفی: سوانحی کوائف

نام: محمد حنیف قریشی

قلمی نام: حنیف کیفی (تخلص: کیفی)

والد: (مرحوم) حاجی حشمت اللہ صاحب

تاریخ پیدائش: 8 ستمبر 1934 (ہائی اسکول سرٹیفکٹ کے مطابق)

جائے پیدائش: بریلی (روہیل کھنڈ یوپی)

تعلیم: ایم اے (انگریزی، اردو)، پی ایچ ڈی (اردو)

ملازمت: ● لکچرر انگریزی، ثانوی مدارس، محکمۂ تعلیم، حکومت مدھیہ پردیش، 5 دسمبر 1961 - 8 مارچ 1972 ● شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، تقرر بحیثیت لکچرر: 10 مارچ 1972 ● سبکدوشی بحیثیت پروفیسر: 7 ستمبر 1999

تصنیفات و تالیفات:

(1) اردو شاعری میں سانٹ (تحقیق وتنقید) 1975، (2) اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک) (تحقیق وتنقید) 1982، 1995، 2003، (3) جے شنکر پرساد (سوانح وتنقید: انگریزی سے ترجمہ) 1084، (4) چراغِ نیم شب (شاعری) 1986، (5) اردو سانٹ: تعارف و انتخاب (تحقیق وتدوین) 1987، 1989، (6) تنقید وتوجیہ (مضامین) 1997، (7) انتخاب کلام شمیم کرہانی (تدوین) 1999، (8) سحر سے پہلے (شاعری) 2004، (9) بائیں ہاتھ کا کھیل (شاعری) 2011، (10) حنیف کیفی: ذات اور جہات (2011)

اعزازات و انعامات: مختلف ادبی وتہذیبی اداروں سے منسلک رہے اور ان کی کتابوں پر کئی اداروں سے انعامات بھی پیش کیے گئے۔

وقت بھی میری ترجیح اردو ایم اے کی تھی۔ انگریزی میں ایم اے کا انتخاب میں نے قدرِ بازاری Market Value کی وجہ سے کیا۔ اس زمانے میں اردو پر برا وقت آیا ہوا تھا۔ اردو کے فرسٹ کلاس طلبہ بھی تلاش معاش میں بھٹکتے پھرتے تھے جبکہ انگریزی میں تھرڈ کلاس والے بھی عام طور پر بغیر دقت کے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ انگریزی ایم اے کی بدولت مجھے مدھیہ پردیش گورنمنٹ کے ثانوی مدارس کے محکمہ کے تحت ہائر سیکنڈری اسکول کے انگریزی لکچرر کی ملازمت مل گئی جو دس سال سے کچھ زیادہ مدت تک قائم رہی۔ لیکن اس پوری مدت میں اردو میں ایم اے کرنے کی لگن لگی رہی اور جیسے ہی مجھے سرکاری ضابطوں کی اڑچنوں کے بعد موقع میسر آیا میں نے اردو میں ایم اے کرلیا اور 1968 میں اس میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ وکرم یونیورسٹی سے اس امتحان کے فائنل میں میں نے آخری پرچے میں Essay کے متبادل Dissertation کا انتخاب کیا اور اس طرح اپنا مقالہ 'اردو شاعری میں سانٹ' لکھنے میں کامیاب ہوا جو میری ادبی شناخت کی پہلی منزل قرار پایا۔ جامعہ ملیہ میں 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم' کے موضوع پر کامیاب ریسرچ کے بعد مقالہ کتابی شکل میں منظر عام پر آنے پر بفضل ربی میری ادبی شناخت مستحکم ہوگئی۔ اس طرح آپ کے الفاظ میں 'اردو کو اوڑھنا بچھونا' بنانے سے مجھے جو کامیابیاں نصیب ہوئیں ان سے اردو حلقے واقف ہیں۔

ک م: آپ نے شاعری بھی کی اور تنقیدی نگارشات بھی پیش کیں۔ آج اپنے علمی و ادبی کارناموں کو دیکھتے ہوئے خود کو شاعر سمجھتے ہیں یا نقاد یا پھر دونوں میں یکساں؟

حنیف کیفی: بھائی! اس کا فیصلہ تو آپ ناقدین حضرات اور قارئین محترم ہی کرسکتے ہیں۔ میں اپنے بارے میں کیا کہوں۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں شاعر کس درجے کا ہوں یا شاعر ہوں بھی یا نہیں مگر میں نے شاعرانہ مزاج بدرجۂ اتم پایا ہے۔ میں فطرتاً بے حد حساس اور زود رنج اور خارجی حالات و واردات نیز انسانی رویوں سے شدت کے ساتھ اثر قبول کرنے والا واقع ہوا ہوں اور میرے نزدیک کسی بھی شاعر کا یہ امتیازی وصف ہے یا ہونا چاہیے۔ ادبی اظہارات میں اس مزاج کی کارفرمائی اس شکل میں نظر آتی ہے کہ میری نثری تحریروں پر بھی جابجا میرے شعری اسلوب کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اپنے اس شعری اسلوب کے سہارے سے میں اپنی تنقید و تحقیق کی خشکی کا ازالہ کرکے اپنی تحریر کو انشائیہ بنائے بغیر قابل قبول اور مرکز توجہ بنانے کا کام لیتا ہوں۔

ک م: اردو میں سانٹ پر شاید آپ کی کتاب کو اولیت حاصل ہے۔ اسی طرح آپ کی کتاب 'نظم معرا اور آزاد نظم' اپنے موضوع پر اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

حنیف کیفی: جی ہاں! 'اردو شاعری میں سانٹ' سانٹ کے موضوع پر نہ صرف اولین کتاب ہے بلکہ آج تک اس کے بعد اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں آئی ہے، جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ تاحال اردو میں اس صنف کے اب تک کے ارتقائی سفر پر لکھا جاتا۔ میرے مطالعے میں اس کتاب کے بعد کئی شعرا کے سانٹ آئے ہیں مثلاً محمد عرفان کے خاصی تعداد میں سانٹ جو ان کے مجموعہ 'نظم دسترس' میں شامل ہیں یا نثار آیولوی کے سانٹ۔ نادم بلخی کے سانٹوں کا مجموعہ 'چودہ طبق' جو پہلے میری نظر سے نہیں گزرا تھا اور ان کے سانٹ کا نمونہ رسالے سے اخذ کرکے میں نے اپنے انتخاب میں پیش کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کچھ اور شعرا نے بھی سانٹ کہے ہوں جو میری پہنچ سے باہر ہیں۔ سانٹ کا ایک مجموعہ '125 سانٹ' از خلیل الرحمن راز بھی منظر عام پر آیا جس کا پیش لفظ میں نے لکھا ہے،

لیکن چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے میں اپنی کتاب کے تتمہ کے طور پر کوئی مختصر سی کتاب بھی لکھنے کے قابل نہ ہوسکا۔ کچھ نئے معلومات اور شواہد جو میرے سامنے آئے ان کو میں نے اپنی کتاب 'اردو سانٹ: تعارف و انتخاب' میں شامل کرلیا ہے اور سانٹ والے مقالے میں پیش کردہ تحقیقی نتائج میں بھی نئے شواہد کی روشنی میں ترمیم کی ہے جس سے بڑی حد تک پہلی کتاب کی کچھ کمیوں کا ازالہ ہوگیا ہے۔ میرے مرتب کردہ سانٹوں کے انتخاب کو بھی اب تک نہ صرف اولیت بلکہ واحد کتاب ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ نظم معرا اور آزاد نظم کی تعیین قدر تو آپ نے خود ہی یہ کہہ کر کردی کہ یہ کتاب ''اپنے موضوع پر اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔'' میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں نے نہ صرف تصنیف و تالیف کے میدان میں بلکہ زندگی کے مختلف مراحل میں پوری ایمانداری اور انتھک محنت اور جد و جہد سے کام لیا ہے اور میں ہمیشہ چیلنجوں کا صبر و سکون اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا ہوں۔ بفضلِ ربی میرے دونوں مقالوں کی اور بالخصوص نظم معرا اور آزاد نظم کی بہت پذیرائی ہوئی اس سے بڑھ کر اطمینان اور خوشی کی بات کیا ہوگی کہ میرے دونوں مقالوں کو ان کی سطح سے زیادہ کا قرار دیا گیا۔ جب سانٹ والا مقالہ کتابی شکل میں منظر عام پر آیا تو لوگوں نے، جن میں صائب الرائے ادبا بھی شامل ہیں اسے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ سمجھ کر مجھے ڈاکٹر کہنا اور لکھنا شروع کردیا۔ نظم معرا اور آزاد نظم کے سلسلے میں مستند ناقدین و محققین کی یہ رائے ضبط تحریر میں آچکی ہے کہ اسے ''ڈی لٹ کے لیے گزرانا جاسکتا ہے'' نیز یہ کہ یہ مقالہ ''اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔'' یہ حوصلہ افزائی و قدر آفرینی میرے لیے نہ صرف انتہائی خوش کن اور باعث اطمینان ہے بلکہ مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ حقیقت کہ ہندوستان اور پاکستان کے اہل نظر نے میری اس کتاب کو بہت اچھے الفاظ میں سراہا میرے لیے دائمی اطمینان و مسرت کا باعث ہے۔ پروفیسر معین الرحمن، جو پہلے 'اردو سانٹ: تعارف و انتخاب' کو اپنی فرمائش اور میری منظوری سے شائع کراچکے تھے، انھوں نے اپنے بیٹے کے دارالاشاعت سے اس مقالے کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا۔ یہ مقالہ ہندوپاک سے باہر کے ادبا اور ناقدین کی بھی توجہ کا مرکز بنا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو نا آمیزی کی حد تک کم آمیز ہو اسے گھر بیٹھے حسن قبول کی اتنی بڑی دولت مل جائے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوگی!

ک م: اردو ادب میں ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے رجحانات سامنے آئے، آپ کا ذہنی میلان کس طرف رہا؟ کیا آپ کی وابستگی ان تینوں میں سے کسی سے رہی ہے؟

حنیف کیفی: اس سوال کا جواب میں خود دوں اس سے بہتر یہ ہے کہ برادرم پروفیسر صادق کی اس رائے کو پیش کردوں جس کا اظہار انھوں نے میرے شعری مجموعے 'سحر سے پہلے' کے حوالے سے کیا ہے۔ موصوف کی یہ جامع رائے میرے مزاج شعری اور کلام کی کتنے صحیح طور پر عکاسی کرتی ہے۔ نوٹ کیجیے:

''حنیف کیفی اردو کے ان معدودے چند شعرا میں سے ہیں جنھوں نے ترقی پسندی کے موسم میں سوزشِ دل سے سخنِ گرم لکھنے کا آغاز کیا۔ جدیدیت کے موسمی اثرات سے اپنی شاعری کو محفوظ رکھا اور مابعد جدید موسم کو خاطر ہی میں نہ لائے۔ تینوں موسموں کے سرد و گرم سے بے نیازانہ گزرتے ہوئے اپنے حقیقی جذبات و احساسات کا شعری اظہار اپنے مخصوص فطری انداز میں کرتے رہے...... طرزِ کہن پہ اڑنے اور آئین نو سے ڈرنے کے رویوں سے گریز نے ان کی شاعری کو جو وزن و وقار اور توازن عطا کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔''

ک م: آپ کی نظر میں تخلیق کار کو اولیت حاصل ہے یا نقاد کو؟

حنیف کیفی: دیکھیے تخلیق و تنقید دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں ایک دوسرے کی غیر نہیں۔ جو حضرات اپنے میلانِ طبع یا میدانِ عمل کے اعتبار سے دونوں میں مغائرت کا اظہار کرتے ہیں یا ایک کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ عملاً دونوں ایک دوسرے کی معاون ہوتی ہیں۔ البتہ اس اعتبار سے تخلیق کو اولیت حاصل ہے کہ اس کے بغیر تنقید وجود میں نہیں آتی۔ تخلیق کی بنیاد پر ہی تنقید کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ ہوا میں تخلیق تو پیدا ہوسکتی ہے، تنقید نہیں۔ شعر کے لیے جب تکنیکی اصول وضع کیے گئے اور فن عروض کی ایجاد ہوئی تو وہ بھی اس وقت موجود شاعری کی بنیاد ہی پر ہوئی۔ تخلیق تنقید نگار کے لیے دائرہ کار اور طریق کار فراہم کرتی ہے تو تنقید تخلیق کے ظاہری پہلوؤں اور پوشیدہ گوشوں کو اجاگر کرکے قاری کے لیے تفہیم شعر کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ تخلیق کے حسن و قبح کو روشنی میں لاکر تخلیق کار کے لیے مشعلِ راہ بنتی ہے اور اس کی رہ نمائی اور رہبری کا فرض انجام دیتی ہے۔

ک م: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کن اساتذہ سے آپ کی ذہنی ہم آہنگی زیادہ رہی ہے؟

حنیف کیفی: جس ذہنی ہم آہنگی کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ صحیح معنی میں پوری طرح یا زیادہ کسی سے بھی نہیں رہی۔ اس سے کسی کی تحقیر نہیں بلکہ اپنی کوتاہی کا اعتراف مقصود ہے۔ ایک تو قدرت سے مزاج ایسا پایا ہے جو کسی سے زیادہ میل نہیں کھاتا۔ پھر جہاں تک علمی و ادبی معاملات کا تعلق ہے تو میری راہ الگ اور دائرۂ کار نیز طریق کار جداگانہ ہے۔ البتہ ذاتی تعلقات میں دو ایک رفقا کی رفاقت قرابت کا درجہ اختیار کرگئی تھی اس میں پہلا نام مرحوم عبدالوحید کا آتا ہے جن کا شعبے سے تعلق تو صرف دو ڈیڑھ سال ہی رہا اور وہ معاشی حالات کے تحت سعودی عرب چلے گئے تھے لیکن ان کی طبیعت میں ایسی وضع داری اور رواداری تھی کہ وہ ہر سال تعطیلات گرما میں جب اپنے وطن حیدرآباد جاتے تھے تو کچھ روز کے لیے دہلی ضرور آتے تھے اور شعبے میں سبھی نئے پرانے ساتھیوں سے ملنے جاتے تھے۔ کچھ احباب سے جن میں میں بھی شامل تھا ان کے گھروں پر جاکر ملاقات کرتے تھے۔ ڈاکٹر صغرا مہدی جو عمر میں وحید صاحب سے بڑی اور مجھ سے چھوٹی تھیں اور ان کا تقرر وحید صاحب کے بعد ہوا تھا، ان کے اور میرے یہاں دعوت طعام کا بھی اہتمام ہوتا جس میں ہم سب احباب شامل ہوکر ایک دوسرے کی خوشی میں اضافہ کرتے تھے۔ جب صغرا شعبے میں شامل ہوئیں تو شروع شروع کی فطری جھجک کے بعد وہ مجھ سے کسی قدر بے تکلف ہوگئیں۔ میرے 'بڑکپن' کا انھیں بہر حال لحاظ رہا لیکن وہ وحید صاحب سے خاصی بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ بے تکلف تھیں۔ شعبے کے تعلقات رفتہ رفتہ گھریلو تعلقات بھی بن گئے۔ ہم لوگ اکثر ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے۔ وحید صاحب اور صغرا مہدی کی یہ یگانگت ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گی کہ وہ میرے ہر دکھ سکھ میں شریک رہے۔ دونوں مذکورہ مرحومین نے میرے تعلق سے بڑے پیارے اور محبت آمیز مضمون لکھے جو 'حنیف کیفی: ذات اور جہات' میں شامل ہیں۔ ان مضامین کے ایک ایک لفظ سے اپنائیت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔

جہاں تک علمی و ادبی مسائل و معاملات کا تعلق ہے تو میرا پروفیسر محمد ذاکر صاحب سے، باوجود راہیں مختلف ہونے کے، حسب موقع و ضرورت تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب جب بھی کوئی مضمون یا کتاب لکھتے تھے (جن میں ان کے ذہنی میلان اور مخصوص میدان کے مطابق غالب تعداد ترجموں کی ہوتی تھی) تو وہ ازراہ کرم میری نظر سے ضرور گزارتے تھے۔ میں بھی حسب ضرورت ان سے مشورہ اور ان کے خیالات سے استفادہ کرتا تھا۔ اسے آپ چاہیں تو ذہنی ہم آہنگی کہہ لیں لیکن میرے نزدیک اس کی حیثیت باہمی اعانت و استفادے کی ہے۔

ک م: درس و تدریس کے زمانے کی کوئی تلخ یاد ہو تو قارئین کو بتانے کی زحمت کریں۔

حنیف کیفی: میاں! کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے! اس راکھ سے جو چنگاریاں نکلیں گی وہ شعلہ بن کر ایک مدت تک مجھے جلاتی رہیں گی، یار لوگ تاپ کر لطف اٹھائیں گے یا اگر انسانی ہمدردی کا جذبہ جاگ اٹھا تو عبرت حاصل کریں گے۔ ایک نہیں، کئی یادیں ہیں جنھیں میں بھولنا چاہتا ہوں لیکن بھلا نہیں سکتا اور شاید مرتے دم تک نہ بھلا سکوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا دل عنایت کیا ہے کہ نہ بھولنے کے باوجود میں سخت سے سخت رنج اور اذیت پہنچانے والے کو بھی معاف کردیتا ہوں۔ استطاعت کے باوجود میں نے انتقام کو اپنا شیوہ

نہیں بنایا اور اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ وہ قوی اور قادر بھی ہے اور منتقم بھی اور جس جس نے بھی میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے میں اسے معاف کر چکا ہوں۔ مرنے والوں کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ زندہ لوگوں کے لیے ہدایت کی۔ خدا انھیں بھی عفوو درگزر کی توفیق عطا فرمائے۔ اب اَسّی سال کی اس عمر میں جسے قبر میں پیر لٹکانے والی عمر کہا جاتا ہے، میں پہلے ہی سب کو معاف کر چکا ہوں، اپنے احبا و اقربا کی عنایات کا کیا ذکر کروں۔ صرف اتنا بتادوں کہ جو زیادہ قریب تھے ان ہی سے زخموں کی سوغات زیادہ ملی۔ اس حقیر فقیر اور اپنی ذات میں اسیر شخص سے اگر واقعی کسی کو دلچسپی ہے تو 'حنیف کیفی: ذات اور جہات' میں شامل میری خود گذشت 'ڈبویا مجھ کو ہونے نے' کے متعلقہ صفحات کو ایک نظر دیکھ لے۔ اگر میں خود اس ذکر کو چھیڑوں گا تو اسے روک پانا مشکل ہوگا اور اس گفتگو کے لیے وقف تمام صفحات میرے دکھڑے کی نذر ہو جائیں گے۔

ک م: وہ کون سے تخلیق کار اور نقاد رہے ہیں جن کی تخلیقات اور نگارشات سے آپ متاثر ہوئے؟

حنیف کیفی: اس سوال کا راست جواب دینے سے پہلے عمومی نوعیت کی دو ایک باتیں واضح کر دوں۔ ایک تو یہ کہ تاثر و اثر پذیری اور تتبع و تقلید میں فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ تخلیق کار کے حوالے سے میری گفتگو صرف شاعروں تک محدود رہے گی۔ طالب علمی کے زمانے میں جوش کی تشبیہات اور منظر نگاری سے میں خاصا متاثر ہوا۔ جوش کے اس مخصوص اسلوب کی پرچھائیں میری کچھ ابتدائی نظموں جیسے 'رقص شرر'، 'شبِ مہتاب اور شاعر' اور 'کنواری بیوہ' پر بھی پڑی ہے۔ اس وقتی تاثر سے قطع نظر، میں اقبال کا شروع ہی سے دیوانہ رہا ہوں۔ یعنی اس وقت سے جبکہ اقبال کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں تھی، اور سچی بات یہ ہے کہ آج بھی خود کو دوسرے بہت سے 'علمائے ادب' کی طرح جو اس کا اعتراف نہیں کرتے انھیں پوری طرح سمجھنے کے قابل نہیں پاتا ہوں۔ بہر حال ان کی بصیرت نیز کلام کی آفاقیت اور اندازِ بیان کی انفرادیت نے اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ غالب کے 'گنجینہ معنی' کے 'طلسم' نے بھی مجھے مسحور کیا ہے۔ انیس کے حسنِ بیان اور جوش بیان نے بھی اپنی طرف کھینچا ہے لیکن جہاں تک ذاتی طور پر سب سے زیادہ متاثر ہونے کا سوال ہے تو وہ خدائے سخن میر تقی میر کے کلام کی ناقابل تقلید صناعی Craftsmanship ہے۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آج تک اردو شاعری نے فنِ شعر کا اتنا زبردست اور ماہر صانع نہیں پیدا کیا۔ خود میر کو بھی اپنی اس قوت کا احساس تھا اور انھوں نے اپنے متعدد مقطعوں میں اہل سخن کو نہ صرف دعوت نظر دی ہے بلکہ انھیں چیلنج بھی کیا ہے لیکن بہت زور مارنے پر بھی کسی کو میر کا انداز نصیب نہ ہوسکا۔ میر کے اسی وصفِ خاص کا تاثر تھا جس نے مجھ سے مضمون 'میر اور بندش الفاظ' لکھوالیا اور اس سے میں نے حسب موقع تدریسِ شعر میں بھی خاصا فائدہ اٹھایا ہے۔

نقادوں کے سلسلے میں میرا معروضہ یہ ہے کہ چاہے وہ قدیم مشرقی تنقید ہو یا مغرب کے اثر سے آئی ہوئی جدید تنقید ہو، جس کی طرف آپ کا اشارہ ہے، ہر اس نقاد نے جو نقاد کہلانے کا مستحق ہے، اپنی بساط بھر اردو زبان و ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ رہی میرے ذاتی طور پر متاثر ہونے کی بات، تو میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی شاہکار کتاب 'نقد میر' سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ میرے نزدیک یہ پہلی کتاب ہے جس نے میر کو شاعرِ غم اور بہتر نشتر والے شاعر کے محدود دائرے سے نکال کر ایک وسیع تناظر میں پیش کیا اور ہمیں آدھے ادھورے میر کے بجائے پورے میر سے متعارف کرایا۔ آلِ احمد سرور کے اسلوب نگارش سے بھی متاثر ہوا ہوں۔ کلیم الدین احمد کا اس اعتبار سے قائل ہوں کہ ان کا بالواسطہ طور پر اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے۔ غزل اور اردو تنقید پر ان کے دو منفی جملوں نے مثبت تنقید کا وافر سرمایہ مہیا کرادیا۔

ک م: آپ نے اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کیا ہے، اس سے کس قدر مطمئن اور خوش ہیں اور تصنیف و تالیف سے متعلق آپ کے کیا منصوبے ہیں؟

حنیف کیفی: اللہ رب العزت نے مجھے میرے تصور اور امید سے کہیں زیادہ نوازا ہے۔ ایک ایسا شخص جو نہ تو خود تشہیری اور خود اشتہاریت کے فن سے واقف ہو اور نہ روابط عامہ کی پشت پناہی اسے حاصل ہو، اسے گھر بیٹھے اتنی عزت اور قدر و منزلت نصیب ہوجائے اس سے بڑا اور کیا انعام ہوسکتا ہے۔ اب رہا سوال کا دوسرا حصہ تو بھائی! جب منصوبے بنانے کے قابل تھے، اور کچھ منصوبے بنائے بھی تھے، انھیں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تو کبرسنی کے اس عالم میں جبکہ قوائے جسمانی کے ساتھ ترغیباتِ ذہنی نے بھی ساتھ دینا چھوڑ دیا ہے، کیسی منصوبہ بندی اور کیا ان پر عمل آوری! پچھلے کام جو ادھورے پڑے ہیں یا ذہن میں تھے وہی پورے نہیں ہو پارہے ہیں۔ دو ایک تو ایسے ہیں کہ انھیں پورا کرنے کی دلی خواہش تھی اور انھیں میرے سوا کوئی دوسرا ان خطوط پر، جو میں نے اپنائے تھے، کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مثلاً میں 1947 کے بعد سے آزاد نظم کے آج تک کے سفر کے بارے میں لکھ کر اپنے مقالے کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح 'اردو شاعری میں سانٹ' پر بھی نظرِ ثانی کرکے اور اس کی اشاعت کے بعد ظہور پذیر ہونے والے نئے اثاثے کو شامل کرکے شائع کرانا میرے مقاصد میں شامل تھا۔ اردو میں نیچر پوئٹری نیز اصنافِ سخن کی تعیین و تقسیم پر بھی اپنے نقطۂ نظر اور طریقِ کار کے مطابق کام کرنا چاہتا تھا۔ دونوں موضوعات پر خاکہ بھی تیار تھا اور اوّل الذکر کے سلسلے میں کچھ مواد بھی جمع کرلیا تھا۔ اب اسے میرا تساہل کہیے، روز بروز گرتی ہوئی صحت کہیے یا دیگر حالات کا جبر کہیے کہ یہ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب نہ تو فرصت ہی میسر تھی نہ اتنی ہمت کہ دن دن بھر لائبریری میں بیٹھ کر کتب و رسائل میں سر کھپاؤں۔ اب فرصت ہی فرصت میسر ہے تو ہمت و طاقت نہیں رہی۔ اصنافِ سخن پر برسوں پہلے شمیم احمد کی کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس میں میرے نظریے سے خاصی مطابقت بھی تھی۔ آج کل اس موضوع پر خواجہ اکرام کی کتاب کا اشتہار بھی نظر سے گزر رہا ہے۔ میں نے کتاب ابھی نہیں دیکھی ہے۔ ہوسکتا ہے، اور میری دلی خواہش ہے کہ یہ کتاب میرے خواب کی تعبیر ہو۔ دعا کیجیے کہ میرے جو کام ادھورے پڑے ہوئے ہیں ان ہی کو پورا کرنے کے قابل ہوجاؤں۔ تبصروں کا مجموعہ تو کمپوزنگ کے بعد مکمل ہی ہے۔ صرف اس کی تصحیح اور مقدمہ لکھنا باقی ہے۔ کچھ مضامین، جو سیمینار وغیرہ کے لیے مختص کیے گئے تھے وہ ضروری اضافے کے محتاج ہیں۔ بیٹھ سکوں تو مکمل کروں۔ لیٹے لیٹے تو بس شاعری ہی ممکن ہے جو بہر حال مجھ پر مہربان ہے۔ غزلیات و رباعیات پر مشتمل اوسط ضخامت کے مجموعے کا سامان موجود ہے۔ یہ سب کام ہو بھی جائیں تو میری زندگی میں ان کے شائع ہونے کا امکان کم ہی ہے اور کیا معلوم کہ میرے بعد بھی یہ منظر عام پر آسکیں! آگے اللہ کو اختیار ہے۔

ک م: آخر میں عرض ہے کہ آپ اپنے چند منتخب اشعار سے قارئین کو محظوظ کرنے کی زحمت کریں۔

حنیف کیفی: چند اشعار جو اس وقت یاد آرہے ہیں پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ کیجیے:

العطش کہہ کے چلا تھا کوئی پیاسا دریا
اک صدا گونجتی ہے آج بھی دریا دریا

ہم پہ بھی کچھ تو پڑی ہے تجربوں کی دھوپ چھاؤں
زندگی کو ہم نے بھی سمجھا تو ہے تھوڑا بہت

دنیا کی عداوت کو تو دل جھیل گیا تھا
بیٹے کی بغاوت سے کمر ٹوٹ گئی ہے

قدم قدم پہ انا سدِ راہ تھی کیفی
ہم اپنے سامنے دیوار بن کے خود آئے

روک دیتی ہے انا کیفی مرے بڑھتے قدم
کوئی کیا میں خود ہی اپنے پاؤں کی زنجیر ہوں

ڈسا ہے مجھ کو ابھرتے ہوئے اجالوں نے
چراغِ آخر شب ہوں، سحر گزیدہ ہوں

بہ فیضِ زندگی کیفی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
زمیں پیروں کے نیچے آسماں سر پر نہیں ہوتا

■

Dr. Kausar Mazhari, Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025
Prof. Haneef Kaifi, A-47, Zakir Bagh, Okhla Road, New Delhi - 110025

امتیاز وحید

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا 17 واں کل ہند اردو کتابی و تہذیبی میلہ

قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور فروغ ہے۔ اس مقصد کے لیے کونسل مختلف سرگرمیوں کے علاوہ کتاب میلوں کا بھی انعقاد کرتی ہے۔ قومی کونسل نے اپنے 17 ویں کتاب میلے کے لیے شہر اردو اورنگ آباد کو منتخب کیا تھا اور وہاں کے اردو شائقین نے جس اردو نوازی اور کتاب دوستی کی مثال قائم کی ہے وہ اردو کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک کروڑ روپے سے زائد اردو کتابوں کی فروخت نے ہمیں طمانیت اور نیا حوصلہ بخشا ہے۔ کتابوں کے تئیں اردو قارئین کی محبت اور شائقین کے جم غفیر نے اس کتاب میلے کو تاریخی کامیابی سے ہمکنار کرایا ہے۔ پیش ہے اورنگ آباد کے کتاب میلے کی تفصیلی رپورٹ: (ادارہ)

ریاست مہاراشٹر عہد جدید میں اردو زبان اور تہذیب کا مسکن ہے۔ خاص طور پر مراٹھواڑہ اردو زبان کا ایک زرخیز خطہ ہے، جہاں اردو زندگی کے عام تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اردو تعلیم گاہوں میں نہ صرف ایک مضمون کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ ذریعۂ تعلیم بھی ہے۔ یہاں مادری زبان اور مادری زبان میں بنیادی تعلیم کی معنویت اور اس کا تحفظ ابھی ذہنوں میں باقی ہے۔ انگریزی عوام کے اعصاب پر سوار نہیں ہے اور نہ اس خطے نے ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، شاہ فضلی، عارف الدین خاں عاجز، قاضی سلیم اور سکندر علی وجد اورنگ آبادی کی عظیم الشان شعری اور ادبی روایات کو ماضی کی داستان سمجھ کر بھلا دیا ہے، بلکہ اس کا آموختہ جاری ہے۔ اردو اسکول، شعری، نثری محافل اور دیگر لسانی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اردو یہاں حرکت و عمل کا استعارہ ہے۔ اردو اسکول اور اردو ذریعۂ تعلیم دانش گاہوں کے مثالی نتائج اور کارکردگیاں اردو زبان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں، جو اردو زبان کے طلبہ کو مراٹھی اور انگریزی کے شانہ بشانہ چلنے اور مستقبل سنوارنے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔ صرف شہر اورنگ آباد میں 7 اردو میڈیم ہائی اسکول میں 30,000 ہزار اور 100 سے زائد اردو پرائمری اسکول میں 75,000 سے زائد طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ کم و بیش یہی صورتِ حال اورنگ آباد سے متصل جالنہ، بیڑ، عثمان آباد، ناندیڑ، لاتور، پربھنی اور ہنگولی جیسے علاقوں کی بھی ہے۔ یہ خطہ اردو اخبارت اور صحافت کی جائے امان بھی ہے۔ خود شہرِ اورنگ آباد سے نکلنے والے دو روزنامے ایشیا ایکسپریس اور اورنگ آباد ٹائمز کی روزانہ 10,000 سے زائد کاپیاں فروخت ہوجاتی ہیں۔

اورنگ زیبؒ کے نامِ نامی سے منسوب شہرِ اورنگ آباد تقریباً دو ہزار سال قدیم تاریخی اور ثقافتی ورثے کا امین ہے۔ اس کی مرکزیت اس سے بھی قائم ہے کہ اس کے دامن میں فنِ سنگ تراشی اور مصوری کے دو نادر المثال عالمی ورثے اجنتا اور ایلورا سانس لیتے ہیں۔ خود فصیل بند شہرِ اورنگ آباد میں تاجِ دکن 'بی بی کا مقبرہ'، 'پن چکی' اور قد آور باون دروازے ایستادہ ہیں، جن سے ماضی کی عظمت اور سطوت کی داستانیں پھوٹتی ہیں۔ آبادی کے اعتبار سے یہ ریاست کا پانچوں بڑا شہر ہے۔ قدیم تاریخی وراثت سے مالا مال شہرِ اورنگ آباد کو حال ہی میں 'مہاراشٹر کا سیاحتی دارالسلطنت' قرار دیا گیا ہے۔

شہر اورنگ آباد کی انھی تاریخی، لسانی، ادبی اور ثقافتی مرکزیت کے پیشِ نظر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے مالیگاؤں کے بعد اپنے 17 ویں کل ہند کتاب میلے کے لیے مہاراشٹر کے دوسرے اردو مرکز 'دبستانِ اورنگ آباد' کا انتخاب کیا اور مجوزہ کتاب میلے کے آغاز سے قبل میلے کے انعقاد، امکانات اور دیگر پہلوؤں پر مقامی ذمے داران، عہدیداران

اور سرکردہ شخصیات سے تبادلۂ خیال کے لیے ستمبر 2014 میں اپنے ریسرچ آفیسر جناب شاہنواز خرم کے ساتھ مکیش مشرا کو اورنگ آباد بھیجا، جہاں انھوں نے میلے کے انعقاد کے سلسلے میں فیڈریشن آف آل مائناریٹی ایجوکیشنل آرگنائزیشن (FAME) اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، ممبئی کا تعاون حاصل کیا اور مشترکہ طور پر 27 دسمبر 2014 تا 4 جنوری 2015 شہر اورنگ آباد میں قومی کونسل کے 17 ویں کل ہند کتاب میلے کے انعقاد کا باقاعدہ اعلان کیا۔ میلے کے کنوینر محمد خواجہ معین الدین صاحب جبکہ مرزا عبدالقیوم ندوی کوآرڈینیٹر نامزد کیے گئے۔ اس موقعے پر دونوں اداروں کے ترجمان اور ذمے داران نے میلے کے مجوزہ پروگرام کا خاکہ پیش کیا۔

شائقین کتب کی شرکت اور خریداریِ کتب کے لحاظ سے اورنگ آباد کے حالیہ کتابی وتہذیبی میلے کو کونسل کے اب تک کے میلوں میں اولیت کا مقام حاصل ہے۔ 27 دسمبر 2014 سے 4 جنوری 2015 تک جاری اس میلے نے 3 دسمبر تا 12 جنوری 2014 مالیگاؤں میں منعقد کتاب میلے کی ریکارڈ فروخت 87 لاکھ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے **Rs.1,29,40,722=00** کی کتابوں کی خرید کا نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ جس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی 4 لاکھ 74 ہزار روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ سب سے زیادہ 8 لاکھ 27 ہزار روپے کی کتابیں الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ کی فروخت ہوئیں۔

اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے جس خاکے پر قومی کونسل کام کر رہا ہے، اورنگ آباد کا حالیہ اردو کتابی وتہذیبی میلہ اپنے معیار اور رفعت میں اس کا عملی نمونہ ہے۔ نو دنوں تک شہرِ اورنگ آباد کے قلب میں واقع حالی وشبلی کتاب نگری عام خاص میدان میں منعقد اس کتاب میلے میں نہ صرف کتابوں کی خرید و فروخت پر زور دیا گیا بلکہ ادبی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں پر مشتمل رنگا رنگ پروگرام بھی پیش کیے گئے اور ثقافتی محفلیں بھی آراستہ کی گئیں۔ کتاب میلے کی امتیازی کامیابی کا سہرا میلے کے ذمے دار، محرک اور روحِ رواں کنوینر محمد خواجہ معین الدین صاحب، کوآرڈینیٹر مرزا عبد القیوم ندوی، سلیم محی الدین، نہایت فعال اور حرکت وعمل کے پیکر جناب سیف الدین و دیگر ممبران ڈاکٹر ایس وی رضوی، کے ایم چشتی، سرتاج خان، جناب شیخ محمد شرف الدین، محمد وصیل، رضی الدین شکیل، یونس پٹیل، محمد شاکر، خان شمیم، خان مقیم، ابرار سہیل سوداگر، خان جمیل احمد، سید امجد الدین قادری اور شیخ احمد صاحبان کے سر بھی جاتا ہے، جنھوں نے غیر معمولی انہماک اور ذمے داری کا ثبوت دیا اور قرب و جوار کے اضلاع میں میلے کی کافی تشہیر کی، جس کے سبب روزانہ ہزاروں کی تعداد میں یونیورسٹی، کالج اور اسکولوں کے ذمے داران، طلبہ وطالبات، سرکردہ سماجی، تعلیمی، مذہبی، ملّی و سیاسی عمائدین اور شخصیات کے علاوہ سماج کے مختلف سمتوں میں فعال تنظیموں اور اداروں نے کتاب میلے میں شرکت کی اور جن کی کوششوں کے سبب میلے کی تشہیری مہم میں گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے اردو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی میڈیا کا غیر معمولی تعاون حاصل رہا۔

یہاں اردو سے محبت کرنے والے ان اہل قلم صحافیوں اور ادیبوں کی مساعی جلیلہ کو بھی یاد کرتے چلیں جنھوں نے مجوزہ اردو کتابی میلے پر اداریے تحریر کیے اور اہل کتاب کی بستی

کمالِ ذوق نظر سے بھی کچھ سوا کہیے

اے مرے شہرِ نگاراں میرے اورنگ آباد
لوگ دنیا کے تجھے تاجِ دکن کہتے ہیں
بھائی چارے کی، شرافت کی محبت کی زمیں
خنک سی شامیں ہیں یا کیوڑہ مہکتا ہے
تری فضاؤں کے معشوق ہیں گلاب رُخاں
یہیں غزل نے تغزل کی اوڑھنی اوڑھی
یہ شہر شعر، ولی اور سراج کا ورثہ
یہیں سے پھوٹی کرن نظمِ خانقاہی کی
ہیں ایکناتھ یہاں پر تو بابا شاہ بھی ہیں
قرینِ جان کا رشتہ تھا سنت و صوفی میں
پہاڑ سنگھ کا ذوق نظر چھلکتا ہے
یہ شہر، ذوق تمدن کی انتہا کہیے
نہ سنگِ سرخ کا احساس نہ سنگ مرمر کا
ولی، سراج، صفی، وجد اور قاضی سلیم
سبھی نے خاک سے تیری ہی فیض پایا ہے
یہ شہر آج بھی زندہ ہے سانس لیتا ہے

صوفی سنتوں کی زمیں تو ہے خجستہ بنیاد
ہم تجھے کعبہ اربابِ سخن کہتے ہیں
جو تری خاک میں خوشبو ہے کہیں اور نہیں
ترے سویروں میں فطرت کا دل دھڑکتا ہے
صباحتوں پہ تری ہیں نثار گلبدناں
یہیں کی نظم نے نظموں کو آبرو بخشی
یہ شہرِ نغمہ صفی کے شعور کا ترکہ
یہیں سے پیروں، فقیروں نے بادشاہی کی
اذان و شنکھ کی آواز کے گواہ بھی ہیں
تھیں کیسی یاریاں حمویؒ و مانپوری میں
سنہری محل سے ہُن آج بھی برستا ہے
جمالِ بیگم دلرس کا آئینہ کہیے
یہ شہر خواب ہو جیسے ابوالمظفر کا
بشر نواز، قمر، ناصر اور خان شمیم
تری زمین پہ اردو نے گھر بنایا ہے
جہان اردو کو سوغات شعر دیتا ہے

—خان شمیم

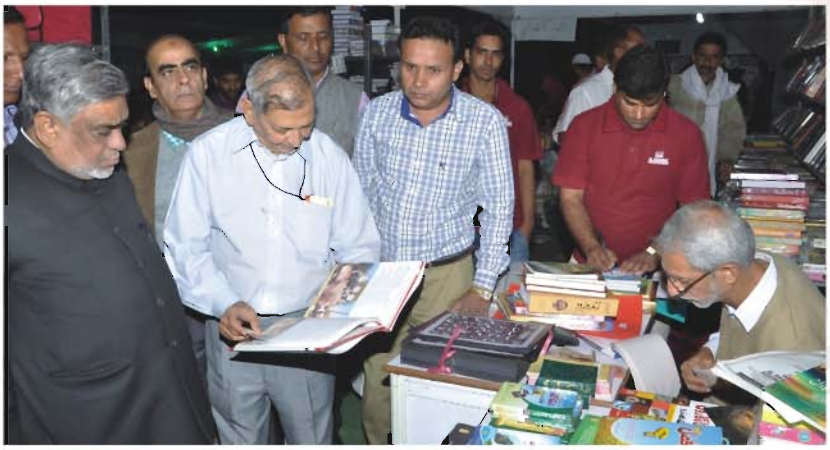

میں 'حی علی الکتاب' کی اذانیں دیں۔ معروف صحافی جناب خان شمیم نے ایشیا ایکسپریس کے اپنے مقبول کالم 'شہرنامہ' کو اس کارِخیر کے لیے وقف کیا اور کتاب میلے سے ایک ماہ قبل سے کتاب، اہل کتاب اور علم وحکمت کا ایسا جاپ شروع کیا کہ اورنگ آباد کے اردو کتابی وثقافتی میلے نے کامیابیوں کی تاریخ رقم کردی، شعرا حضرات نے کتابی میلے پر تشجیعی اور تشویقی نظمیں لکھیں اور اہل اردو کی ذہن سازی کی۔ دورانِ میلہ ہندی، انگریزی، اردو اور مراٹھی اخباروں نے بیش قیمتی صفحات میں قومی کونسل کے اردو میلے اور اس کی سرگرمیوں، عوامی تاثرات اور متعلقہ گوشوں کو نمایاں جگہ دی۔ اورنگ آباد اردو میلے کی کامیابی میں انھیں بنیاد کے پتھر کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے پاک طینت جذبے کو سلام!

میلے کے افتتاح سے قبل 26 دسمبر کو قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے صحافیوں اور میڈیا شخصیات سے پریس میٹ کی اور کل ہند اردو کتابی وثقافتی میلہ میں قومی کونسل کے کردار اور اشاعتِ کتب سے متعلق کونسل کے اغراض ومقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈائرکٹر موصوف نے کہا کہ قومی کونسل کے کتاب میلے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اردو قاری تک علم وآگہی کی فراہمی کو یقینی بنائیں اور واضح کیا کہ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔ اس کتاب میلے سے ہم اردو کے لسانی اور تہذیبی دونوں پہلوؤں کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ ہم نے ملک کے طول و عرض سے اردو زبان کے بڑے اشاعتی اداروں کو میلے میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ اس میں کل 105 ناشرین اپنے 116 بک اسٹال کے ساتھ شرکت کررہے ہیں، جواب تک کونسل کے زیراہتمام منعقد ہونے والے اردو کتاب میلے کا سب سے بڑا کل ہند اردو کتابی وثقافتی میلہ ہے۔ انھوں نے کتاب میلے کی تشہیر میں مراٹھی، اردو، ہندی اور انگریزی میڈیا کی بھی ستائش کی اور مزید تعاون کی اپیل کی۔ اس موقعے پر این سی پی یو ایل کی جانب سے میلے کے ذمے داران، کتاب میلے کے اوقات، شریک کار اداروں کے لیے مختص اسٹال اور انفارمیشن ڈسک اور دیگر ضروری معلومات پر مشتمل ایک براؤشر بھی جاری کیا گیا۔ پریس میٹ میں جناب شاہ نواز محمد خرم کی قیادت والی کونسل کی ٹیم بھی موجود تھی۔

پہلا دن: 27 دسمبر 2014

کل ہند اردو کتابی وتہذیبی میلے کا افتتاح اے.جی خان (سابق ڈائرکٹر بی سی یوڈی ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد) اور جناب امتیاز جلیل ایم ایل اے کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر پروفیسر عتیق اللہ، اردو، مراٹھی اور ہندی کے اہم اخبارات کے مدیران نیز میئر اورنگ آباد، پولیس کمشنر اورنگ آباد، فیم کی صدر محترمہ فوزیہ خان، اردو اکادمی کے سربراہ خورشید صدیقی، شعیب خسرو، ڈاکٹر انتخاب حمید، ارتکاز افضل، شارق نقشبندی اور دیگر شخصیات موجود

نظم

چنو منو نیہا لیلہ
چلو چلیں اُردو میلہ
خوشبو اُردو کی پھیلائیں
چاہت اردو کی سمجھائیں
ہم اُردو کا دم دکھلائیں
تم بھی آؤ، ہم بھی آئیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں

بچوں کی ہو ننھی دُنیا
تہذیب ومذہب خانہ داری
گیت، غزل یا شعر ونغمہ
جو ہم چاہیں، وہ ہم پائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں

ولی، سراج و وجد و بشر
سعید شمیم، جذب و قمر
گیت سلیم کے سب کو بھائیں
تم بھی گاؤ، ہم بھی گائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں

اردو ہے پہچان ہماری
اردو ہے شان ہماری
کیا ہے اردو ہم بتلائیں
تم بھی آؤ، ہم بھی آئیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں

اُردو ہے یہ، سب کا آنگن
سب ہیں اپنے، نہیں پرائے
مسلم آئیں، ہندو آئیں
ذاکر یہ پیغام سنائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں
اردو کی ہم شان بڑھائیں

—شیخ ذاکرالدین ذاکر
لیکچرر، ڈاکٹر ذاکر حسین جونیئر کالج، شاہ گنج، اورنگ آباد، مہاراشٹر

تھیں۔کونسل کے ڈائرکٹر، سابق وزیر فوزیہ خان، رکن اسمبلی امتیاز جلیل اور ڈاکٹر ارتکاز افضل کے ہاتھوں فیتا کاٹا گیا اور شمع روشن کر کے باقاعدہ اردو میلہ کا افتتاح کیا گیا۔ افتتاحی تقریب کا منظر قابل دید تھا۔ 122 سے زائد اسکولوں کے تقریباً 17000 ہزار طلبہ و طالبات نے دو پہر 2 بجے چمپا چوک سے ریلی نکالی۔ شرکا اسکول میں برہانی نیشنل اردو پرائمری اسکول، سروش گروپ آف اسکول، اقرا اسکول، ملک عنبر اسکول اورنگ آباد، کے جی این اسکول، خلد آباد اسکول، ساتارا پریسر اور اکبر پٹیل اسکول تھے۔ بچوں نے ہاتھوں میں بینر اٹھا رکھے تھے جن میں اردو زبان اور ثقافت کی خوشبو بسی تھی۔ بچوں میں غیر معمولی جوش اور ولولہ تھا جو شہر کی گلیوں اور اہالیان شہر کے جذبات اور اردو دوستی کا مظہر تھا۔اس موقعے پر اسکولی طلبہ و طالبات نے نہایت شاندار اور پرکشش جھانکیاں بھی نکالیں، جن میں اردو اصناف اور اردو زبان و ثقافت کی روح بسی ہوئی تھی۔ یہ جھانکیاں ملک عنبر اسکول، الہدیٰ اردو اسکول، معین العلوم اسکول، بی ایف سی آئی انگلش اسکول اور اکبر خاں ہائی اسکول کی جانب سے نکالی گئیں۔ ریلی میں نظم وضبط کا عالم دیدنی تھا۔ ریلی میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر نے بھی شرکت کی اور محبانِ اردو کے ہم قدم ہوئے۔ یہ ریلیاں جناب منہاج الدین فاروقی، شیخ معین الدین، جناب محمد شاکر، جناب محمد انصاری ابرار، محمد شاہد، شیخ عبدالرحیم، محمد وحیدالدین اور شیخ جاوید صاحبان کی نگرانی میں نکالی گئیں۔

افتتاحی جلسے کی نظامت جناب خان مقیم خان نے کی۔ جبکہ پروگرام کا آغاز خان شمیم کی اس نظم سے ہوا، جو اردو اور شہرِ اورنگ آباد کی محبت میں لپٹی ہوئی تھی۔ بلاشبہ یہ نظم اردو اور شہر نگاراں اورنگ آباد کی آبرو ہے۔

اس موقعے پر قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے شہرِ اورنگ آباد کے تمام اردو نواز دوستوں، اساتذہ، طلبہ و طالبات کو حکومتِ ہند اور قومی کونسل کی جانب سے سلام و نیاز پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کی خوبی ہے کہ اس کے ہر علاقے کی اپنی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ ہندستان عقیدت و محبت اور صوفی سنتوں کی سرزمین ہے۔ خاص طور پر شہر اورنگ آباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں صوفیوں اور سنتوں نے محبت اور یگانگت کا درس دیا ہے۔ اورنگ آباد شہر نگاراں بھی ہے اور جس سرزمین کے اندر صوفی سنتوں کی خوشبو بسی ہو وہاں محبت اور اخوت ضرور ہوگی۔ ہم نے شہر اورنگ آباد کے جلوس میں جو جوش وخروش دیکھا ہے وہ ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وزارت انسانی وسائل کی چیئر پرسن محترمہ اسمرتی ایرانی صاحبہ اور اس وزارت کے تحت اردو زبان کی خدمت پر مامور قومی کونسل کے وائس چیئرمین جناب مظفر حسین اور یہ خادم آپ کے روبرو اردو کی محبت اور اس زبان میں یگانگت کی خوشبو کے ساتھ حاضر ہے۔ انھوں نے کہا کہ این سی پی یو ایل کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی شہر اورنگ آباد کے جوش وخروش کو بھی نمایاں جگہ ملے گی۔ اگر شہر اورنگ آباد کے لوگوں کو اردو سے محبت نہ ہوتی تو ہم یہ نظارہ بھی نہیں دیکھ رہے ہوتے۔ کتابوں کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈائرکٹر موصوف نے کہا کہ کتاب ہماری زندگی کی دستاویز ہے، کتاب مشعل راہ اور راہ حیات ہے۔ کتاب ہماری زندگی سے جدا نہیں ہوسکتی۔ حکومت ہند نے ہمیں علم و آگاہی کی فراہمی کی ذمے داری سونپی ہے۔ ہم اور ہمارا ادارہ اس فرض کے تئیں حساس ہیں اور اپنی ذمے داری کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اردو کتاب میلہ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کا ذریعہ ہے۔ لوگ کتابوں سے دور ہورہے ہیں یہ عدیم الفرصتی کا عہد ہے ایسے میں ہم آپ تک چل کر کتابوں کی شکل میں علم و آگاہی کی ترسیل کررہے ہیں۔ این سی پی یو ایل کی جانب سے بچوں کے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (ڈائرکٹر) نے شہر اورنگ آباد اور ریاست مہاراشٹر کے اردو نواز حلقے کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بچوں کی دنیا کو آپ نے جس توقیر کی نظروں سے دیکھا اور سر آنکھوں پہ بٹھایا اس جذبے کو ہم سلام کرتے ہیں۔ انھوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے سارے اراکین اس بات پر حیراں ہے کہ این سی پی یو ایل کی جو توقیر ریاست مہاراشٹر میں اب تک ہوئی ہے وہ نظارہ ہمیں کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔ یہ ہمارا سترہواں کتاب میلہ ہے ۔آپ کی بات اور خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم نے اس

بار میلے کے لیے آپ کے شہر کا انتخاب کیا ہے۔ ہر جگہ عموماً ہم نے سات روزہ کتاب میلہ کا انعقاد کیا جب کے آپ کے شہر کا یہ میلہ نو دن تک چلےگا۔ کتاب میلہ کے ساتھ ہم نے تہذیب وثقافت پر مبنی پروگراموں کا بھی نظم کیا ہے۔ جس سے اردو تہذیب اور کلچر کی بہتر شبیہ ہمارے سامنے آسکے گی۔ انھوں نے فیم کے جملہ عہدہ داران، اردو اکادمی مہاراشٹر، جناب امتیاز جلیل صاحب، محترمہ فوزیہ خان اور ڈاکٹر ارتکاز افضل کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔ میڈیا کے رول کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ آپ کی رپورٹ سارے ملک اور بین الاقوامی سطح پر ہماری کارکردگی کو ظاہر کر رہی ہے اس کے لیے ہم آپ کے ممنون ہیں۔ آج کے جلوس میں شامل طلبہ وطالبات، اساتذہ، تعلیمی ادارے اور اکادمیوں کے تئیں ہم تشکر کا اظہار کرتے ہیں۔ سابق وزیر مملکت محترمہ فوزیہ خان نے کہا کہ زبان کی خدمت، ترقی اور تحفظ ہماری اپنی ذمے داری ہے۔ اگر سرکار کی سرپرستی نہ ملے تو زبان ترقی نہیں کر پاتی۔ اردو تو بین الاقوامی زبان ہے لہٰذا اس کا تحفظ اور اپنی شناخت کی لڑائی ہماری مجبوری ہے۔ ڈاکٹر ارتکاز افضل نے اورنگ آباد کو صوفی سنتوں کی سرزمین بتایا، جنھوں نے تہذیب اور زبان کو فروغ دیا۔ اس لحاظ سے اورنگ آباد کی سرزمین پر اردو میلہ کا انعقاد خود قومی کونسل کے لیے باعث افتخار ہے۔ خورشید صدیقی نے کہا کہ آزادی کے بعد ملک کی تمام ریاستوں میں مہاراشٹر ہی وہ ریاست ہے جہاں اردو کی بھرپور ترقی ہوئی ہے۔ امتیاز جلیل نے اردو کو دلوں کو جوڑنے والی زبان بتایا۔ جبکہ شارق نقشبندی نے کہا کہ جب تک روزگار سے نہیں جوڑا جائے گا اردو کی ترقی وترویج ممکن نہیں۔

دوسرا دن: 28 دسمبر 2014

دوسرے دن کتاب میلہ اپنے وقت مقررہ صبح 11 بجے شروع ہوا۔ شرکا اور ناظرین کی بڑی تعداد نے میلے میں شرکت کی۔ میلے کے متوازی ثقافتی وکلچرل پروگرام میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے شرکت کی اور مختلف اسکولوں کے بچوں کے ذریعے پیش کردہ ثقافتی پروگرام سے محظوظ ہوئے۔ ثقافتی پروگرام کے تحت میمن اُردو اسکول، طاہرہ بیگم اردو اسکول اور بی ایف سی آئی انگلش اسکول کے بچوں نے رنگارنگ پروگرام پیش کیا اور وہاں موجود شائقین کو لطف اندوز کیا۔ ان پروگراموں میں میمن اسکول کے بچوں نے منظوم استقبالیہ پیش کیا۔ بی ایف سی آئی اسکول کے طلبا و طالبات نے انگریزی میں 'بسم اللہ' کے مثبت اثرات اور شیطانی وسوسے سے قلب ونظر کی حفاظت پر اپنا معصوم حرکات وسکنات سے سماں باندھا اور داد وتحسین وصول کی۔ وہیں بی ایف سی آئی اسکول کی دوسری طلبا ٹیم نے اُردو میں ایک خوبصورت نظم پیش کی۔ انگریزی حروف تہجی A تا Z کے ساتھ بچوں نے زندگی کے متنوع شعبوں کو علامتی اور محاکاتی انداز میں پیش کیا جس سے شرکا پروگرام محظوظ ہوئے۔ بچوں کی دلچسپی پر مبنی اسی نوعیت کے تقریباً متعدد رنگا رنگ اٹھارہ کلچرل پروگرام پیش کیے گئے۔ وہیں ڈاکٹر جعفر ایجوکیشنل اینڈ ایگرو ریسرچ فاؤنڈیشن (BFCI) کی جانب سے جناب محمد شاکر صاحب کی صدارت میں پروگرام پیش کیا گیا۔ جناب ضیا احمد خان کی صدارت میں معین العلوم ہائی اسکول، اورنگ آباد اور جناب بوہرہ مشتاق علی کے زیر صدارت برہانی نیشنل ہائی اسکول اورنگ آباد کے بچوں نے پروگرام پیش کیا۔ جناب مجیب خان (ممبئی) کی ہدایت میں آئیڈیا گروپ ممبئی نے 'آزاد کا خواب: ہندستان کی آزادی' ڈرامہ پیش کیا، جسے ناظرین نے کافی سراہا۔

اُردو کتاب میلے کے متوازی کلچرل پروگرام کے ساتھ 'مراٹھواڑہ میں اُردو ادب: سمت ورفتار' کے موضوع پر بابا صاحب امبیڈکر ریسرچ سینٹر میں ایک سیمینار کا انعقاد بھی کیا گیا تھا، جس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور ڈاکٹر ارتکاز افضل نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر موصوف نے شعر و نثر کی تہذیب کے حوالے سے گفتگو کی اور اس امر کا انکشاف کیا کہ ساتویں اور آٹھویں دہے میں مراٹھواڑہ میں جو ادبی شدت اور ولولہ تھا وہ اب تعطل کا شکار ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ دنیا کا ہر بڑا ادب علاقائی رہا ہے۔ عالمی سطح کے ادیبوں کی تخلیقات علاقائیت پر مبنی رہی ہیں۔ جو ادب اپنی زمین،

اپنے ماحول، ندی، پہاڑوں، بولیوں، زبانوں، رسم و رواج سے جڑا ہوگا وہی پائیدار ثابت ہوگا۔ انھوں نے قلم کاروں سے گذارش کی کہ وہ آگے آئیں اور اپنی فکری روش کو قلم کی زبان دیں۔

اس موقعے پر سیمینار میں شریک قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ مراٹھواڑہ جو اُردو ادب کا گہوارہ رہا ہے، یہاں کے اردو ادب کے طلبا، ادبا اور شعرا کا ذکر نہ ہوا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اُردو ادب کے بکھرے ہوئے روپ کو ہم نے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام 'اردو کا علاقائی ادب' کی شکل میں ہو رہا ہے۔ میری خواہش ہوگی کہ یہاں کا اُردو نواز طبقہ علاقائی شعر و نثر کو لے کر آگے آئے اور اپنا منصوبہ پروجیکٹ کی شکل میں کونسل کو بھیجے۔ ڈائرکٹر موصوف نے معاصر ادب کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے معاصر ادب پر بھی توجہ دی ہے۔ معاصر شاعری، معاصر نثر اور معاصر طنز و مزاح کا بہتر انتخاب ہو اور اس کی نشر و اشاعت کا سامان کیا جائے یہ ہماری ترجیحات میں شامل ہیں۔ ہمارے پاس اس نوع کے پروجیکٹ کا منصوبہ ہے اور فنڈ بھی۔ قومی کونسل کے ہمارے افسران اس سلسلے میں آپ کی بہتر رہنمائی کے لیے آپ کے درمیان حاضر ہیں۔ سیمینار کے دوران اسلم مرزا نے مراٹھواڑہ میں اردو صحافت کی روایت اور آج کا منظر نامہ، ڈاکٹر شرف النہار نے اورنگ آباد کے چند معروف شعرا، ڈاکٹر حمید اللہ نے مراٹھواڑہ میں اردو جامعات کی سطح پر، ڈاکٹر مسرت فردوس نے مراٹھواڑہ کے نثر نگار، ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ، ڈاکٹر کیرتی مالیتی جاوڑے نے مراٹھواڑہ میں اردو افسانہ، ڈاکٹر رضوانہ شمیم نے مراٹھواڑہ میں اردو ادب اور فنکار خواتین اور ڈاکٹر قاضی اختر سلطانہ نے مراٹھواڑہ میں خاکہ نگاری کے موضوع پر تحقیقی مقالے پڑھے۔ نظامت ڈاکٹر قاضی نوید صدیقی نے کی اور ادریس محمد فاروقی نے اظہار تشکر پیش کیا۔

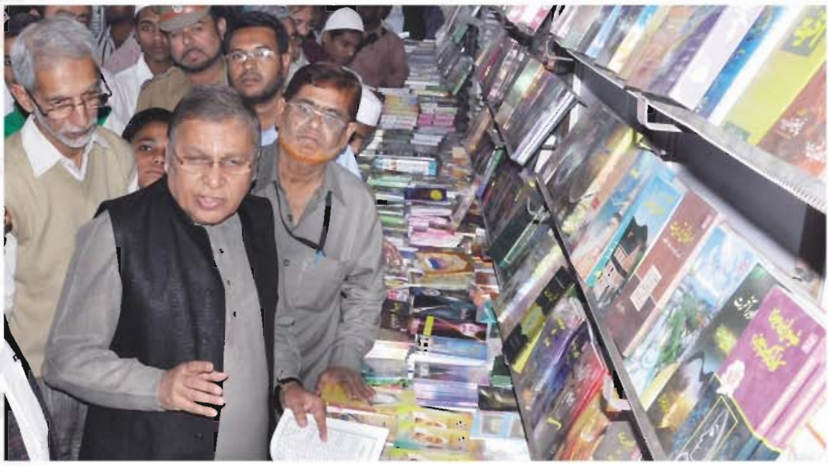

تیسرا دن: 29 دسمبر 2014

تیسرے دن میلے میں کئی اسکول کے بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ جلوس کی شکل میں شریک ہوئے۔ نعیم خان اُردو پرائمری اسکول، کھوکڑ پورہ، اورنگ آباد کے 120 طلبا و طالبات پر مشتمل ٹیم نے صدر مدرس محترمہ انیس فاطمہ اور 14 اساتذہ کی قیادت میں میلے میں شرکت کی اور کتابوں کی خریداری کی۔ انھوں نے بتایا کہ تمام اسٹال پر کتابوں کا بہترین ذخیرہ ہے جو یقینا معلومات افزا ہے، یہ کتاب میلہ اُردو کے مستقبل کے لیے بہترین سرگرمی ہے۔

میلے کے متوازی کلچرل اور ثقافتی پروگرام کے تحت اسٹینڈرڈ اُردو ہائی اسکول، اورنگ آباد، عالیہ اُردو ہائی اسکول، اورنگ آباد اور ذکریٰ اردو اسکول، اورنگ آباد نے رنگا رنگ پروگرام پیش کیا اور حاضرین جلسہ کو محظوظ کیا۔ تہذیبی و ثقافتی پروگرام کے تحت بیس سے زائد پروگرام پیش کیے گئے جن میں نمایاں طور پر امتیاز، ندا اقصیٰ، عالیہ ہارون، تزئین غزل، نوید فہیم، ماریہ اور انعم، سید علی اور ان کے ساتھیوں نے گیت، ڈرامہ، ہندی نظم، مزاحیہ مشاعرہ، نظم اُردو زباں ہماری، مزاحیہ قوالی، لطیفوں پر مبنی ڈرامہ، ان پڑھ عورت گیت پیش کیا وہیں سوچھتا ڈرامہ، مزاحیہ ڈرامہ، نیکی اور بدی مکالمہ، گیت 'چلو چلیں سب اُردو میلہ'، تیلگو میں نظم، قومی گیت، 'اگر پڑھو گے، لکھو گے بابو راجہ بنو گے' گیت اور دعا بالترتیب عرشیہ بیگم، کاشف، ثنا کوثر، عائشہ زریں، فیضان، روبینہ، تزین، طیبہ، شائستہ اور ان کے ساتھیوں نے مشترکہ طور پر پیش کی۔ ثانیہ اور نوشتہ نے تعلیم نسواں پر ایک خوبصورت نظم پیش کی۔ اس ثقافتی پروگرام میں محکمہ پولیس سے جناب پرویکاری، ایم ایل اے جناب امتیاز جلیل، چیئرمین ایوریسٹ ایجوکیشن جناب ڈاکٹر عبدالغفار قادری، سابق ملٹری ہائی اسکول پرنسپل جناب عبدالقیوم صاحب، جناب افضل خان، جناب شیخ سلیم اور جناب اجمل خان نے شرکت کی۔

تعلیمی و ثقافتی پروگرام کے تحت لوک سیوا کالج، اورنگ آباد اور ڈی ایس آر کالج، اورنگ آباد نے 'کتب و کتب خانہ فہمی' کے موضوع پر ایک مذاکرہ کا بھی انعقاد کیا، جس کی صدارت ڈاکٹر شہاب الدین شیخ نے کی۔ پروگرام میں پروفیسر عتیق اللہ نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں تہذیبی زندگی کا بڑا سرمایہ ہے، جو ہمیں زندگی کا درس

دیتی ہیں، ذہن کے اندھیروں کو منور کرتی ہیں۔ مقصد کے تعین میں مدد کرتی ہیں ۔وہ انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا جو کتابوں کو دوست رکھتا ہے۔ مجھے وہ لوگ بے حد تنہا نظر آتے ہیں جو کتابوں سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ کتابیں محض سچ نہیں بولتیں وہ جھوٹ بھی بولتی ہیں، ان میں کتنا جھوٹ ہے اس کی سند کے لیے بھی ہمیں کتابوں ہی کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔ہم جب بھی کوئی کتاب پڑھتے ہیں اس میں اپنے تئیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہم کتنا بدل گئے ہیں، وہ کتاب بڑی کتاب ہے جو ہمیں صحیح معنوں میں زندگی کے نئے طریقے سے متعارف کراتی ہیں۔ اس پروگرام میں گیارہ مقالہ نگاروں نے شرکت کی، مہمان خصوصی کے طور پر شری اشوک گاڑیکر، ڈاکٹر ڈی کے ویر (لائبریرین)، ڈاکٹر ویشالی کھپاڑے (ہیڈ لائبریرین)، سیدہ شائستہ مقیم اور جناب شیخ معروف نے شرکت کی۔ ڈاکٹر ڈی کے ویر نے کہا کہ دور حاضر میں ریڈنگ کلچر بدل رہا ہے۔ 2008 میں یونیورسٹی میں 12000 ریسرچ پیپرس آتے تھے لیکن آج 1 لاکھ 95 ہزار ریسرچ پیپر آتے ہیں۔ اس تناظر میں لائبریری کلچر میں تبدیلی لانا ہمارے لیے لازمی ہو چکا ہے۔ ٹکنالوجی کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ نظامت پروگرام کے کنوینر محمد مدثر احمد اور معاون کنوینر کلیم الدین انصاری نے مشترکہ طور پر انجام دی۔ ثقافتی پروگرام کی آخری پیش کش کے تحت 'کل ہند مشاعرہ' کا اہتمام 'مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی، ممبئی' کی جانب سے کیا گیا، جس کی صدارت معروف شاعر بشر نواز نے کی۔ ناظم مشاعرہ جناب مہتاب عالم (بھوپال) تھے۔ جناب راکیش شرما ضلع پریشد برہان پور نے بطور مہمان شرکت کی۔ شعرا کی حیثیت سے طاہر فراز (رام پور)، حبیب ہاشمی (کلکتہ)، حسیب سوز (بدایوں)، عزم شاکری (فیض آباد)، قاسم امام (ممبئی)، عرفان جعفری (ممبئی)، دیپک جین (گونا)، خان شمیم (اورنگ آباد)، اسلم چشتی (پونہ)، شمس جالنوی (جالنہ)، فاروق شمیم (اورنگ آباد) اور ڈاکٹر واصف یار (برہان پور) شریک محفل تھے۔ اس مشاعرہ کے کنوینر سلیم محی الدین اور معاون کنوینر جناب خضر احمد خان تھے۔

چوتھا دن: 30 دسمبر 2014

چوتھے دن کتاب میلے میں اسکولی طلبا و طالبات، اساتذہ، عمائدین شہر اور اردو سے محبت کرنے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد نے شرکت کی اور یہاں کے تہذیبی پروگرام، علمی سیمینار اور خریداری کتب میں حصہ لیا۔ ماؤنٹ ویلی اردو اسکول، ساؤنگی (ہرسول) اورنگ آباد سے شیخ مختار علی شیخ فقیر محمد کی قیادت میں 6 اساتذہ اور 80 طلبا و طالبات، جناب معین، عرفان اور جلیل صاحبان کی قیادت میں سرسید جونیر کالج سے 50 طالبات، مہانگر پالیکا اردو ہائی اسکول، شاہ بازار سے 7 اساتذہ او 140 طلبا، تاج العلوم اردو ہائی اسکول، فاضل پورہ، نیو ایس ٹی کالونی سے 5 اساتذہ اور 50 طلبا و طالبات، ثنا اردو ہائی اسکول سے 5 اساتذہ اور 52 طلبا، زید پی ہائی اسکول، والوج سے 4 اساتذہ اور 150 طلبا، الاصغری اردو ہائی اسکول سے 4 اساتذہ اور 60 طلبا، ضلع پریشد پرائمری اسکول، والوج سے 12 اساتذہ اور 100 طلبا، ملک عنبر اردو اسکول کے طلبا و طالبات نے میلے میں شرکت کی۔

ثقافتی اور کلچرل پروگرام میں 'اصلاح معاشرہ' کے تحت بزم خواتین اورنگ آباد کی جانب سے خواتین کا ایک مذاکراتی اجلاس منعقد کیا گیا۔ محترمہ وحیدہ وہاب کی صدارت میں محترمہ سیدہ مہر، ڈاکٹر عصمت محمد علی ہاشمی اور محترمہ رضوانہ خان نے اظہار خیال کیا جبکہ محترمہ صدیقی نعیم سلطانہ، محترمہ خورشید پٹیل، محترمہ کنیز فاطمہ، محترمہ حمیرہ ناز، ڈاکٹر شاہین فاطمہ اور ڈاکٹر شاذیہ نہری نے پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر شاہین فاطمہ نے کہا کہ حضور اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے قرآنی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاری اور امت کو علم سیکھنے کی سخت تاکید کی۔ خورشید پٹیل نے اپنے خطاب میں اصلاحِ معاشرہ میں اساتذہ کے کردار کی معنویت کو اجاگر کیا۔ یاسمین فرزانہ نے اس بات پر زور دیا کہ ماؤں کو سب سے پہلے اپنے بچوں کے اسکولی بستوں کو چیک کرنا چاہیے۔ مسلم گھرانوں میں عموماً لڑکیوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔ اولاد کے ساتھ والدین کا

مساویانہ برتاؤ وقت کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عصمت ہاشمی نے بچوں کے لیے وقت کی پابندی کو ناگزیر بتایا۔

ثقافتی تقریب برائے خواتین کے تحت سروش اردو ہائی اسکول کی طالبات نے ڈھولک گیت پیش کیا۔ اس کے ساتھ غزلیں، ڈرامے اور دیگر رنگارنگ پروگرام پیش کیے گئے جس کی صدارت محترمہ فرخ جمال نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے محترمہ نجم النسا بیگم، محترمہ سراج النساء بیگم، محترمہ سیدہ ممتاز مجیب، محترمہ سیدہ عفت النساء روحی اور محترمہ زرینہ شمیم خان نے شرکت کی۔ اس تقریب میں ڈاکٹر آسیہ پٹیل کی غزلوں نے سماں باندھا:

اک سمندر نے آواز دی
مجھ کو پانی پلا دیجیے

انھوں نے منظور احمد اور بشر نواز کے کلام کو بھی اپنی خوبصورت آواز میں پیش کر کے شرکا سے داد و تحسین حاصل کی۔ ان دونوں پروگراموں میں ڈاکٹر رضوانہ شمیم اور معاون کنونیر کی حیثیت سے شگفتہ ثمرین شریک رہیں۔ خواتین کے لیے مشاعرے کی صدارت محترمہ ممتاز منور نے کی۔ ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ریکھا روشنی (ممبئی) اور پروفیسر رعنا حیدری نے مشاعرہ میں بطور مہمان شرکت کی۔ شاعرات میں پرگیہ وکاس (ممبئی) قمر سرور (احمد نگر)، ڈاکٹر تقیہ عابدی غزل (حیدرآباد) مونیکا سنگھ (کولہاپور)، شمشاد جلیل شاد (پونہ) اور کنیز فاطمہ (اورنگ آباد) تھیں۔ مشاعرہ کی کنوینر ڈاکٹر رضوانہ شمیم اور فواد احمد صدیقی معاون کنوینر تھے۔

کتاب میلے کے متوازی بچوں کا ادب سیمینار کا موضوع رہا، جس کی صدارت پروفیسر شاہ حسین نہری نے کی۔ مہمانان کی حیثیت سے جناب انیس چشتی، ڈاکٹر مرزا خضر بیگ شریک مجلس رہے جبکہ سیمینار کے شرکاء میں جناب ڈاکٹر یحییٰ نشیط (ایوت محل)، جناب وکیل نجیب (ناگپور)، جناب فاروق سید (ممبئی)، ڈاکٹر حیدری فیروز (ناگپور)، ڈاکٹر سید شجاعت علی (ناندیڑ)، جناب شفیع چوبدار (شولاپور) تھے۔ اس سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان تھے اور ان کی معاونت جناب شیخ محمد شرف الدین نے کی۔ اس پروگرام کا مقصد ادب اطفال کے لیے زبان کے استعمال اور متعلقہ گوشوں کا احاطہ تھا۔ اپنے صدارتی خطبے میں اشفاق احمد نے کہا کہ اردو ادب سمٹتا جارہا ہے۔ لہٰذا علاقائی زبانوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ادب اطفال میں نئے موضوعات کا احاطہ کیا جانا ضروری ہے۔ تاکہ ہمارے بچوں میں مطالعے کا ذوق وشوق پیدا ہو سکے۔ بچوں کو کتب بینی اور ان میں علم حاصل کرنے کا ذوق پیدا کرنے کی خاطر تعلیمی اداروں کے لیے لازمی ہے کہ وہ لائبریریوں کا نظم کریں۔ جہاں بچوں کے ادب اور ان کی دلچسپی کی معلوماتی کتابوں کا ذخیرہ دستیاب ہو۔ ڈاکٹر خضر نے اپنے خطاب میں کہا کہ مرزا عبدالقیوم بیگ نے رسالہ بچوں کی دنیا کو شہر شہر، گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ تک پہنچایا ہے۔ گویا وہ اس رسالے کے برانڈ ایمبیسڈر بن چکے ہیں۔ انھوں نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج بچوں کا ادب کوئی تاثر قائم نہیں کرتا۔ انھوں نے عہدِ رفتہ کو یاد کیا جب ابن صفی، کھلونا، شمع اور بیسویں صدی کے تئیں دیوانگی ہوا کرتی تھی۔ آج وہ بات نہیں رہی۔ اقبال کی 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری' اور اسماعیل میرٹھی کا کلام 'اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے' آج تک ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ انھیں بچوں کے مزاج اور نفسیات کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ انھوں نے درسی اور ادبی کتابوں کے روشن کردار کی بھی بات کی اور والدین اور اساتذہ کو بچوں میں شعور پیدا کرنے کو ناگزیر فریضہ قرار دیا۔ انھوں نے کرب ناک لہجے میں کہا کہ جس وقت آکسفورڈ یونیورسٹی بن رہی تھی اس وقت ہمارے یہاں آگرہ میں تاج محل تعمیر کیا جا رہا تھا۔ ہم صرف مقبرہ بنانے والے بن چکے ہیں۔ فاروق سید نے بھی بچوں کے رسائل پر تفصیلی گفتگو کی۔

پروفیسر انیس چشتی نے افسوس کا اظہار کیا کہ اب تک 'آف دی چیلڈرن بائی دی چیلڈرن' کتابیں شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ اردو، فارسی اور مراٹھی ادب مغرب سے متاثر ہیں۔ مراٹھی ادیبوں نے گپ بازی سے اجتناب کیا ہے اور سائنس و جدید تقاضوں کی ادب کے ذریعے تکمیل کر رہے ہیں۔ اردو والوں کو بھی انہی کی تکمیل کرنی ہوگی۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے زور دے کر کہا کہ بچوں کے ادب میں ثقیل الفاظ کے بجائے سلیس الفاظ کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ نثر کی خوبصورتی اس کی

روانی میں ہے۔ جس سے قاری کو نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ بچوں کا ادب کثرت سے لکھا جارہا ہے لیکن اس میں ہندی، مراٹھی اور انگریزی کے الفاظ کا بہت زیادہ اور غیر ضروری استعمال کیا جارہا ہے۔ جبکہ زبان وقواعد کا معمولی سانقص بھی طلبہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عزیز عرفان نے کی اور اظہار تشکر شیخ محمد شرف الدین نے کیا۔

پانچواں دن: 31 دسمبر 2014

17 ویں کل ہند اردو کتابی وتہذیبی میلے کا پانچواں دن نہایت کامیاب رہا۔ کتابی میلے میں اسکول کالج کے اساتذہ طلبا طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ کڈس آئی ٹی ورلڈ، ملت اردو پرائمری اسکول کے چھ اساتذہ کے ساتھ 21 طلبا، انمول اردو پرائمری اسکول اورنگ آباد کے پنجم تا ہشتم جماعت کے 265 طلبا اور 16 اساتذہ اور محمدیہ اردو ہائی اسکول نیائے نگر حسین کالونی، اورنگ آباد اور محمد مشتاق احمد اردو ہائی اسکول جسونت پورہ، اورنگ آباد سے 19 طالبات اور 4 اساتذہ پر مشتمل ٹیم نے کتابی میلے کا دورہ کیا اور کتابیں خریدی۔ میلے میں جاری ثقافتی پروگراموں میں بھی شریک ہوئے اور میلے کے منعقدین فیم، مہاراشٹر اردو اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اس خوبصورت اور معلوماتی کتاب میلے کے نظم وانصرام کی تعریف کی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنی نوعیت کا پہلا معیاری اردو کتابی میلہ قرار دیا۔

ثقافتی پروگراموں کے تحت رہنما ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ادارے رہبر اردو اسکول اور نیو ریڈینٹ اردو اسکول کے بچوں نے رنگا رنگ پروگرام پیش کیا۔ ثمینہ نے مراٹھی میں جسمانی تنومندی کے لیے کسرت کی اہمیت اجاگر کی۔ بچہ مزدوری کے موضوع پر بیداری پیدا کرنے کے لیے رہبر اسکول کے بچوں نے ایک سبق آموز تمثیلی پروگرام پیش کیا۔ اپنا خوبصورت حرکات وسکنات اور معصوم اداؤں کے ساتھ بچوں نے چائے خانے پر کام کرنے والے بچہ مزدور، اخبار فروش کی حیثیت سے کام کرنے والے مزدور اور گھریلو خدمات پر مامور بچہ مزدوری کا نظارہ پیش کیا اور حصول تعلیم کے ذریعے پھرانھی بچوں کو ڈاکٹر، پولیس، وکیل اور دوسرے اعلیٰ سماجی عہدوں پر مامور دکھایا گیا۔ بچوں نے فینسی ڈریس، گروپ ڈانس، کامیڈی ڈرامہ اور قوالی کا خوبصورت پروگرام پیش کیا، ملک عنبر اسکول کے بچوں نے اپنے متعدد رنگا رنگ پروگرام کے ذریعے ناظرین جلسہ کی توجہ حاصل کی اور انھیں سراہا گیا۔ بچوں کے ان ثقافتی پروگراموں میں ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر ضلع پریشد اورنگ آباد جناب خواجہ سرتاج الدین اور صوفی لئیق احمد صاحب نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی دیگر مہمانان میں اورنگ آباد کالج فار ویمن کے سابق پرنسپل محمد شفیع و پروفیسر رضا اللہ خان اور محترمہ یاسمین فرزانہ معین العلوم ہائی اسکول صدر معلمہ، ملک عنبر اسکول کے پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے وسنت راؤجی پردیسی صاحب (ڈپٹی کمشنر آف پولیس)، اس پروگرام میں ڈاکٹر واسع الدین رضوی نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ سروش گروپ آف اسکول اورنگ آباد کے بچوں نے ڈاکٹر عبدالمعید صدیقی کی صدارت میں پروگرام 'بچوں کا مشاعرہ' پروگرام پیش کیا۔ اس میں جناب محمد وصیل، جناب محمد رضی الدین شکیل، جناب متین احمد، جناب محمد یونس پٹیل، جناب محمد محسن احمد بطور مہمان شریک ہوئے، پروگرام کی کنوینر رضوانہ خان اور جناب جنید خان معاون کنوینر تھے۔ اورنگ آباد ڈرامہ اکادمی کی جانب سے ڈرامہ 'آخری شمع' اور 'دی رائزنگ کرٹین' ڈرامہ گروپ، نے ڈرامہ 'جلتے بجھتے روشن رشتے' پیش کیا۔

علمی اور ادبی سرگرمیوں کے تحت بابا صاحب امبیڈکر ریسرچ سینٹر کے سیمینار ہال میں 'محفل افسانہ' کا انعقاد کیا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی پروفیسر بیگ احساس (حیدر آباد) نے شرکت کی، جبکہ نظامت عظیم راہی نے کی۔ جناب م-ناگ (ممبئی) نے افسانہ 'دروازے میں لٹکی ہوئی عورت'، معین الدین عثمانی (جلگاؤں) نے افسانہ 'مراجعت'، احمد عثمانی (مالیگاؤں) نے افسانہ 'نیا کفن'، صادقہ نواب سحر (رائے گڑھ) نے 'پہلی بیوی'، اور عظیم راہی نے 'گلوبل ولیج'، نون جاوید نے 'حادثہ' قاضی جاوید احمد نے 'ایک نگاہ التفات' اور عبدالقدیر سیفی نے افسانہ 'بے قصور' پیش کیا۔ اس پروگرام

کی صدارت جناب نورالحسنین صاحب نے فرمائی۔ انھوں نے پیش کردہ افسانوں پر تنقیدی روشنی ڈالی اور افسانوں میں موضوعات اور تکنیک پر پُرمغز گفتگو کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انھوں نے کہا کہ اردو افسانے کا منظر اکیسویں صدی میں کافی وسیع ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ گلوبلائزیشن ہے۔ جس کے سبب بین الاقوامی موضوعات اور مسائل ہمارے افسانے کے دامن میں تیزی سے داخل ہو رہے ہیں۔ تکنیک اور اسالیب کی سطح پر بھی اردو افسانے نے توانائی حاصل کی ہے۔ محفل افسانہ کے کنوینر جناب عارف خورشید اور ان کے معاون خان جمیل احمد نے شرکا اور افسانہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔ اسی محفل میں عارف خورشید، بشر نواز، منور پیر بھائی، دوست محمد خان، احمد اقبال، کے ایم چشتی، خواجہ معین الدین، شعیب الحسن انصاری، قاضی نوید احمد صدیقی، اسلم مرزا، ڈاکٹر مسرت فردوس، ریکھا روشنی، قمر سرور مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ نئے چراغوں کو روشنی دینے میں یقین رکھنے والی اورنگ آباد کی دو اہم شخصیات و معروف افسانہ نگار عارف خورشید اور نورالحسنین نے محفل افسانہ میں اپنی جگہ قاضی جاوید احمد صدیقی اور نون جاوید کو افسانہ پڑھنے کا موقع دیا۔

آج کے میلے میں مالیگاؤں کے ادیب اور شاعر احمد عثمانی صاحب، مجید صدیقی، خیال انصاری اور ان کے رفقا، سابق ڈین پروفیسر ویٹرنری کالج ڈاکٹر انور علی شاہ، ڈاکٹر مرزا حامد علی بیگ، مہاراشٹر مسلم لائرس فورم کے صدر، ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ ایس ایس قاضی اور ان کے احباب نے بطور خاص میلے میں شرکت کی۔

چھٹا دن: 1 جنوری 2015

میلے کے چھٹے دن سال نو کی مناسبت سے بڑی تعداد میں اسکول کے بچوں، اساتذہ اور ذمے داروں نے شرکت کی۔ سروش اردو اسکول، اورنگ آباد کے 60 اساتذہ اور 2000 طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ کتاب میلہ میں کتاب دوستوں کی شرکت قابل دید تھی۔ بچوں نے اپنے اسکول کا ترانہ پیش کیا۔ سروش انتظامیہ، اس کے زیر انصرام سروش گروپ آف اسکول، اساتذہ اور طلبہ نے من جملہ پانچ لاکھ دس ہزار روپے کی کتابیں خریدیں اور اس کتاب میلے کے سب سے بڑے خریدار ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ وہیں ضلع پریشد پرائمری اسکول، دھامن گاؤں، تعلقہ پھلمبری سے 16 طلبا اور 5 اساتذہ کی ٹیم نے میلے میں شرکت کی۔ علی میاں ندوی پرائمری اسکول سے 9 اساتذہ کی قیادت میں 290 طلبا وطالبات، علی الانا اردو پرائمری اسکول، کنج کھیڑہ، سے 44 طلبا اور 5 اساتذہ، المبین اردو پرائمری اسکول، سے 10 اساتذہ کے ساتھ 200 طلبا، المبین اردو پرائمری اسکول، مقصود کالونی سے 100 طلبا اور 7 اساتذہ، مہاراشٹر اردو پرائمری اسکول، نارے گاؤں، ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول، پورنا، کل 60 طلبا اور 10 اساتذہ و صدر مدرس، اجیت دادا پوار اردو ہائی اسکول، کنڑ، 55 طلبہ نے اپنے صدر معلمہ کی قیادت میں، اسی طرح سے محمدیہ اردو اسکول کے 150 طلبا معہ اساتذہ، محمدیہ اردو پرائمری اسکول، مکرانپور، اقرا اردو پرائمری اسکول، اقرا جونیئر کالج، اقرا بوائز ہائی اسکول، اقرا اردو گرلز ہائی اسکول سے کل 150 اساتذہ اور 1500 طلبا نے شرکت کی۔

کلچرل اور ثقافتی پروگرام کے تحت الحرا ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر انصرام اقرا گروپ آف اسکولس کے طلبا نے رنگا رنگ ثقافتی پروگرام پیش کیا۔ اس پروگرام کی صدارت جناب سلیم الدین صدیقی نے کی۔ اقرا اردو پرائمری اسکول کا یہ پروگرام نہایت کامیاب رہا جس میں محمد اشفاق احمد صاحب، عبدالرشید انجینئر صاحب، محترم اسلم مرزا صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی جبکہ محمد اجمل خان نے اظہار تشکر پیش کیا، اس پروگرام کے کنوینر محمد الیاس احمد اور معاون کنوینر محترمہ عشرت فاطمہ نے پروگرام کی کامیابی میں سرگرم کردار نبھایا۔ اعظم ایجوکیشنل کیمپس، پونے سے عابدہ انعامدار جونیئر کالج، ایم سی ایس انگلش میڈیم اسکول، حاجی غلام محمد اعظم اردو پرائمری اسکول، ڈی ایڈ کالج، اینگلو اردو بوائز ہائی اسکول، یونانی میڈیکل کالج اور اینگلو اردو گرلز ہائی اسکول نے ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ پروگرام کی صدارت جناب منور پیر بھائی نے کی، جبکہ مہمان کے بطور محترمہ ممتاز منور اور جناب زبیر شیخ صاحب نے شرکت فرمائی۔ اس پروگرام کے کنوینر محمد

وصیل اور معاون کنوینر قاضی ضیاء الحق تھے۔ کلچرل پروگرام کے تحت ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔

علمی اور ادبی پروگرام کے تحت مذاکرہ 'سائنس اور اردو' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سابق پروفیسر زولوجی ڈاکٹر مسعود احمد نے کی، مہمان کے بطور ڈاکٹر صمد اللہ بیگ نے شرکت فرمائی، مقالہ نگاروں میں کیپٹن ایم ایم شیخ، ڈاکٹر رفیق گلاب (ناگپور)، ڈاکٹر قمر شریف، ڈاکٹر بدر الاسلام، جناب ریاست علی، جناب آغا محمد، محترمہ فاطمہ زہرہ قریشی، ڈاکٹر جاوید احمد، ڈاکٹر لئیق مظہر شریک تھے۔ جبکہ کنوینر کے فرائض ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور ان کے معاون ڈاکٹر اطہر الدین قادری نے انجام دی۔

ڈاکٹر مسعود نے اپنے صدارتی مقالے میں کہا کہ ایک زمانہ تھا کہ نہ تو ڈاکٹر مردم بیزار اور نہ بیماریاں دل آزار تھیں، دونوں شریف و شائستہ، اس لیے ماہرین طب پیدا نہیں ہوئے تھے، سیدھے سادے نسخوں سے کام چل جاتا تھا، لیکن جب ماحول آلودہ ہوا اور نت نئے فتنوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو نئی نئی ٹیکنیکیں وجود میں آئیں۔ انھوں نے پروین شاکر کے اس اقتباس ''ہماری محبت کی کلینیکل موت واقع ہو چکی ہے، معذرتوں اور عذر خواہوں کا مصنوعی تنفس اسے کب تک زندہ رکھے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم منافقت کا پلگ نکال دیں اور ایک خوبصورت جذبہ کو باوقار موت مرنے دیں۔ اس طرح سے عافیت اسی میں ہے کہ ہم اندھیرے میں رہیں اور اپنے اپنے نیوٹرونز سے تعلقات ٹھیک رکھیں۔ تمھارے اور میرے آئسوٹوپس تابکار نفرتوں کی زد میں ایک بار آ گئے تو محبتوں کا اختیار ختم سمجھو' کے حوالے سے اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کی۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر مسعود کے اس مقالے کو مذاکرہ کے ناظم ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے پیش کیا۔ ڈاکٹر صمد اللہ بیگ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے کہا کہ اردو ادب میں سائنسی مفروضات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جہاں ادب ہو وہاں سائنس کی معلومات ضروری ہے۔ آغا محمد خان نے کہا سائنس کی تعلیم ابتدائی عمر سے ہی طلبہ کو دی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر بدر الاسلام نے کہا کہ سائنس کے علاوہ آئی سی ٹی اور جدید معلومات دیگر زبانوں میں تو موجود ہے لیکن اردو اس سے محروم ہے۔ سیدہ فاطمہ زہرہ نے کہا کہ گوگل اور انٹرنیٹ سے اردو ابھی تک ہم آہنگ نہیں ہوئی ہے جبکہ انٹرنیٹ کے بغیر ہم وقت کے ساتھ قدم بہ قدم نہیں چل سکتے۔ اب تو گلوبل اسکول بھی جاری ہیں۔ لہٰذا ان تمام علوم کو اردو میں دستیاب کرانا اردو داں طبقے کے ماہرین کا فرض ہے۔ قمر شریف، ڈاکٹر رفیق گلاب اور ڈاکٹر لئیق الرحمن خان، کیپٹن ایم ایم شیخ نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔

ساتواں دن: 2 جنوری 2015

17 ویں کل ہند اردو کتابی وتہذیبی میلے کا ساتواں دن نہایت کامیاب اور پر جوش رہا۔ گزشتہ دنوں کی طرح شائقین اور اردو سے محبت کرنے والوں کی بڑی تعداد نے کتابی وتہذیبی میلے میں شرکت کی، کتابیں خریدیں، قومی کونسل کے دفتر میں آکر کونسل کے ذمے داروں سے ملاقاتیں کیں، اپنے جذبات اور احساسات بانٹے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اردو ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر انصرام چشتیہ کالج آف آرٹس خلد آباد کے طلبا و طالبات اور اساتذہ کی بڑی تعداد نے کتابی میلے میں شرکت کی اور کالج لائبریری کے لیے 11644 روپے اور کالج کے اساتذہ و طلبا کی جانب سے 10000 روپے کی کتابیں خریدی۔ قاضی اختر سلطانہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل نے سرزمین اورنگ آباد میں کتب بینی و مطالعہ کے ذوق میں ایک نئی لہر دوڑا دی ہے۔ اورنگ آباد کے ایجوکیشنل ایم ایل سی جناب وکرم وسنت راؤ کاڑے نے بطور خاص اردو کتاب میلے میں شرکت کی جہاں فہیم، اردو ساہتیہ اکادمی مہاراشٹر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذمے داروں نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا اور کتاب میلے میں شریک کتب فروشوں اور میلے کے انعقاد کے پس پردہ مطالعے کی عادت کو فروغ دینے کے حکومتی منصوبے کی وضاحت کی۔ اس طرح کے میلے کے انعقاد سے ہماری راشٹر بھاشا ہندی اور اردو کی ترقی ہوگی۔ اس میلے میں ہمارے شہر کے لوگوں نے بڑی گرم جوشی دکھائی ہے اور کتابوں کی خریداری کے ساتھ

ثقافتی اور کلچرل پروگراموں میں حصہ لیا ہے۔ مراٹھواڑہ کی معاون تنظیموں اور مرکز سے آئی ہوئی قومی کونسل کی جملہ ٹیم کے ہم نہایت شکرگزار ہیں۔ آج کے میلے میں معین العلوم ہائی اسکول اور جونیئر کالج کے طلبا و طالبات، میمن اردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد کے تقریباً 350 طلبا و طالبات اور 15 اساتذہ نے میلے میں شرکت کی، کتابیں خریدی اور ثقافتی پروگرام سے لطف اندوز ہوئے۔ محترمہ خورشید پٹیل سابق صدر معلمہ، میونسپل کارپوریشن اورنگ آباد نے کتاب میلہ میں شرکت کی اور اپنے خوشگوار تاثرات پیش کیے۔

آج کے کتابی میلہ میں قاری سید یحییٰ قادری کی کتاب 'قرآن کریم کا مرکزی پیغام اور حضرت محمد کا تعارف' کا اجرا فیم، مہاراشٹر اردو اکادمی اور قومی کونسل کے ذمے داروں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ وہیں مولانا حامد عبدالرحمن الکاف اصلاحی (صاحب مترجم و مفسر بزبان انگریزی قرآن کریم The Simplified Quraan) کی موجودگی میں ان کی تفسیر کا بھی اجرا کیا گیا۔ اس موقعے پر مفسر موصوف نے انگریزی ترجمے کی کاپیاں بھی ذمے داروں کو بطور تحفہ دیں۔

علمی اور ادبی پروگراموں کے تحت سیمینار 'سیرت النبیؐ' کے موضوع پر مختص تھا، جس کا اہتمام 'علما و ائمہ مدارس اسلامیہ و مکاتیب' کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اردو زبان و ادب میں سیرت النبی کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، جس سے ذات نبوی کی مختلف جہتیں سامنے آتی ہیں۔ نصوصِ اسلام اور نبی کی ذات گرامی تفہیم دین کا راست ذریعہ ہے۔ آج کے پروگرام میں 'اردو ادب میں علماء مدارس مساجد اور مکاتب کا کردار' کے عنوان سے چھ مقالے پیش کیے گئے۔ یہ مقالے بالترتیب مولانا ڈاکٹر عبدالرشید مدنی، مولانا ڈاکٹر صدرالحسن مدنی، مولانا عبدالرحمن ندوی، مولانا نوشاد، مولانا مفتی حبیب، مولانا علیم الدین ندوی نے پیش کیے۔ اس نشست میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سید شاہ حسین نہری، خان شمیم خان، ڈاکٹر ارتکاز افضل اور مولانا نسیم الدین مفتاحی نے شرکت کی۔ اس پروگرام کی صدارت مولانا صدرالحسن ندوی مدنی صاحب نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا کہ دورحاضر میں دینی مدارس اور فلمیں ہی اردو کی صحیح معنی میں خدمت کررہے ہیں۔ جن لوگوں کے بچے انگریزی میڈیم اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں، ان گھروں کی ماؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو گھروں میں اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ کیونکہ اردو ہمارا سرمایہ ہے۔ سیرت النبیؐ کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو زبان میں ہی ہے۔ اردو کے سوا دیگر کسی بھی زبان میں سیرت کی اچھی کتابیں میسر نہیں ہیں۔ عربی اور فارسی کے بغیر اردو پر عبور حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی عربی سیکھنے کا موقع ملے ضرور سیکھیں۔

مفتی حبیب الرحمن نے الیکٹرانک میڈیا کے موضوع پر مبنی اپنے مقالے میں واضح کیا کہ اردو کی خدمت الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بھی انجام دی جاسکتی ہے۔ مولانا قاضی نوشاد الدین ندوی نے کہا کہ دینی مدارس اور مکاتب نے اردو زبان کی ابتدا سے ہی خدمت ہے۔

روزنامہ ایشیا ایکسپریس اور تکمیل بک ہاؤس روشن گیٹ کے اشتراک سے منعقدہ اردو کوئز مقابلے کے نتائج کا اعلان بھی قرعہ اندازی کے ذریعے کیا گیا۔ اس موقعے پر مدارس دینیہ کے طلبا کے درمیان بیت بازی رکھی گئی تھی جس میں کاشف العلوم، انوارالعلوم جامعۃ الرضوان اور جامعہ ابن الخطاب کنج کھیڑہ کے طلبا نے دلچسپ انداز میں اشعار سنا کر سامعین کو مسحور کیا۔ اردو کوئز مقابلہ کی قرعہ اندازی اور تقسیم انعامات کے جلسے کی صدارت مولانا نسیم الدین مفتاحی نے کی۔ روزنامہ ایشیا ایکسپریس کے مدیر اعلیٰ شارق نقشبندی نے اردو کوئز مقابلہ کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ پروگرام میں علم کی فضیلت پر ایک ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔

اس پروگرام میں جناب وکرم کاڑے (ایم ایل سی)، جناب ایس-پی جوڑکر صاحب، جناب سوناونے صاحب، جناب وبھو کالے صاحب (بی جے پی مائناریٹی سکریٹری) جناب ولاس ترپاٹھی (سب ایڈیٹر دیویہ مراٹھی)، رانا گرو.جی، جناب ابراہیم پٹھان صاحب، جناب انورخان (ایلورہ اسٹیل) وغیرہ نے شرکت کی۔

آٹھواں دن: 3 جنوری 2015

اردو کتابی وتہذیبی میلے میں اردو سے محبت کرنے والوں

کی ایک بڑی تعداد نے شہر اورنگ آباد، جالگاؤں، دھولیہ، مالیگاؤں، نانڈیڑ، جالنہ، پربھنی، بلڈانہ وغیرہ سے کتابی میلے میں شرکت کی، کتابیں خریدیں اور ہمیں اپنے خوشگوار تاثرات سے آگاہ کیا۔ گزشتہ دنوں کی طرح اسکولی طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد میلے میں شریک ہوئیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول، پرتور ضلع جالنہ سے 5 اساتذہ کی قیادت میں 46 طلبا، ڈاکٹر جعفرا ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ فاؤنڈیشن، اورنگ آباد سے تقریباً BFCI انگلش اسکول کے طلبا و طالبات، الفیصل ایجوکیشن سوسائٹی، اورنگ آباد کے سید مختار الدین قادری کی قیادت میں ذکریٰ اردو اسکول سے 300 طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

علمی و ادبی پروگرام کے تحت 'کتابوں کی باتیں' کے عنوان کے تحت ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا یہ پیش کش مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکاڈمی، ممبئی کی تھی جس میں جناب بشر نواز، جناب نور الحسنین، جناب رفیق جعفر، جناب سید آصف (پونہ) کی موجودگی میں جناب رفعت نواز، جناب شاہ حسین نہری، جناب عارف خورشید، جناب اسلم مرزا اور ڈاکٹر سحر سعیدی نے مذاکرہ میں شرکت کی، جناب ابوبکر رہبر اور ڈاکٹر سلیم محی الدین بھی بطور مذاکرہ کار محفل میں شریک تھے۔

اس پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر سیدہ شائستہ مقیم اور معاون کنوینر ڈاکٹر ہاجرہ بانو تھیں۔ اس پروگرام میں کتاب، کتاب داری اور کتب بینی جیسے متنوع جہتوں کا احاطہ کیا گیا۔ کتاب میلے کو اس حیثیت سے کلیدی کردار کا حامل بتایا گیا۔ معروف شاعر بشر نواز نے کہا کہ اردو کے ابتدائی ارتقا میں اورنگ آباد کا اہم کردار ہے۔ کیونکہ یہیں زبان نے تشکیل پائی ہے۔ کتاب کہاں چھپی، کتنی تعداد میں چھپی، کس نے چھاپی یہ اہم نہیں بلکہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ کتاب میں کیا ہے؟

ثقافتی پروگرام کے تحت الہدیٰ اردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد کے طلبا و طالبات نے رنگارنگ پروگرام پیش کیا۔ تلاوت کلام پاک۔ حمد و نعت کے بعد، اردو زبان کی مختلف اصناف اور پہلوؤں پر مبنی جھانکی کی صورت میں انجمن سجائی گئی تھی جسے ڈرامائی انداز میں نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا، دوسرا ڈرامہ 'کتاب کی آپ بیتی' کے عنوان سے پیش کیا گیا جو کتاب کی اہمیت اور افادیت پر مبنی تھا، اس پروگرام کی خصوصی پیشکش نظم، قوالی (ماں کی نصیحت بچے کو) پر مبنی تھی۔ یہ پروگرام جناب مرزا سلیم بیگ کی صدارت میں پیش کیا گیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب اسلم شریف، جناب محمد عبدالوحید اور جناب محمد انوار الدین چشتی شریک تھے۔ اس موقع پر الہدیٰ اردو پرائمری و ہائی اسکول کے طلبا و اساتذہ نے تقریباً 1 لاکھ کی کتابوں کی خریداری بھی کی۔ وہیں میلے میں شامل ذکریٰ اردو اسکول، دیولائی چوک، بیڑ بائی پاس کے صدر سید مختار الدین قادری، سکریٹری مسرور مبین اور اسٹاف و 200 طلبا کی ٹیم نے اردو میلے کا دورہ کیا اور 10000 کی کتابیں خریدی۔ ثقافتی پروگرام کے دوسرے شریک اسکول 'سرسید اردو پرائمری اسکول'، اندرا نگر، نیو بائجی پورہ کے طلبا و طالبات نے پرلطف پروگرام پیش کیا۔ علامہ شبلی اسکول کے بچوں نے اپنے دلکش پروگراموں سے ناظرین اور حاضرین جلسہ کو محظوظ کیا۔ یہ پروگرام صدر سوسائٹی فیاض خان صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی جناب محمد اسمٰعیل، جناب محبوب خان، جناب امان اللہ خان، جناب غیاث الدین تھے۔ آج کے ثقافتی پروگرام میں حلقہ دوانائیک اسکول، ویجاپور، ضلع اورنگ آباد نے بھی شرکت کی اور اپنے دلکش پروگراموں کے ذریعے سامعین و ناظرین سے داد تحسین حاصل کی۔ اس پروگرام کی صدارت جناب خان مقیم خان نے کی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب قاضی ناصر الدین، جناب قاضی ارشد الدین اور جناب صدیقی صادق احمد نے شرکت کی، پروگرام کے کنوینر صدیقی محمد اظہر اور معاون کنوینر قاضی محمد محی الدین صاحب تھے۔ فیڈریشن آف آل مائنارٹی ایجوکیشنل آرگنائزیشنز (فیم) کی جانب سے 'شب غزل' پروگرام میں فن کار ڈاکٹر دوست محمد خان نے اردو غزل گائیکی کے ذریعے سماں باندھ دیا۔ بڑی تعداد میں اردو شائقین نے اس پروگرام میں شرکت کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پنڈت ناتھ زلکر نے شرکت کی۔ دبستان اور نگ آباد کے تحت خان شمیم کا تحریر کردہ منظوم ڈرامہ 'ولی دکنی' پیش کیا گیا۔ ہدایت: فوزیہ تحسین خان اور موسیقی: اتول دیوے کی تھی۔ یہ پیشکش کوئنز ڈرامہ اکادمی، پربھنی کی تھی۔

جس میں مہمان خصوصی شری انکوش راؤ کدم، محترمہ پاروتی دت، ڈاکٹر گیانندہ کلکرنی، ڈاکٹر ابھیجیت واڑیکر، جناب تحسین احمد خان، جناب امتیاز جلیل (ایم ایل اے) تھے۔ جبکہ کنوینر سالک حسن خان، معاون کنوینر جناب سید امجد الدین قادری تھے۔ خان شمیم کا یہ ڈرامہ اب تک کے ثقافتی پروگراموں کی پیش کش کا ماحصل تھا، زبان و بیان، شعریت، اشعار میں مکالماتی حسن اور جذبے کی پاکیزگی ڈرامے کے جملہ پہلو میں ولی دکنی کی سیرت، رنگ تغزل اور مقامیت کا حسن تھا جسے ناظرین نے بے حد پسند کیا۔

نواں دن: 4 جنوری 2015

17 ویں کل ہند اردو کتابی و تہذیبی میلے کا اختتامی اجلاس بروز اتوار مورخہ 4 جنوری 2015 کو منعقد ہوا۔ اجلاس کا آغاز شاعر مشرق علامہ اقبال کے 'سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا سے ہوا۔ اس کے بعد اجلاس کے صدر قومی کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین، کمشنر برائے لسانی اقلیات پدم شری پروفیسر اختر الواسع، جناب بشر نواز صاحب، قومی کونسل مہاراشٹر کے رکن سلیم محی الدین صاحب اور میلے کے کوآرڈینیٹر محمد خواجہ معین الدین صاحب کو مومنٹو پیش کیا گیا۔ اختتامی اجلاس کی نظامت جناب ابوبکر رہبر نے کی۔

محمد خواجہ معین الدین صاحب نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے میلے کی تیاریوں، میٹنگوں اور ریلی میں اُردو و غیر اردو داں حضرات کے تعاون کا ذکر کیا۔ ریلی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اساتذہ اور شریک کار تنظیموں کے تعاون اور طلبہ کی شمولیت اور ان کے جذبے کو سراہا۔ میلے کے تمام پروگرامس بطور خاص خواتین کا مشاعرہ، آنچل، طلبہ کے پروگرامس اور ڈراموں کی ستائش کی۔ اورنگ آباد کے میلے کو کامیاب ترین بلحاظ فروخت کتب، شمولیت خواتین و حضرات طلبہ، اسٹالس کی تعداد قرار دیا اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ سلیم محی الدین نے اپنے خطاب میں اردو کی سرزمین اورنگ آباد کو ترقی و ترویج کی سرزمین قرار دیا۔ اردو اکادمی میلے کا حصہ بن کر اپنی خوش نصیبی محسوس کرتی ہے۔ میلے میں ایک کروڑ روپے سے زائد کتابوں کی فروخت ہوئی۔ یہ ہندستان کے سب سے کامیاب میلے کی علامت ہے۔ اس کے بعد میلے میں عمدہ کارکردگی کے اعتراف میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ ریلی میں شامل مختلف اسکولس کو مومنٹو دیے گئے۔ وہیں قومی کونسل کی جانب سے بیسٹ کلیکشن آف ٹائٹلس (Best Collection of Titles) ہدیٰ بکس ڈسٹری بیوٹرس، حید رآباد، بیسٹ ڈیکوریٹر آف اسٹال (Best Decorator) شالیمار بک ہاؤس، اورنگ آباد، بیسٹ سیلنگ (Best Selling) کا ایوارڈ الحسنات پرائیویٹ بکس لمیٹڈ دہلی، کو دیا گیا۔ افتتاحی تقریب میں تعلیمی، تدریسی، صحافتی اور ثقافتی شعبے میں نمایاں کارکردگی کی حامل سرکردہ شخصیات کو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اردو صحافت کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں قومی کونسل کی جانب سے اثر فاروقی اور عزیز خسرو کو بعد از مرگ آفتاب صحافت اور ماہتاب صحافت کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ مولانا مجیب الدین قاسمی، پروفیسر محمد تلاوت علی، ڈاکٹر شبیر حسین جوش، جناب اشفاق احمد، پروفیسر عبدالوہاب جذب، جناب نور الحسنین، جناب محمد شکیل کے علاوہ خواتین انعام یافتگان میں ڈاکٹر قمر شریف، ذکیہ سبزواری، نعیمہ سلطانہ اور شائستہ مقیم کو بھی ایواڈ دیے گئے۔

قومی کونسل کے ممبر اور لسانی اقلیات کے کمشنر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ ہر مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو کے خمیر میں وہی خصوصیت ہے جسے داغ دہلوی کہتے ہیں کہ عالم میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ اکیسویں صدی کا آغاز اردو کی نوید لے کر آیا ہے۔ اردو کے 5 ٹی وی چینل اس ملک میں ہیں، ان چینلس کو غیر مسلم حضرات چلا رہے ہیں۔

اردو پر مسلم چھاپ صحیح نہیں ہے۔ اردو میں معاشی امکانات نہیں ہے یہ غلط ہے۔ کارپوریٹ سیکٹر بغیر فائدے کا کام نہیں کرتے۔ راشٹریہ سہارا غیر مسلم حضرات چلاتے ہیں۔

این سی پی یو ایل دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ پاکستان کے مقتدرہ سے بھی بڑا ادارہ۔ زبانوں کا رشتہ روزگار سے ہونا چاہیے، لیکن زبان کو چھوڑنا نہیں چاہیے، آزادی کے بعد ہندی ہر میدان میں چھا گئی۔ اردو فارسی کی 800 سالہ حکمرانی کے باوجود اردو کے تئیں ہمارا رویہ بدلنا

چاہیے، ماں، ملک، مذہب اور مادری زبان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اہل مدارس کو مبارکباد پیش کیا اور کہا کہ حکومت نے تقریباً 50 سال کے بعد 2009 میں مفت تعلیم کا قانون پاس کیا جبکہ مکاتب اور مدارس کے بوریہ نشینوں نے ہمیشہ مفت تعلیمی نظام ہی رکھا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو حکومت نہ کر سکی۔ اردو کو فلم انڈسٹری نے بڑھاوا دیا۔ اردو جذبات کی زبان ہے۔ انھوں نے کوی نیرج کے مقبول عام گیتوں کا ذکر کیا اور 12 ربیع الاول کی باسعادت ساعتوں کو آج کے علم و آگاہی کی اشاعت کے سیاق میں با معنیٰ گردانا۔ انھوں نے ماؤں کو تعلیم کی آماجگاہ بتایا اور کہا کہ مائیں پڑھی لکھی ہوں تو نسل تعلیم یافتہ ہوگی۔ اختتامی اجلاس میں شریک صدر مجلس اور قومی کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے عید میلاد النبی کے مبارک موقع پر امی اور رہبر اسلام محمدؐ کے تعلیمی مشن کا حوالہ دیتے ہوئے تعلیم اور زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اورنگ آباد کے لوگوں کے لیے اسے پاکیزہ دن قرار دیا۔ یہ میلہ اب تک کا سب سے زیادہ ہرا بھرا میلہ ہے جہاں ہم نے سب کچھ پایا۔ اس طرح کے اردو میلے سجتے رہیں گے۔ تعلیم کا نشہ سب سے بڑھ کر ہے، زبان کو روزگار سے جوڑنا ضروری ہے، صرف شاعری سے پیٹ نہیں بھرے گا۔ این سی پی یو ایل نے ساٹھ کروڑ کے بجٹ کے ساتھ مختلف تعلیمی اور رفاہی اسکیموں پر مستحکم انداز میں کام کیا ہے، انھوں نے کونسل کے کمپیوٹر پروگرام کی ستائش کی اور کہا کہ ہم نے کونسل کے پلیٹ فارم سے ایک بڑی تعداد کو تکنیکی تعلیم سے بہرہ ور کیا ہے، ہم اپنے کمپیوٹر پروگرام کے ذریعے ملک کے گوشے گوشے میں حاضر ہیں۔ 20 ممالک میں اردو کی کتابیں اور ہمارے کمپیوٹر سینٹر سے فارغین خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کونسل بڑی تعداد میں کتابیں چھاپتی ہیں۔ شعرا اور اسکالرس کو ہم ان کے کاموں کا معقول معاوضہ دیتے ہیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ہمیں وسعت نظر کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اردو کے حلقے میں دوسرے طبقات کی شمولیت کو یقینی بنانا چاہیے۔ اردو ہندی کے زیادہ قریب ہے، میلے میں شریک ناشرین کتب سے انھوں نے درخواست کی کہ ناشرین انگریزی کے ساتھ ہندی کو بھی اس کی جگہ دیں۔ یہ ہماری راشٹر بھاشا ہے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے دستخط کا سکہ جاری کیے جانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا، جس پر مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی ایرانی نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی ہے۔

قومی کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ نے اپنے اظہار تشکر میں واضح کیا کہ 1996 میں قومی کونسل نے 85 لاکھ کے بجٹ کے ساتھ اپنا سفر شروع کیا تھا جو اب 60 کروڑ تک پہنچ چکا ہے۔ یہ ہماری بڑی کامیابی ہے۔ این سی پی یو ایل پہلا ادارہ ہے جس نے خود کو ISO کے پیمانے پر اتارا ہے اور ISO سند یافتہ ہے۔ کونسل کے ساتھ اپنے 16 سالہ تجربات میں کتابوں کی اشاعت پر مبنی اس میلہ میں ہم نے 155 اسٹال تک کا یہ سفر شہر اورنگ آباد میں کیا ہے بلاشبہ یہ کریڈٹ اورنگ آباد شہر کو جاتا ہے، انھوں نے میلے میں معاون شریک کار تنظیموں، میڈیا، ناشرین اور مراٹھواڑہ کی عوام کا بھی شکریہ ادا کیا اور ان کے تعاون اور خلوص کی تعریف کی۔ میلے کی خوشگوار یادیں لیے اختتامی اجلاس کامیابی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔

■

Imteyaz Waheed, D-50,17, Hijabe Islami, Abul Fazal Enclave, New Delhi - 110025

آمنہ آفرین

اردو ریسرچ اسکالر کے مسائل اور حل

یونیورسٹی میں مجھے 10 سال کے عرصے میں بہت سارے ریسرچ اسکالروں سے ملنے اور ان سے تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا اور ان ریسرچ اسکالروں کو ریسرچ کے دوران جو مسائل پیش آتے ہیں ان کی جانکاری حاصل ہوئی۔ انھی میں سے کچھ یہاں پیش کروں گی۔ جیسے موضوع اور مواد کو لے کر پیش آنے والے مسائل، مقالہ لکھنے کے دوران جن کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا بیان، وقت کی کمی کے مسائل اور نگراں کار کو لے کر ریسرچ اسکالر کے مسائل وغیرہ۔

ریسرچ کسی ادب پارے کی بازیافت، تصدیق یا تردید، نئے حقائق کی تلاش، حقائق کی تشریح و تعبیر اور تشہیر، حقیقت کی تلاش و توسیع ہے اور ریسرچ اسکالر وہ ہے جو اس طرح کے کام کو انجام دیتا ہے۔ اور ریسرچ کے دوران ایک ریسرچ اسکالر کو بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا ضروری نہیں ہے کہ مسائل ہر ریسرچ اسکالر کو پیش آتے ہوں لیکن زیادہ تر ریسرچ اسکالروں کو مسائل سے دوچار دیکھا جا سکتا ہے۔

موضوع اور مواد کے مسائل:

موضوع سے متعلق ریسرچ اسکالر کو جن مسائل کا سامنا ہوتا ہے ان میں ایک یہ کہ ریسرچ اسکالر اپنے پسند کے موضوع پر نہیں بلکہ اپنے نگراں کا یا کسی دوسرے اساتذہ کے تجویز کردہ موضوع پر کام کر رہا ہو اور ریسرچ اسکالر کو موضوع سے متعلق بالکل بھی جانکاری نہ ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کام کہاں سے شروع کریں۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ جو موضوع ریسرچ اسکالر کا پہلے سے منتخبہ ہے اس پر وہ کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور موضوع تبدیل کرنا چاہتا ہو تو ریسرچ اسکالر کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے لیے دوسرا موضوع منتخب کر لے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ موضوع تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ملتی اور اگر مل بھی جائے تو صرف اتنی کہ وہ اپنے پہلے والے موضوع ہی میں کچھ تبدیلی کر سکتا ہے۔ بعض اوقات موضوع ریسرچ اسکالر کے لیے اتنا بڑا مسئلہ بن جاتا ہے کہ وہ اپنی ریسرچ کو آدھا ادھورا یا کبھی نامکمل چھوڑ جاتا ہے۔

ریسرچ میں موضوع کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اگر موضوع ہی ریسرچ اسکالر کی سمجھ سے باہر ہو تو بہت سارے مسائل پیش آئیں گے۔ موضوع طے ہونے سے قبل ریسرچ اسکالر کے ذہن میں اس موضوع سے متعلق خاکہ ہونا چاہیے اور موضوع منتخب ہونے کے فوری بعد اپنا تحقیقی کام شروع کر دیں اور اپنے موضوع کو وہ کتنے بہتر طریقے سے پیش کر سکتے ہیں، اس کی جستجو شروع کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ موضوع منتخب ہونے کے بعد ریسرچ اسکالر یہ سوچے کہ ہم اس کو بعد میں دیکھ لیں گے۔

مواد سے متعلق جو مسائل عام ہیں جیسے مواد ریسرچ اسکالر کی پہنچ سے دور ہو یا مواد حاصل کرنے میں کافی وقت درکار ہیں وغیرہ۔ لیکن موجودہ دور میں مواد کی فراہمی کا مسئلہ بہت کم ریسرچ اسکالروں کو پیش آتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں تین چیزیں ایک ریسرچ اسکالر کو آسانی سے میسر ہیں۔ فون، انٹرنیٹ اور زیراکس۔ پھر بھی بعض ریسرچ اسکالروں کو مواد کی فراہمی کے مسائل ہوتے ہیں جیسے کہ بعض ریسرچ اسکالر ایسے ہیں جنھیں لائبریری میں کیٹلاگ دیکھنا نہیں آتا اور وہ لوگ انٹرنیٹ سے واقف نہ ہوں۔ اگر کیٹلاگ دیکھ کر کتاب کا نمبر نکال بھی دیں تو انھیں اس نمبر کو کتابوں کے ذخیرے میں مشکل ہی نہیں بعض اوقات ناممکن نظر آتا ہے۔

ایسے ریسرچ اسکالر جنھیں اس طرح کے مسائل ہیں وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت لائبریری میں گزاریں۔ جب تک وہ یہ کام سیکھ نہیں لیتے کیونکہ دوست احباب آپ کی ریسرچ مکمل ہونے تک آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لیے ضروری ہے کہ وہ خود کوشش کر کے یہ کام سیکھیں۔

مقالہ لکھنے کے مسائل:

ریسرچ اسکالر بالخصوص ایم فل ریسرچ اسکالر کو مقالہ لکھنے کے طریقے کے سلسلے میں بہت سارے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جس وقت انھیں مقالہ لکھنے کے اصول سکھائے جاتے ہیں یہ زیادہ توجہ نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے، ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن بہتر ریسرچ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جب تک ریسرچ اسکالر کام میں سنجیدگی اور دلچسپی سے کام نہ لیں تو وہ بہتر ریسرچ نہیں کر سکتا۔ برائے نام ریسرچ ضرور کر سکتا ہے۔

بعض ریسرچ اسکالر مقالہ لکھنے کا مطلب صرف مواد جمع کر لینا سمجھتے ہیں۔ زیادہ تر ریسرچ اسکالر مقالہ لکھنے کے دوران مواد میں بنا کسی تبدیلی کے کتابوں سے جوں کا توں لکھ لیتے ہیں پھر چاہے وہ کسی مشہور نقاد کی تنقیدی کتاب ہی سے کیوں نہ ہو۔ اگر نگراں کار کا مطالعہ وسیع ہوگا تو انھیں یہ معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ریسرچ اسکالر کی اس غلطی کو درست کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات نگراں کو بھی اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ مواد جو بنا کسی حوالے کے مقالے میں رکھا گیا ہے مقالے کی خوبصورتی میں اضافہ تو کرے گا لیکن یہ ادب میں اضافے کا کام نہیں کر سکتا۔

ریسرچ ادب میں اضافے کا نام ہے۔ لیکن بعض

ریسرچ اسکالر اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ انہیں صرف اتنا یاد رہتا ہے کہ ایک سمسٹر میں جیسا ہو جتنا ہو ہمیں مقالہ لکھ کر یونیورسٹی میں داخل کر کے ڈگری حاصل کر لینی ہے۔

نگراں کار اپنے ریسرچ اسکالر کی صحیح رہنمائی کریں تو ریسرچ اسکالر کو کبھی جلد بازی یا گھما گھمی والا تحقیقی کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن اس کے لیے ریسرچ اسکالر کو بھی چاہیے کہ جس وقت نگراں کار منتخب ہوں ہمیشہ ان سے رابطے میں رہے اور اپنے ریسرچ کے کام پر ان سے صلاح و مشورے لیتا رہا۔ جب تک کہ ریسرچ کا سارا کام مکمل نہیں ہو جاتا کہیں ایسا نہ ہو کہ ریسرچ اسکالر نگراں کار سے موضوع منتخب ہونے کے وقت ملاقات کی ہو اور پھر بعد میں مقالہ داخل کرنے کے وقت دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا ہو۔

وقت کی کمی کے مسائل:

یونیورسٹی سطح پر ریسرچ اسکالرز کو جو ریسرچ کا کام دیا جاتا ہے اس میں وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ بہت سارے ریسرچ اسکالر ایسے ہوتے ہیں جنھیں وقت کی کمی کے مسائل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایم فل کے لیے جو ریسرچ کا کام ہوتا ہے اس کے لیے صرف ایک سمسٹر کی مدت دی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر ایک سمسٹر میں کام نہیں کیا گیا تو ریسرچ اسکالر کو ڈگری نہیں دی جائے گی۔ اس کے لیے ریسرچ اسکالر کو ریسرچ کا وقت بڑھانے کی سہولیتیں موجود ہیں۔ لیکن جو ریسرچ اسکالر اسی سال پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لینے کے خواہش مند ہیں ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اسی مدت میں اپنا سارا کام مکمل کر کے مقالہ داخل کریں۔

اگر ریسرچ اسکالر اپنی اپنی ریسرچ وقت ختم ہونے سے پہلے مکمل کرنا چاہے تو وہ اپنے موضوع کو ذہن میں رکھتے ہوئے وقت کی تقسیم کر لے لیکن زیادہ تر ریسرچ اسکالر منظم طریقے کو نہیں اپناتے اور مقالہ داخل کرنے کے آخری اوقات میں کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ایک ریسرچ اسکالر اپنے مقالے میں چار ابواب رکھنے کا خاکہ تو بنا چکا ہے لیکن آخر میں وہ وقت کی کمی کے باعث صرف تین ابواب لکھ کر مقالہ تو داخل کر دیتا ہے لیکن ریسرچ کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا۔

بعض ریسرچ اسکالر ایسے ہوتے ہیں جنھیں جتنا چاہے وقت مل جائے لیکن وہ اپنا کام مقالہ داخل کرنے کے آخری وقت میں ہی کرنا پسند کرتے ہیں۔ ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ وہ اپنے موضوع کو ذہن میں رکھتے ہوئے خاکہ بنائے اور اس خاکہ کے حساب سے وقت کی تقسیم کریں اور منظم طریقے سے اپنا کام انجام دیں۔

نگراں کے انتخاب کا مسئلہ:

یونیورسٹی سطح پر ایک ریسرچ اسکالر کو ایک نگراں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس وقت ریسرچ اسکالر کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کیا دیکھے جس کی وجہ سے نگراں کار کو منتخب کرنے میں آسانی ہو۔ اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ نئے ریسرچ اسکالر کو جو طریقِ تحقیق سکھایا جاتا ہے اس کے لیے ایک استاد مختص ہوتے ہیں اور ہونا چاہیے لیکن شعبے کے دوسرے ایسے اساتذہ جو ریسرچ اسکالر کو لے کر اپنے تحت کام کروانا چاہتے ہیں انھیں بھی کم

سے کم دو یا تین کلاسیں ان کا اپنا کام کروانے کا طریقِ کار سمجھانے کا موقع دیا جانا چاہیے جس سے تمام ریسرچ اسکالروں کو سارے اساتذہ سے ملنے انھیں جاننے اور ان کے کام کرنے کے طریقِ کار کو بھی سمجھنے کا موقع ملے گا اور اپنے نگراں کار کو منتخب کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔ اور کبھی کسی ریسرچ اسکالر کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

ایک مسئلہ نگراں کار سے ریسرچ اسکالر کو اس وقت ہوتا ہے جب نگراں کار ریسرچ اسکالر کو اپنے تحت کام کروانے کے لیے رکھ لیتے ہیں لیکن جب بھی ریسرچ اسکالر کو ان کی ضرورت پیش آتی ہے یا ریسرچ اسکالر ان سے ملنا چاہتا ہے ان کے پاس ریسرچ اسکالر کو دینے کے لیے وقت بالکل نہیں ہوتا۔

نگراں کار کے سلسلے میں ریسرچ اسکالر کا ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ نگران کار کچھ مخصوص موضوعات ہی پر کام کرواتے ہیں اور ریسرچ اسکالر کا جو موضوع طے ہوتا ہے وہ نگراں کار کے ذوق سے الگ ہے۔ اس وقت ریسرچ اسکالر اس موضوع کی سمجھ رکھنے والے شعبے کے یا باہر کے دیگر اساتذہ سے صلاح و مشورہ کرتے ہیں۔ یہ بات ریسرچ اسکالر کے نگراں کار کو بہت ہی ناگوار گزرتی ہے۔ اس طرح کی صورتِ حال میں ریسرچ اسکالر کو بہت سارے مسائل پیش آتے ہیں۔ جس کا اندازہ نگراں کار کو نہیں ہوتا۔ نگراں کار کو چاہیے کہ وہ یا تو اس طرح کے کام کرنے والے ریسرچ اسکالر کو اپنے تحت نہ رکھیں اور اگر رکھیں تو ان ریسرچ اسکالروں کی پوری طرح رہنمائی فرمائیں۔

نگراں کار کو لے کر ریسرچ اسکالر کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ جس نگراں کار کے پاس ریسرچ اسکالر نے ایم فل میں رہنمائی حاصل کی ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ پی ایچ ڈی میں بھی ریسرچ اسکالر انھیں ہی اپنا نگراں کار بنائے۔ اگر ریسرچ اسکالر اپنی مرضی سے کسی اور استاد کو اپنا نگراں کار رکھنا چاہیے تو ریسرچ اسکالر کو مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ اپنے پہلے والے نگراں کار سے۔ ورنہ ریسرچ اسکالر کو نگراں کار بدلنے کے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

بہت سارے ریسرچ اسکالروں کو اپنے نگراں کار سے مسائل ہوتے ہیں۔ جس کا اظہار ریسرچ اسکالر اپنے نگراں کار سے نہیں کر پاتے۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں سے اس کا اظہار بلا جھجک کرتے ہیں۔ ریسرچ اسکالر کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے بجائے خود نگراں کار کو اپنے مسائل سے آگاہ کر دیں تو مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ نگراں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے ریسرچ اسکالر سے اس طرح پیش آئے کہ وہ اپنے تمام مسائل پر نگراں کار سے بات کر سکے۔

حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ ریسرچ کے دوران ایک ریسرچ اسکالر کو پیش آنے والے مسائل میں موضوع اور مواد، مقالہ لکھنا، وقت کی کمی اور نگراں کار کو لے کر ریسرچ اسکالر کے مسائل وغیرہ۔ یہ مسائل ایسے ہیں جو عام طور پر ایک یونیورسٹی ریسرچ اسکالر کو پیش آتے ہیں۔ یہ اتنے بڑے مسائل بھی نہیں ہیں جس کا حل ممکن نہیں ہے۔ اگر ایک ریسرچ اسکالر اپنے موضوع اور مواد کے مسائل سے پریشان ہے تو انھیں چاہیے اپنا مطالعہ وسیع کر لے جس سے موضوع اور مواد کا مسئلہ حل ہوگا۔ مقالہ لکھنے کے مسائل ہوں تو چاہیے کہ لکھنے کی مشق کرتے رہیں اور جنھیں وقت کی کمی کا مسئلہ پیش آتا ہے وہ ریسرچ کے دوران منظم طریقہ اپنائے۔ رہا سوال نگراں کار کو لے کر ریسرچ اسکالر کے مسائل کا، تو یہ مسائل زیادہ تر ان ریسرچ اسکالرز کو پیش آتے ہیں جو نگراں کار کو سمجھ نہیں پاتے۔ ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ وہ جس نگراں کار سے رہنمائی حاصل کر رہا ہے اس کے مزاج اور اس کی پسند اور ناپسند کو جاننے کی کوشش کریں۔ اور نگراں کار کو چاہیے کہ وہ اپنے تمام ریسرچ اسکالروں میں امتیاز نہ کریں اور ریسرچ اسکالر سے ہمدردی سے پیش آئے۔ امید ہے کہ اس طرح سے کسی ریسرچ اسکالر کو نگراں کار کو لے کر کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا۔

■

Dr. Amena Afreen, H.No. 12-176/1, srinagar Colony, Patancheru, Hyderabad. 502319 (AP)

محمد مطیع الرحمن

عزیز احمد فن اور شخصیت

عزیز احمد اردو فکشن کا وہ بڑا نام ہے جس کے بغیر اردو ناول و افسانہ نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے شاعری بھی کی، ڈرامے بھی لکھے، تراجم اور تنقید میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی ادبی سرگرمیوں کے خالص علمی و معروضی انداز سے بحیثیت مجموعی اردو ادب پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ گئے۔ غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ پاکستان میں سکونت اختیار کی، اٹلی کی شہریت حاصل کی۔ برطانیہ میں یونیورسٹی کی سطح پر تدریس کے فرائض انجام دیے اور کناڈا میں انتقال کیا۔ عزیز احمد نومبر 1914 میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے نومبر 2014 میں ان کی ولادت کے سو سال پورے ہونے پر جو خراج تحسین و عقیدت، کرشن چندر صدی کی کور اسٹوری کی وجہ سے پیش نہیں کیا جاسکا تھا وہ زیر نظر دو مضامین اور ایک افسانے کی صورت میں نذرِ قارئین ہے:

عزیز احمد کثیر الجہات، وسیع مایۂ شعور اور نابغۂ روزگار ادیب واقع ہوئے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی شہرت و قابلیت کے لحاظ سے چند قابل ذکر ابھرنے والے ادیبوں اور فن کاروں میں عزیز احمد کا نام کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ ناول، ناولٹ، افسانے، شاعری، ڈرامے، تراجم، تنقید اور تاریخ وتہذیب وغیرہ میں ان کی تحریریں کمیت وکیفیت اور وزن ووقار کے لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ کا اصل نام عزیز احمد ہے۔ اسی نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ ابتدا میں اگرچہ عزیز احمد 'عثمان آبادی' کے قلمی نام سے بھی لکھتے رہے۔ آپ کی پیدائش 11 نومبر 1914 میں حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ سنہ ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اردو ادب کے معروف ادبی تاریخ نویس جمیل جالبی نے سال پیدائش 1913 لکھا ہے اور مقام پیدائش بارہ بنکی اتر پردیش درج ہے۔ جبکہ عزیز احمد نے اپنے خط میں جو محترمہ شمیم افزا کے نام ہے، سنہ ولادت 1914 اور مقام پیدائش بارہ بنکی کے بجائے حیدرآباد دکن بتایا ہے، لکھتے ہیں:

''سنہ پیدائش 1914 دادیہال کاکوری کا ہے اور نانیہال بانسہ شریف ضلع بارہ بنکی کا۔ خود حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔''

(عزیز احمد فکر وفن اور شخصیت، جلد اول، ص 156)

عزیز احمد کے والد کا نام شبیر احمد ہے۔ آپ پیشے سے وکیل تھے۔ حیدرآباد دکن کے نامور وکلا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کاکوری محلہ کے گھماحل میں سکونت پذیر تھے۔ کمسنی میں ہی عزیز احمد کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا۔ والد کا انتقال اس وقت ہوا جب آپ چھ برس کے تھے اور جب نو برس کے ہوئے تو شفقت مادری سے محروم ہوگئے۔ محمد احمد جو آپ کے ماموں تھے ان کی زیر تربیت عزیز احمد کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ محمد احمد وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اور عثمان آباد میں ہی مقیم تھے۔ عزیز احمد کی دو بہنیں تھیں، دونوں کا قیام پاکستان میں ہے۔ آپ کی شادی حیدرآباد کے ایک معزز خاندان میں 1940 میں ہوئی۔ عزیز احمد کے سسرال والے اگرچہ آگرہ اور لکھنؤ کے تھے، مگر حیدرآباد میں ان کے نانا ماہر الدولہ آرمی سکریٹری، اور ان کے والد فوج میں کرنل تھے۔ آپ کو تین اولاد ہوئیں، جن میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔ ان سبھی کا قیام پاکستان میں رہا۔

عزیز احمد نے ابتدائی تعلیم عثمانیہ ہائی اسکول عثمان آباد مرہٹواڑہ سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ میٹرک کے بعد انھوں نے 1928 میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ایف اے کرنے کے بعد 1934 میں امتیازی نمبرات سے بی اے آنرز کیا۔ عزیز احمد کلاس میں ٹاپ کرنے کے علاوہ پوری یونیورسٹی میں اول پوزیشن لائے۔

عزیز احمد کے اساتذہ میں مولوی عبدالحق، پروفیسر عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زور، مناظر احسن گیلانی اور مولوی وحید الدین سلیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عزیز احمد افتاد طبع اور علم کے رسیا واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی تعلیم وتربیت کو ہی اپنی تعلیمی زندگی کا آخری معیار و مرکز تصور نہیں کیا، حالانکہ عثمانیہ یونیورسٹی اپنے عہد کا ایک اہم تعلیمی مرکز تھا، اس کے باوجود اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے 1935 میں انگلستان گئے۔ وہاں انھوں نے بی اے آنرز انگلش میں کیا۔ اس دوران عزیز احمد نے کئی غیر ملکی زبانیں (فرانسیسی، جرمن) بھی سیکھیں۔ 1938 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وطن واپس ہوئے، تو جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ 1938 تا 1941 تدریسی عمل انجام دیتے رہے۔ 1941 تا 1945 آصف سابع نظام حیدرآباد کی بہو شہزادی درشہوار کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ اس دوران گرمیوں کے موسم میں کشمیر جانا ہوتا تھا۔ 1946 میں پھر تدریسی عمل سے وابستہ ہوگئے۔ 1949 میں آپ جامعہ عثمانیہ کو خیر باد کہہ کر پاکستان چلے گئے۔ 1949 تا 1950 اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات (مطبوعات وفلم سازی) رہے۔ اسی ایک سال کے دوران

آپ کو اس محکمے کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ تقریباً تین سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس کے علاوہ 1953 تا 1957 محکمہ تعلقات عامہ وزارت امور کشمیر کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اس کے بعد اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن سے اردو سریز کے لیے لکچرر شپ کا آفر آیا۔ چنانچہ آپ 1957 میں لندن منتقل ہو گئے اور وہاں 1962 تک خدمت انجام دیا۔ 1962 سے لے کر تا وفات ٹورنٹو یونیورسٹی کناڈا کے شعبۂ اسلامیات میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے رہے۔ اس کے علاوہ کیلی فورنیا یونیورسٹی لاس اینجلز، امریکہ کے بھی تا حیات وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ ٹورنٹو (کناڈا) میں آپ کا قیام سینٹ جان بلڈنگ کے تین بیڈروم اپارٹمنٹ میں رہا۔ ادبی محفل میں آپ کی آخری شرکت فیض احمد فیض کے اعزاز میں منعقد مشاعرے میں ہوئی تھی، یہ مشاعرہ کناڈا میں ہوا تھا۔ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے، تین بار آنت کا آپریشن ہوا۔ آخری آپریشن میں ان کی بڑی آنت نکال کر پلاسٹک کی تھیلی لگا دی گئی تھی، مگر یہی مہلک مرض موت کا سبب بنا، ملازمت کی مدت کار ختم ہونے سے ٹھیک چھ ماہ قبل 16 دسمبر 1978 کو کناڈا میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

عزیز احمد کی ادبی و تخلیقی زندگی پانچ دہائیوں پر محیط ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز 1928 میں ایک مزاحیہ فیچر سے ہوا۔ ان دنوں وہ جامعہ عثمانیہ میں بی اے کے ابتدائی طالب علم تھے اور مسرت منزل میں مقیم تھے۔ اپنی تصنیفی و تالیفی زندگی کے آغاز کے متعلق عزیز احمد رقمطراز ہیں:

”1928 کا ذکر ہے میں جامعہ عثمانیہ میں بی اے کے ابتدائی سال میں تھا۔ مسرت منزل میں، جو اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے چاروں اقامت خانوں (ہاسٹلوں) میں سب سے زیادہ بارونق تھا سوشل گیدرنگ کے سلسلے میں ایک ڈرامہ کی ضرورت ہوئی۔ چھوٹے سے مزاحیہ فیچر کی۔ میں نے ایک چھوٹا سا فیچر لکھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اس طرح میں نے تصنیف و تالیف کی ابتدا کی۔“

(ہوس، عزیز احمد، ص 155)

اسی سال انھوں نے ایک ڈرامہ بھی لکھا، جو کالج ڈے کے موقع پر اسٹیج کیا گیا اور بے حد مقبول ہوا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک انوکھا ڈرامہ تھا پیشکش کا انداز منفرد اور نرالہ تھا، اس میں پہلی بار مغربی فلموں کی اداکاری کی نقل کی گئی تھی، عام طور پر اس زمانے میں پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کی نقل ہوتی تھی، مشرقی انداز غالب تھا۔ عزیز احمد نے جدت طبع سے کام لے کر ایک نیا طرز اپنایا۔ اس سلسلے میں عزیز احمد لکھتے ہیں:

”اسی سال سرما میں جب یوم کلّیہ (کالج ڈے) منایا جانے لگا تو صدر انجمن اتحاد (کالج یونین) نے مجھ سے ایک ڈرامے کی فرمائش کی۔ میں نے ایک ڈرامہ لکھ مارا جس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ اداکاروں نے مغربی فلموں کی اداکاری کی نقل کی، نہ کہ پارسی تھیٹریکل کمپنیوں اور ہندوستانی فلموں کی اداکاری کی۔“ (ہوس، عزیز احمد، ص 155)

اس ڈرامے کا ایک خاص وصف زبان و بیان کا فنکارانہ استعمال بھی تھا۔ دار صل عزیز احمد کو حیدر آباد کی زبان اور لب و لہجے پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وہاں کے مخصوص لب و لہجے کا استعمال اس ہنر مندی و فنکاری سے کیا ہے کہ ڈرامہ میں جان پڑ گئی اور اثر انگیزی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا ایک کردار ابراہیم خالص دکنی زبان بولتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند الفاظ دیکھیے کس قدر دلچسپ ہیں:

”اجی حضت وہ کتاب آپ دیتاؤں بول کے بولے تھانہ وبچ کتاب لینے کو آیا ہیں۔“

(عزیز احمد فکر و فن اور شخصیت، جلد اول، ص 65)

عزیز احمد نے زندگی کے گہرے تاثرات، انمٹ نقوش اور معاشرتی حالات کو اتنی سچائی، جامعیت اور قطعیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس عہد کی تصویریں ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس کے ناولوں میں صرف ایک عہد اور اس کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی پرچھائیاں ہی روشن نہیں ہوتیں بلکہ اس پس منظر میں آنے والے کرداروں کے ذہنی میلانات، سیاسی رجحانات، قلبی جذبات اور نفسیاتی کیفیات بھی سامنے آجاتی ہیں۔

اس ڈرامے میں حیدر آبادی لہجہ بالخصوص ’ق‘ اور ’ج‘ کا خوبصورت استعمال مکالمہ کی اثر انگیزی میں چار چاند لگا تا ہے۔ غرض یہ ڈرامہ اپنے انوکھے اور نئے طرز تحریر کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا اور اس کی وجہ سے عزیز احمد کو یونیورسٹی کے علاوہ پورے شہر میں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی۔ بقول عزیز احمد:

”اس ڈرامے کو حیدر آباد میں بہت پسند کیا گیا اور مجھے کہتے ہوئے افسوس بھی ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے کہ جتنی شہرت مجھے اس طالب علمی کے زمانے میں نصیب ہوئی، ابھی تک میسّر نہ آسکی۔“ (ہوس، عزیز احمد 156-155)

یہ تحریر عزیز احمد کی اس وقت کی ہے جب وہ اپنے کئی قابل ذکر ناول، افسانے اور دیگر تنقیدی تحریروں کے ذریعے اردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کر چکے تھے، مگر نقادوں کی عدم توجہی کا شکار رہے، جو بلاشبہ ان کے علم و فن کی ناقدری کو واضح کرتا ہے۔

ڈرامے کے فن سے زیادہ دنوں تک وابستگی نہیں رہی اس کی وجہ ان کا طبعی میلان رہا ہے۔ ڈرامے کے بہ نسبت فکشن خصوصاً ناول کی طرف ذہنی اور فکری رجحان زیادہ تھا یہی وجہ ہے کہ جلد ہی فکشن کی طرف مائل ہوئے اور پہلا ناول ’ہوس‘ لکھا، جو ان کی طالب علمی کے زمانے کی کاوش ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

”معلوم نہیں کون سی اندرونی طاقت تھی جو مجھ سے کہتی تھی تمھارا اصلی میدان ڈرامہ نہیں ناول ہے۔ تھرڈ ایر کے ختم پر جب گرما کی چھٹی آئی اور میں چھٹیاں گزارنے عثمان آباد گیا تو میں نے ’ہوس‘ لکھا جو میرا پہلا ناول ہے۔“ (ہوس، عزیز احمد، ص 156)

عزیز احمد کا پہلا افسانہ ’کشاکش جذبات‘ کے عنوان سے ہے۔ یہ افسانہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی ادارت میں شائع ہونے والا مجلہ مکتبہ حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ شمارہ نمبر نومبر 1929 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد پوری طرح فکشن کی طرف مائل ہو گئے اور اپنے تخلیقی شعور اور فنی بصیرت سے کام لے کر اردو فکشن کو ایک درجن سے زائد تصنیفات دی۔ اس عہد کے اہم ترین فکشن نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے چھ ناول اور تین ناولٹ، ہوس (1951)، مرمر اور خون (1944)، گریز (1955)، آگ (1956)، ایسی بلندی ایسی پستی (1948) جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں (1966) اور مثلث (1985) معرض وجود میں آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

عزیز احمد کے فن کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے شہر کی پیچیدہ طبقاتی زندگی کے جذباتی اور ذہنی انتشار، مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم اور متوسط طبقے کی بدلتی ہوئی نفسیات کو بڑی بے باکی اور ژرف نگاری سے پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اسلم پرویز:

”عزیز احمد نے زندگی کے گہرے تاثرات، انمٹ نقوش اور معاشرتی حالات کو اتنی سچائی، جامعیت اور قطعیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس عہد کی تصویریں ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس کے ناولوں میں صرف ایک عہد اور اس کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی پرچھائیاں ہی روشن نہیں ہوتیں بلکہ اس پس منظر میں آنے والے کرداروں کے ذہنی میلانات، سیاسی رجحانات، قلبی جذبات اور نفسیاتی کیفیات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ لہٰذا عزیز احمد کے ناول اپنے عہد کی زریں تاریخ بن گئے ہیں۔“ (عزیز احمد بحیثیت ناول نگار، ص 41)

عزیز احمد نے اردو ناول کو اجتماعی شعور، نفسیاتی بصیرت اور نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے ناولوں میں رومان و حقیقت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس کے علاوہ وسیلۂ اظہار

کی ندرت اور بیان کی جدت قاری کو متاثر کرتی ہے۔ان کے یہاں تکنیک اور ہیئت کے نئے تجربے بھی ملتے ہیں۔مغربی ادب کے مطالعے نے انھیں وسیع النظر بنا دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے فکر وفن میں نیا رنگ وآہنگ خاص کر جھلکتا ہے۔

عزیز احمد نے ناول کے علاوہ کئی اچھے افسانے بھی لکھے ہیں رقص ناتمام(1940)، بیکار دن بیکار راتیں(1950)، آبِ حیات(تاریخی افسانے)(1986)، میٹھی چھری(1947)، کایا پلٹ(1947) میں طبع ہو چکے ہیں۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے'کلیات عزیز احمد (افسانے)' کے عنوان سے ان کے تمام افسانوں کو یکجا کردیا ہے۔ان کے بیشتر افسانے اعلیٰ طبقے کی منافقت اور جنسی اخلاقی کج روی کو اجاگر کرتے ہیں۔ساتھ ہی ان کے افسانوں میں کہیں تاریخی پس منظر ادبی حسن کے ساتھ نمایاں ہے تو کہیں افسانوی ادب کا مخصوص اساطیری نظام صاف طور پر جھلکتا ہے۔مدن سینا اور صدیاں، رومۃ الکبریٰ کی ایک شام اور'زریں تاج' تاریخی شعور وآگہی کے اعتبار سے ان کے وہ افسانے ہیں جن کی اردو ادب میں کوئی نظیر نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے موضوع، ٹریٹمنٹ، تکنیک اور اسلوب کی وجہ سے معاصر افسانہ نگاروں میں ممتاز اور منفرد دکھائی دیتے ہیں۔

فکشن کے علاوہ تنقید کے میدان میں بھی ان کی خدمات قابل توجہ ہیں۔تنقید میں ان کی گرانقدر تصانیف'ترقی پسند ادب'، 'اقبال ایک نئی تشکیل' اور 'کلیات نثر عزیز احمد' (مرتب ڈاکٹر صدیق جاوید) خاص اہمیت رکھتی ہیں۔یوروپی ادب کے گہرے مطالعے کے باوصف ان کی تنقید میں وسیع النظری اور فکری بالیدگی نمایاں ہے۔ادب پارے کو دیکھنے، سمجھنے اور اس پر اپنی رائے قائم کرنے میں بے حد محتاط اور چشم کشا واقع ہوئے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ادب کا رشتہ اس کے داخلی وخارجی امتزاج سے مکمل ہوتا ہے۔اس میں جسمانی، روحانی، وجدانی، معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی عناصر، سب کچھ شامل ہیں۔اس لیے ان ساری چیزوں کو سامنے رکھ کر ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اسی بنا پر وہ ادب میں تحلیل نفسی کے بھی قائل ہیں۔وہ ادب کی افادیت پر زور دیتے ہیں، ادب اور تنقید کو سماج کی اصلاح اور ذات کی تطہیر کا ایک بہترین آلہ تصور کرتے ہیں، مگر یہ سب کچھ میکانکی طور پر نہ ہو بلکہ اس کے اندر ادبی حسن بھی پایا جائے۔معاملہ بندی، غیر ضروری علامات، رعایت لفظی اور ادب میں ابہام کو ادب کے لیے مضر گردانتے ہیں۔عزیز احمد کے یہی تصورات ونظریات ان کی عملی تنقید میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ان کا تجزیاتی وتنقیدی طریقہ کار سائنٹفک اور معروضی ہوتا ہے۔ان کی تنقیدی تحریریں علمیت، معروضیت اور گہری بصیرت کا آئینہ ہیں۔

عزیز احمد کی ادبی شناخت ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے بھی ہے۔انھوں نے یوروپی ادب کے کئی شاہکار فن پاروں کا کامیاب ترجمہ کرکے اردو ادب کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ان کے تراجم میں ارسطو کی شہرہ آفاق تصنیف فن شاعری (بوطیقا)، دانتے کی کتاب ڈیوائن کامیڈی کا ترجمہ طربیہ خداوندی، ابسن کے ڈرامے ماسٹر بلڈر کا ترجمہ معمار اعظم اور ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو جولیٹ شامل ہیں۔عزیز احمد کو بیک وقت کئی غیر ملکی زبانوں پر کامل دسترس حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ وہ بخوبی اس کارنامے کو انجام دے سکے۔

ان ادبی کارناموں کے علاوہ عزیز احمد نے شاعری پر بھی طبع آزمائی کی ہے'عمر خیام' جو ایک منظوم ڈرامہ ہے، کے علاوہ 'ماہ لقا اور دوسری نظمیں' ان کی شعری تخلیقات کی عمدہ مثالیں ہیں۔شعری ادبیات سے انس ولگاو ابتدائی عہد سے تھا، خواہ وہ شعر گوئی کے قبیل سے ہو یا سخن فہمی ہر دو اعتبار سے انھوں نے کارہائے نماں انجام دیے ہیں۔ایک طرف جہاں انھوں نے ٹیگور سے لے کر کئی لازوال مغربی شعریات کو تراجم کے ذریعے اردو ادب میں منتقل کیا وہیں طبع زاد شاعری اور شعری تنقید سے اسے نیا رنگ وآہنگ بخشا۔

عزیز احمد کا شعری مجموعہ 1943 میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔اس مجموعے کی اشاعت کا زمانہ دوسری جنگ عظیم کی ابتدا کا ہے۔اس میں تین طویل نظمیں'ماہ لقا'، 'عمر خیام' اور'فردوس بر روئے زمین' شامل ہیں۔اس مجموعے کی پہلی نظم'ماہ لقا' ایک عشقیہ نظم ہے، جو خالص مشرقی طرز تحریر کی نمائندہ ہے۔مشرقی شعری روایات میں چاند کو باعتبار حسن ایک خاص مقام حاصل ہے۔چاند کے علاوہ اگرچہ زہرہ ستارہ بھی اپنے اندر بے پناہ حسن اور دلکشی رکھتا ہے، مگر اسے وہ مقام حاصل نہیں جو چاند کو حاصل ہے۔شاعر اپنے محبوب کو یا تو چاند کہتا ہے یا پھر چاند جیسا، غرض محبوب کو ماہ رو سمجھنا شعر وادب کا خاصہ رہا ہے۔عزیز احمد نے بھی حسن وعشق کے اظہار میں اس سے بخوبی کام لیا ہے۔عزیز احمد کی محبوبہ کوئی خیالی پیکر نہیں بلکہ گوشت پوست کی زندہ عورت ہے۔اس نظم کے پہلے حصے میں عزیز احمد نے افلاکی عناصر کی تعبیر وتفہیم میں مشتری، دمدار ستارے، رقاصۂ ملک، اقماد زحل، زمیں چاند اور آفتاب جیسے الفاظ وتلازمے کو اس ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ ایک نئی عشقیہ جہت سامنے آگئی ہے۔اس کے علاوہ عزیز احمد نے اس نظم میں مختلف علامتوں کے ذریعے نظم کی معنویت واثر میں اضافہ کیا ہے۔بالخصوص شمسی نظام کو انھوں نے جس فنکاری سے شعری پیرایۂ اظہار دیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔مزید برآں عزیز احمد نے اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت سے شعری روایت میں ایک نیا باب بھی وا کیا ہے، وہ اوپیرا کی ہیئت ہے۔اوپیرا اولاً سنگ خاندان کے عہد میں تحریر کیا گیا۔ہندوستان میں مشہور بھگت جے دیو نے'اشٹ پدی' غنائیہ گیت کے عنوان سے لکھا۔اردو شاعری میں امانت لکھنوی نے اندر سبھا کے نام سے لکھا، جس میں ایک طلسماتی داستان پیش کی گئی ہے۔اس کے بعد کئی دیگر شاعروں نے اوپیرا لکھا جن میں محمد علی خان میکش، مختار صدیقی، سلام مچھلی شہری، رفعت سروش اور منظور الامین وغیرہ شامل ہیں۔اوپیرا میں صوتی حسن اور نغمگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔اس میں سنگیت اور رقص کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔موسیقی اور سنگیت کے جو مجملہ تین عناصر ہیں مثلاً گلوکاری، نے نوازی اور رقص یہ تینوں عناصر اس میں ایک خاص ربط وتوازن کے ساتھ برتے جاتے ہیں، تاکہ ایک مخصوص غنائیہ لہجہ پیدا ہو سکے۔'عمر خیام' جو کہ ایک منظوم ڈراما ہے 1923 میں پہلی بار شائع ہوا۔تاریخی حیثیت پر مبنی اس نظم میں عمر خیام، نظام الملک اور حسن صباح یہ تین کردار ہیں، ان کرداروں کے باہمی تصادم سے ڈرامے کے نفسیاتی واقعات کا ارتقا ہوتا ہے، اس اوپیرا نظم کا ڈرامائی انداز قاری کی گرفت کو مضبوط کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک منفرد اثر پیدا کرتا ہے۔رباعیوں کے سہارے غنائی آہنگ خاصے کی چیز ثابت ہوئی ہے۔

''فردوس بر روئے زمیں ان کے مجموعہ کلام کی تیسری طویل نظم ہے، بنیادی طور پر اس میں زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کے علاوہ فطرت کے حسین مناظر کی تہذیبی تناظر میں بہترین عکاسی کی گئی ہے۔کشمیر کی دلکش وادیاں اور فطری حسن اس کا خاص موضوع ہے۔اسے عزیز احمد کے عینی مشاہدات کا حسین مرقع بھی کہا جا سکتا ہے۔یہ ان دنوں کی نظم ہے جب انھوں نے کشمیر کا سفر کیا تھا۔ان مدون کلام کے علاوہ عزیز احمد کے اور بھی غیر مدون کلام ہیں۔نظموں میں جیسے حسن، سرگوشیاں، بادل، جستجو، گزارش، واردات، دھوکے، کیوں کر جھلاوں، حوصلے، آجاو شہلا کا پیغام، گھٹا ساون کی، ہمالیہ، شام طرب، شکوہ نظارگی اور اسی طرح غزلیں بھی ہیں، جو ایک نئی فکری وفنی جہات سامنے لاتی ہیں۔اپنے آخری دور کی غزلوں میں عزیز احمد زمانی اور مکانی حقیقتوں کو تاریخ اور تہذیب کے تناظر میں اس طرح خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ وہ پورا عہد اپنے مختلف نشیب وفراز کے ساتھ ایک تاریخی حسیت بن کر ہماری نظروں کے سامنے اس طرح آن کھڑا ہوتا ہے کہ گویا جیتا جاگتا مرقع ہو۔بنیادی طور پر ان شعری تخلیقات میں جہاں حسن وعشق، داخلی وخارجی حادثات وواقعات کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے وہیں مناظر قدرت، تہذیبی وسماجی قدروں اور تقاضوں کی بھرپور ترجمانی بھی ملتی ہے۔ان کی شاعری کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اور دیگر ادبی اصناف کی طرح شاعری پر بھی کامل دسترس اور عبور حاصل تھا۔ان کے شعر کہنے کا

اندازِ تقلیدی اور روایتی کے بجائے خود ساختہ اور جدت لیے ہوئے ہے۔ مضامین وفکر میں جہاں جدت نمایاں ہے وہیں اظہار و بیان اوزبان واسلوب میں بھی ندرت اور سادگی جھلکتی ہے۔ غزل کے چند اشعار پیش ہیں:

جم تو باقی نہ رہا، جام ابھی باقی ہے
جام میں دردِ مئے خام ابھی باقی ہے
اک گلِ تازہ معطر ہے بآغوشِ خزاں
ایک طائر بکفِ دام ابھی باقی ہے

بلاشبہ عزیز احمد کی شاعری ایک خاص شعور و وجدان سے پر ہے جو ہر آئینہ قابل تحسین اور لائق اعتنا ہے۔ ان کا کلام کمیت و کیفیت میں اس درجہ وقیع ہے جسے شعری تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔

ادب میں تہذیب وتاریخ کی پیشکش ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے۔ بالخصوص افسانوی ادب ان جیسے موضوعات کو اپنے دامن میں زیادہ تر سمیٹے ہوئے ہے۔ مگر مستقل ایک صنف کے طور پر بھی بیشتر ادیبوں نے اسے اپنے فکر وفن کا موضوع بنایا ہے۔ عزیز احمد برصغیر میں ہندو پاک کے مخصوص تہذیبی وثقافتی پہلوؤں کو ایک منفرد انداز سے جائزہ لینے والوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اس بابت انھیں نہ صرف یہ کہ ہندو پاک میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ان کی غیر افسانوی تخلیقات برصغیر کی تاریخ وتہذیب کے مطالعے کے باب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ عزیز احمد کے یہاں تاریخی وتہذیبی تناظر کی بحث کوئی نئی نہیں ہے۔ ابتدا سے ہی افسانوی و غیر افسانوی تخلیقات و تصانیف ان جیسے موضوعات سے معمور ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ 1960 کے بعد ان کے یہاں مطالعۂ تاریخ وتہذیب ایک وسیع کینوس میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

تاریخ وتہذیب کے حوالے سے ان کی نگارشات میں 'نسل اور سلطنت: تاریخ و سیاسیات میں نسل کا تصور'، 'ہندوپاک میں اسلامی کلچر'، 'ہندوپاک میں اسلامی جدیدیت'، 'ہندوپاک میں مسلم خود شناسی 1857، 1968' اور 'ہندوستان میں اسلامی دانشوری کی تاریخ' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تہذیب کی پیش کش میں عموماً تین اجزا مثلاً اقدار، طرز زندگی اور اس کے فنون کا مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں برصغیر ہندوپاک کی رنگارنگ و متنوع تہذیب وثقافت کا مطالعہ غیر معمولی حیثیت کا حامل ہے۔ 'برصغیر میں اسلامی کلچر'، 'پاک وہند میں اسلامی جدیدیت' ان کی انگریزی تحریریں ہیں۔ جمیل جالبی جیسے بلند قامت ادیب و تاریخ نویس نے ان کا ترجمہ کیا ہے۔ ان تصانیف ونگارشات سے مسلمانوں کے افکار وآثار، ان کے مثبت ومنفی پہلوؤں کے علاوہ مصلحتوں اور مصالحتوں پر بھی کھل کر روشنی پڑتی ہے۔

عزیز احمد کی نابغۂ روزگار اور ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ ان کی مختلف النوع تصنیفات ونگارشات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ادبی معرکے سر کرنے میں ان کی افتادِ طبع، علم دوست شخصیت اور غیر معمولی تخلیقی ذہانت کے علاوہ تعلیمی فضا وپس منظر کا بھی اہم رول رہا ہے۔ وہ اپنے یہاں کے سیاسی، تہذیبی، ادبی اور معاشرتی حالات وحادثات سے واقف تو تھے ہی، مگر لندن کے تعلیمی سفر نے ان کی فکر ونظر کو وسیع تر کردیا۔ وہاں کی تہذیب وثقافت کو اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں کے ساتھ سمجھنے کا بہترین موقع ملا۔ وہ صرف لندن تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اور دیگر یورپی ممالک کو بھی انھوں نے بہت قریب سے دیکھا۔ عزیز احمد کثیر المطالعہ واقع ہوئے تھے۔ ہر آن نو وارد کتابوں کی تلاش وجستجو میں لگے رہتے تھے۔ کوئی نئی کتاب منظر عام پر آتی تو اپنے دوست واحباب سے اس کا ذکر کرتے خواہ وہ کسی زبان وادب سے متعلق ہوں۔ ادب کے جملہ منظر ناموں پر ان کی

ادب میں تہذیب و تاریخ کی پیشکش ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے۔ بالخصوص افسانوی ادب ان جیسے موضوعات کو اپنے دامن میں زیادہ تر سمیٹے ہوئے ہے۔ مگر مستقل ایک صنف کے طور پر بھی بیشتر ادیبوں نے اسے اپنے فکر وفن کا موضوع بنایا ہے۔ عزیز احمد برصغیر میں ہند و پاک کے مخصوص تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں کو ایک منفرد انداز سے جائزہ لینے والوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اس بابت انہیں نہ صرف یہ کہ ہندو پاک میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

نگاہ رہتی تھی، ان کے متعدد خطوط سے ان کی علم دوستی واضح ہوتی ہے۔ جمیل جالبی کے نام ان کے خطوط کی تحریر ملاحظہ ہو:

"آپ کا بھیجا ہوا تذکرۂ ہمیشہ بہار مل گیا ہے بہت بہت شکریہ۔ لیکن آپ کی اپنی کتاب دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی ابھی تک نہیں ملی.....اگر نصرتی کی گلشن عشق مل سکے تو وہ بھی بھیج دیں.....آپ کی بھیجی ہوئی فیض کی کتاب مل گئی.....فیض کا ریکارڈ دو دفتیوں کے درمیان اچھی طرح پیک کرکے ہوائی ڈاک سے روانہ کرسکیں تو کردیں۔ قرۃ العین کا ناول آخر شب کے ہمسفر شائع ہوا یا نہیں اگر ہو چکا ہو تو اس کی ایک جلد بھجوا دیں"

(عزیز احمد۔ فکر وفن اور شخصیت، جلد اول، ص 144-143)

عزیز احمد مشرقی ادبیات کے علاوہ مغربی فن پاروں پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ معاصر ادیبوں میں شاید ہی کوئی اور ادیب وفن کار ان کے ہم پلّہ ٹھہرے۔ وہ منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، جنھیں شہرت نام ونمود کی تمنا تھی اور نہ انعام واکرام کی لالچ، ان سب سے بے نیاز سچے اور مخلص ادیب تھے۔ معاصرانہ چپقلش سے دور رہتے تھے، ذاتیات میں الجھنا انھیں پسند نہیں تھا۔ حالانکہ وہ اپنے معاصر ادیبوں کی سازش کے شکار بھی ہوئے۔ قیام پاکستان کے دوران ان کے خلاف کئی محاذ آرائیاں بھی ہوئیں۔ ان کے مضامین اور ادبی شہ پاروں کی اشاعت پر روک لگادی گئی، یہی نہیں بلکہ ان پر پیروڈی بھی لکھی گئی مگر انھوں نے کبھی انتقامی لب ولہجہ نہیں اپنایا۔ خاموش طریقے پر مشاطگی گیسوئے اردو ادب کرتے رہے ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے، جو اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہم نے جو سمجھا بلا خوف ستم لکھتے رہے
زندگی کے راز سارے بیش و کم لکھتے رہے
داستان اپنی لکھی روداد اپنوں کی لکھی
مدح وذم سے بچ کے شرح زیر وبم لکھتے رہے
ہم پہ جو گذری سو گذری، در حدیث دیگراں
داستان نوش وعیش و نیش وسم لکھتے رہے

غرض انھیں بین الاقوامی سطح پر وہ غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی کہ شاید ہی کوئی دوسرا شخص اس علوِ شان وعلمی شہرہ میں ان کا ہمسر ہوسکے۔ آپ کے علم وفضل، بصیرت وبصارت اور بالغ نظری کے قائل اہل مغرب بھی ہوئے اور اہل مشرق بھی۔ عزیز احمد کے علم وفضل کے اعتراف میں متعدد ادبی وتعلیمی انجمن و اداروں نے مختلف اعزاز سے نوازا۔ لندن یونیورسٹی نے بطور اعتراف تواریخی تحقیقات ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی، رائل سوسائٹی آف کینیڈا کے فیلو قرار پائے۔ اس کے علاوہ اطالیہ حکومت نے زرّیں وظیفہ کے ساتھ اٹلی کی شہریت بھی عطا کی، اکادی ادبیات آف کینیڈا کے رکن ہوئے۔ ٹورنٹو یونیورسٹی آف کینیڈا کے زیر اہتمام ہر سال عزیز احمد پر خصوصی لیکچرز پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اعزاز وانعام ان کی علمی وادبی خدمات کا کسی حد تک اعتراف ہے۔ نومبر 2014 میں ان کی تاریخ ولادت کو سو سال مکمل ہو چکے ہیں۔ عزیز احمد صدی کے موقعے سے انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کی یہ حقیر و ناکام کوشش کی گئی ہے۔ عزیز احمد کے ان اشعار پر اپنی بات ختم کر رہا ہوں:

کب سے تھے ہم اسیر شب درد و ماہ و سال
قید زماں و بند مکاں سے نکل گئے
تھا جنبش زباں و قلم کا یہ ما حصل
نا گفتہ حرف تھے کہ زباں سے نکل گئے

■

Mohd Motiur Rahman, Room No 260, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 110067

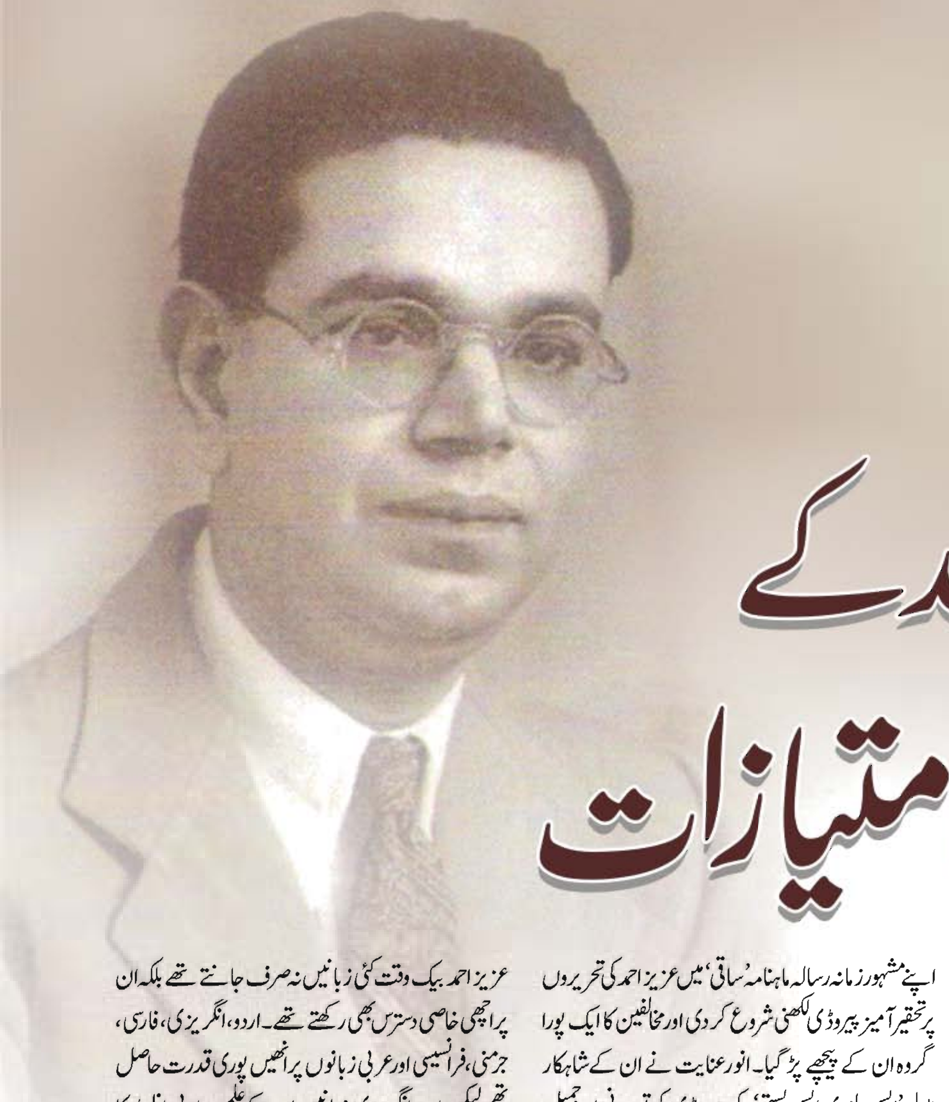

ایم نسیم اعظمی

عزیز احمد کے افسانوی امتیازات

عزیز احمد نے اردو فکشن کو فکر وخیال کے نئے زوایوں، اظہار کے جدید اور منفرد قرینو اور انداز بیان کے اچھوتے طریقوں سے آشنا کیا۔ اگرچہ ان کے ناولوں کے مقابلے میں افسانوں کو اہمیت کم دی گئی پھر بھی ان کے افسانوں کی الگ پہچان بھی ہے اور منفرد امتیازی خصوصیات بھی ہیں جس سے ان کے افسانوں کی منفرد ممتاز ادبی وفنی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے افسانے عام o? ڈگر سے ہٹ کر ہیں اور اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔

عزیز احمد حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے امتیازی نمبروں سے بی اے کرنے کے بعد بابائے اردو مولوع عبدالحق کی سفارش اور سر اکبر حیدری وزیر مالیات حیدرآباد کی عنایتوں سے نظام حیدرآباد کے وظیفہ سے مزید حصول تعلیم کے لیے لندن گئے اور یونیورسٹی آف لندن سے انگریزی ادب سے بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ لندن سے واپسی کے بعد اپنے مادر علمی جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے لکچرر ہوگئے اور 1941 تک درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ 1948 میں وہ حیدرآباد سے پاکستان چلے گئے اور محکمہ اطلاعات وفلم سازی میں معاون ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ 1953 میں ترقی کر کے ڈائرکٹر ہو گئے۔ اس زمانے میں شیخ محمد اکرام، شان الحق حقی، رفیق خاور، انور قریشی اور قرۃ العین حیدر جیسے قلم کار ودانشور بھی اسی محکمہ میں زیر کار تھے۔ اسی زمانے میں شاہد احمد دہلوی نے اپنے مشہور زمانہ رسالہ ماہنامہ 'ساقی' میں عزیز احمد کی تحریروں پر تحقیر آمیز پیروڈی لکھنی شروع کر دی اور مخالفین کا ایک پورا گروہ ان کے پیچھے پڑ گیا۔ انور عنایت نے ان کے شاہکار ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' کی پیروڈی کی تو عدنی اور جمیل الدین عالی نے بھی ان کے خلاف قلم اٹھایا اور ساقی، ادب لطیف، نقوش اور سویرا جیسے رسالوں نے عزیز احمد کے ساتھ ساتھ محمد حسن عسکری اور قرۃ العین حیدر کو رجعت پسند قلم کار قرار دے کر مذکورہ رسائل میں ان کی تخلیقات و نگارشات کی اشاعت پر پابندی لگادی۔ جس سے کچھ دنوں کے لیے عزیز احمد برصغیر کے ادبی منظرنامے سے بظاہر غائب ہوگئے۔ لیکن اچانک اپنی معرکتہ الآرا تصنیف 'ترقی پسند ادب' کی اشاعت سے اس زمانے کے ادبی منظرنامے پر ایسے نمایاں ہوئے کہ پھر انھیں کسی بھی طرح نظر انداز کرنا ناممکن سا ہوگیا۔

عزیز احمد 1957 میں کراچی (پاکستان) سے لندن چلے گئے اور لندن یونیورسٹی کے اورینٹل اور افریقن اسٹڈیز اسکول میں استاد ہوگئے اور 1962 تک اس سے وابستہ رہے۔ 1962 میں کناڈا کی ٹورنٹو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنائے گئے اور ترقی کر کے 1968 میں باقاعدہ پروفیسر ہوگئے اور تاحیات اسی عہدے پر فائز رہے۔ 1972 میں یونیورسٹی آف لندن نے انھیں ڈی لٹ (D.litt.) کی اعزازی ڈگری سے سرفراز بھی کیا اور پھر رائل سوسائٹی آف کناڈا کے فیلو کے اعزاز سے نوازے گئے۔

عزیز احمد بیک وقت کئی زبانیں نہ صرف جانتے تھے بلکہ ان پر اچھی خاصی دسترس بھی رکھتے تھے۔ اردو، انگریزی، فارسی، جرمنی، فرانسیسی اور عربی زبانوں پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی لیکن اردو انگریزی زبانیں ان کے علمی و ادبی اظہار کا خاص ذریعہ تھیں۔ 16 دسمبر 1978 میں ٹورنیٹو (کناڈا) میں ہی 64 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کیا تھا۔

عزیز احمد ایک فطری ادیب، قلم کار اور فنکار تھے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں جب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بی اے کے طالب علم تھے 'کالج کے دن' کے عنوان سے اپنا ڈرامہ اسٹیج کیا تھا۔

اردو ادب میں عزیز احمد کی شخصیت بڑی متنوع اور گوناگوں ہے۔ وہ بیک وقت مترجم، ناول نویس، شاعر، نقاد، ماہر اقبالیات واسلامیات اور افسانہ نگار کی حیثیت سے بطور خاص جانے جاتے ہیں۔ ان کے شاہکار ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' کا معروف یورپی اردو اسکالر پروفیسر رالف رسل نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو 1972 میں یونیسکو سے شائع ہوا اور عزیز احمد عالمی پیمانے پر معروف اردو فکشن نگار، ماہر اقبالیات و اسلامیات اور معروف اردو اسکالر کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہوگئے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ عزیز احمد بنیادی طور پر ناول نویس ہیں لیکن انھوں نے بہت سے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'رقص ناتمام' اور 'بے کار دن بے

کاررا تیں' کے نام سے شائع بھی ہوئے ہیں اگرچہ ان دونوں مجموعوں میں کل اٹھارہ افسانے ہی شامل ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ بھی ان کے تقریباً تین درجن مزید ایسے افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں شامل تو نہیں ہیں مگر ہند و پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح عزیز احمد کا افسانوی سرمایہ بہت زیادہ تو نہیں مگر اتنا کم بھی نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانے معیار اور کمیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اور اپنی انفرادیت کے اعتبار سے بھی اردو کے افسانوی ادبی سرمایہ کے وقیع حصے کی بھی حیثیت کے حامل ہیں اس لیے انھیں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

'رقصِ ناتمام' کے بیشتر افسانے آزادی سے قبل کے ریاست حیدرآباد کے خوش حال گھرانوں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں جن میں گھریلوں خاداماؤں کے ساتھ نوابین اور امرا کے معاشقوں کو افسانوی پیکروں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ، تہذیب، اساطیر اور عشق و محبت عزیز احمد کے افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ زریں تاج، خدنگ جستہ، اور جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں روایت، اساطیر اور تاریخ کی ہم آہنگی سے کہانی گڑھنے کی کامیاب فنکارانہ کوشش کی گئی ہے۔ مدن سینا اور صدیاں، آب حیات، تصور شیخ، تیری دلبری کا بھرم اور 'مثلث' بھی اردو میں اپنی نوعیت کے بالکل اچھوتے اور منفرد افسانے ہیں۔ 'اور بستی نہیں یہ' ایک ایسا دلکش افسانہ ہے جس میں جنوبی ہند کے دو جرنلسٹوں کی ملک کی آزادی سے پہلے کی سیر و تفریح پیش کی گئی ہے اور اس سیر و تفریح میں ہر طبقے کی آوارہ اور عیاش عورتوں کی زیاتیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی طرح 'جادو کا پہاڑ' ان کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مسوری جیسے تفریحی مقام پر امیر طبقے کی عیش پرستانہ اور رومانی سیر و تفریح کو افسانوی رنگ و آہنگ میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ستا پیسہ، زون، زرخرید، کوکب، رائیگاں تبسم، نن لن، جھوٹا خواب، کالی رات، پاشا پالن اور 'پاپوش' بھی عزیز احمد کے قابل ذکر افسانے ہیں۔

عزیز احمد کے افسانوں کی سب سے اہم اور قابل ذکر چیز جو ان کے افسانوں کو امتیازی اور انفرادیت کا حامل بناتی ہے وہ اردو افسانوی روایت سے انحراف اور جدید علوم و فنون، ماحول و معاشرت، غیر مانوس علاقوں کی فضا، منظر کشی، غیر ملکی حالات و ماحول اور بالکل نئی اور ان دیکھی فضا میں افسانہ تخلیق کرنے کا ہنر اور اپنی بالکل الگ اور اچھوتی راہ نکالنے کی کوشش میں فنی کامیابی کا حصول ہے۔ ہندوستان کے بدلتے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کی ترجمانی۔ مغربی علوم و فنون کی تازہ ہواؤں، نئی ادبی اور فکری لہروں کا ارتعاش اور مشرقی اور مغربی ثقافتی زندگی کی عکاسی بھی ہے۔ عزیز احمد کے بعض افسانے تو ایسے ہیں جن کی فضا، ماحول، مناظر، واقعات اور کہانی کا اصل محور تو خالص مغربی ہے اور صرف افسانے کا کردار یا ہیرو مشرقی ہے۔ ان کے اس قسم کے افسانوں میں موشکا، رائیگاں تبسم، رومتہ الکبریٰ کی ایک شام، خطرناک پگڈنڈی اور 'دیا سلائی' کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان افسانوں میں مغربی تہذیب و تمدن اور جدید علوم و فنون کے مختلف

رنگوں، رویوں اور شکلوں کی جس انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے اس سے اردو قاری اپنے مشرقی ملک میں رہتے ہوئے مغربی ملکوں کی سیاحت و تفریح و سیر سپاٹے کے احساسات سے لطف اندوز ہونے اور بالکل نئی اور اجنبی افسانوی فضا میں اپنے آپ کو موجود محسوس کر کے جن تاثرات سے ہم کنار ہوتا ہے وہ اردو کے کسی اور فسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ خصوصاً برصغیر کے لیے انتہائی پر آشوب رہا ہے۔ تحریک آزادی کا نقطۂ عروج، دو قومی نظریے، مذہب کی بنیاد پر مسائل کے تجزیے، مذہبی جنون و فرقہ پرستی، آپسی عدم اعتمادی، ملک کی تقسیم، قتل و غارت گری کی گرم بازاری، تبدیلی آبادی و ہجرت، اخلاق و رواداری کا فقدان اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت، بحرانی سیاسی افکار و نظریات، مذہب و روحانیت کی عدم معنویت اور پورے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات میں انسانی خون کی ارزانی، قتل و خون اور جلتے مکانات روح فرسا مناظر سے دوسرے حساس لوگوں اور ادیبوں اور شاعروں کی طرح عزیز احمد بھی متاثر ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنے ہم عصر دیگر افسانہ نگاروں کی طرح ان حالات و واقعات اور مناظر کو اپنے افسانوں کا براہ راست موضوع نہ بنا کر ان کے پس منظر میں افسانہ تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے اور ان سارے ناگفتہ بہ حالات کا عوام کے بجائے قائدین کو ذمے دار ٹھہرانے کی کوشش کی ہے اور ایسا کرتے وقت ان کے لب و لہجے میں جو کاٹ اور نشتریت در آئی ہے اس نے ان افسانوں کی تاثیر میں شدت پیدا کر دی ہے۔ کالی رات، قاتل کبیر، میرا دشمن بھائی اور 'نفرت کیوں تھی؟' وغیرہ افسانوں میں جو سوالیہ انداز اپنایا ہے اس سے افسانوں کا قاری سنجیدگی سے غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پاتا ہے۔

ہندوستان کی قدیم، وسطی اور جدید تاریخ و فلسفہ، عالمی اور اسلامی تاریخ و تمدن اور معاشرت جدید سائنسی اور تکنیکی علوم و فنون، مشرقی اور مغربی شعر و ادب اور سیاست پر عزیز احمد کا وسیع مطالعہ بھی ہے اور عبور بھی۔ دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف جغرافیائی پس منظر رکھنے والے مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی زندگی سے متعلق تخلیق کیے گئے افسانوں میں ان کی نفسیات پر ان کی نظر گہری بھی ہوتی ہے اور باریک بھی۔ انھوں نے برصغیر کے علاوہ مغربی ممالک کے رہن سہن، طرز بود و باش، مزاج و معیار اور نفسیات و طبیعت کا جس انداز سے اپنے افسانوں میں اپنے علمی تجربات و مشاہدات کے طور پر پیش کیا ہے اس سے ان کی کہانیوں اور کہانی کے کرداروں میں نئے انداز کا حقیقت پسندانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ عموماً چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں سے جو بظاہر غیر اہم ہوتی ہیں اپنے افسانوں میں حیرت انگیزی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا تقریباً ہر افسانہ اپنے عہد کے کسی نہ کسی اہم واقعے، حادثے یا معاملے سے بھی عبارت ہوتا ہے اور یہ واقعہ، حادثہ اور معاملہ ان کے افسانوں میں کہیں پس منظر تو کہیں ایسا حوالہ بن جاتا ہے جس سے ان کا افسانہ افسانہ ہوتے ہوئے اپنے دور کے حالات و واقعات اور حادثات و معاملات کی بہترین تفسیر و تعبیر بھی بن جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے جس عہد سے عزیز احمد کا تعلق رہا ہے۔ دو عالمی جنگوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ عزیز احمد کے زیادہ تر افسانے دوسری جنگ عظیم کے دوران

لکھے گئے ہیں اس لیے ان افسانوں میں جنگ کا تذکرہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ جنگ کے واقعات کو کہیں افسانے کے پس منظر میں پیش کرتے ہیں تو کہیں اشاروں اور کنایوں میں ان کی عکاسی کر کے گزر جاتے ہیں جس کی سب سے بہترین مثال ان کے افسانے 'زریں تاج' اور 'بے کار دن بے کار راتیں' میں پائی جاتی ہے۔ وہ عموماً اپنے افسانوں کا آغاز غیر رسمی طور پر اچانک اور غیر متوقع یا ڈرامائی انداز میں کرتے ہیں ان کے افسانوی موضوعات و مواد میں بھی جدت و انفرادیت پائی جاتی ہے اور انداز پیش کش میں بھی۔ وہ کبھی کبھی مختلف داستانوں اور مختلف ادوار کو بھی اپنے افسانوں میں اس فنکاری کے ساتھ ایک لڑی میں پرو کر مرکب بنا دیتے ہیں کہ زمان و مکان کی تمام تر وسعتیں سمٹ کر ایک ہی جگہ مرکوز ہو جاتی ہیں اور یہ ان کا ایسا مرکب اور نیا تکنیکی تجربہ ہے جو ان کے افسانوں کی امتیازی خصوصیات میں اضافے کا باعث بن گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عشق و محبت، حسن و رعنائی اور رنگینی و جمال افسانوں کی بنیادی شناخت رہے ہیں۔ عزیز احمد کے افسانوں میں ان کی خاص کارفرمائی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا کافی دل پسند اور دل پذیر ہوتی ہے۔ وہ کہیں فطری دلکشی کی تصویر کشی سے تو کہیں کرداروں کی حسن پرستی سے اپنے افسانوں کی رومانی اور جمالیاتی فضا تشکیل کرتے ہیں جو جنس پرستی کی سرحدوں سے قریب ہوتی ہے۔ ان کے افسانوی کردار بھی اکثر و بیشتر عاشق مزاج، حسن پرست، نظر باز اور دل پھینک قسم کے ہوتے ہیں۔ جن میں مغرب زدگی، عورت پرستی اور جنسی آوارہ گردی بھی ہوتی ہے۔ ان کے کردار عموماً عام قسم کے لوگ نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی ان کے افسانوں کا کردار خود قاری بھی بن جاتا ہے۔ ان کے کردار عموماً ہندوستانی بلکہ حیدر آبادی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو اپنی مرضی کا غلام نہیں بننے دیتے اور نہ ہی اپنے مطابق چلانے پر ہی مجبور کرتے ہیں بلکہ انھیں فطری طور پر چلنے پھرنے، آگے بڑھنے اور حرکت و عمل کرنے کے مواقع فراہم کر دیتے ہیں اور انھیں اپنے مزاج اور میلان کے مطابق نشو و نما پانے کی گنجائش پیدا کر دیتے ہیں جس سے کرداروں میں فطری حرکت و فعالیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی کردار نگاری چند مخصوص افراد کے بجائے پورے معاشرے یا ایک پوری نسل کی کردار نگاری بن جاتی ہے اور محض ظاہری نہ ہو کر باطنی معنویت سے بھی ہم کنار ہو جاتی ہے اور ایسی کردار نگاری اسی وقت ممکن ہے جب افسانہ نگار میں اعلا پائے کی معاشرتی بصیرت و بصارت، تاریخی و تمدنی عرفان و ادراک اور تخلیقی و فنی اور نفسیاتی مہارت و قدرت ہو اور اپنے کسی بھی تخلیق کردہ کردار کو کائنات بنا دینے کی غیر معمولی صلاحیت و فنکاری ہو اور عزیز احمد کا یہی طرۂ امتیاز بھی ہے۔

عزیز احمد کے افسانوں میں جو چیز سب سے زیادہ قاری کو متاثر کرتی ہے اور افسانہ پڑھتے وقت قاری میں ایک قسم کے اضطراب اور تجسس کی کیفیت کو برقرار رکھتی ہے وہ در اصل ان کی منظر کشی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے مناظر عموماً پس منظر کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ افسانوی معنویت سے ہم آہنگ ہو کر ان کی منظر کشی بھی ان کی افسانہ

"عزیز احمد شہری زندگی کے ترجمان اور نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے عالمی شہروں کے پس منظر میں کہانیاں تخلیق کر کے اردو افسانوں کے کینوس کو کافی وسیع کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں حیدر آباد، ممبئی، دہلی، مسوری، لندن، پیرس اور روم جیسے عالمی تہذیبی شہروں کی تصویریں پائی جاتی ہیں وہ اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں تقریباً نایاب ہیں۔"

نگاری کا امتیازی وصف بن جاتی ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان بھی کافی معیاری اور شستہ ہوتی ہے۔ ان کے جملے بے پناہ بلیغ ہوتے ہیں اور خیالات کو نہایت جامع انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک مخصوص قسم کی ارتکاز فکر کی بھی کارفرمائی ہوتی۔ انھیں حیدر آبادی زبان اور جملوں، فقروں کے برمحل استعمال میں بھی مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں ''ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد'' کی لسانی طلسماتی کیفیت بھی ہوتی ہے اور ظاہری حسن و دلکشی اور معنوی تہہ داری کے ساتھ ساتھ موزوں تشبیہات، دل نشیں استعارات، قابل فہم تلمیحات اور اشاروں کنایوں کا بھی حسب ضرورت استعمال نے ان کی افسانوی زبان میں تاثیر اور افسانے میں ترسیلی صفت، دلکشی اور دل آویزی بھی پیدا کر دی ہے۔

عزیز احمد شہری زندگی کے ترجمان اور نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے عالمی شہروں کے پس منظر میں کہانیاں تخلیق کر کے اردو افسانوں کے کینوس کو کافی وسیع کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں حیدر آباد، ممبئی، دہلی، مسوری، لندن، پیرس اور روم جیسے عالمی تہذیبی شہروں کی تصویریں پائی جاتی ہیں وہ اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں تقریباً نایاب ہیں۔ اردو افسانے میں عام طور سے ہندوستانی یا پاکستانی دیہاتوں، گاؤں اور چھوٹے قصبات کی بھرمار ہوتی ہے جبکہ عزیز احمد کے افسانوں کا اصل محور دنیا کے بڑے شہر اور ان کی چکا چوند اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ظاہری زندگی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں ان کا رویہ اگرچہ جاگیردانہ اشرافیہ کی طرف کافی ترقی پسندانہ ہوتا ہے پھر بھی عام لوگوں اور غریبوں کی حقیقی زندگی کی تصویر کشی کی کمی پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک خاص قسم کی مغرب فریفتگی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عموماً خوش حال گھرانوں کے مرد عورت کے تعلقات کی مختلف تعبیروں کی نمائندگی پائی جاتی ہے جس میں جنس کو اساسی اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں میں عورت شکار کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ عزیز احمد کے افسانوں میں ایک بالکل نئی اور عجیب و غریب قسم کی تکنیک پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب ان کے افسانوی مواد اور تکنک کے دل فریب تجربے سے وجود پذیر ہوتا۔ ان کے افسانہ 'زریں تاج' میں زمانی تسلسل کی تکنک اور شعور کی رو سے کام لیا گیا ہے۔ 'رومتہ الکبریٰ کی ایک شام' میں بھی شعور کی رو کی تکنک اور تاریخ و قصہ کے امتزاج سے افسانوی امتیاز کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے 'تصور شیخ' میں روحانیت کے ماحول میں جنس کی کمی زریں لہروں کو اس گہری بصیرت سے پیش کیا گیا ہے کہ افسانوی اسلوب میں غیر معمولی کشش پیدا ہو گئی ہے۔ 'مدن، سینا اور صدیاں' میں داستانوی اسلوب سے کام لیا گیا ہے تو 'آب حیات' میں اساطیری اسلوب نمایاں ہے۔

عزیز احمد در حقیقت اردو کے ایک منفرد، ممتاز اور غیر معمولی افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانوی نثر کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دہلی میں ایک قسم ان عورتوں کی ہے جن کے میاں ان کو اپنے وطن یعنی باہر قصبات سے ساتھ لائے ہیں۔ وہ ابھی دہلی کی زندگی کی عادی نہیں ہوئی ہیں۔ میاں کی تنخواہ ڈیڑھ سو یا دو سو ہوتی ہے۔ جب میاں دفتر کو جاتے ہیں تو یہ عورتیں جن کی نظریں نئی دہلی کی نظر سے خیرہ ہیں، خرید و فروخت کرتی پھرتی ہیں اور کبھی کبھی ان کی اپنی خرید فروخت بھی ہو جاتی ہے۔''

(اور بستی نہیں یہ)

Dr. M. Naseem Azmi, Doman Pura (Ksari),
Mau Nath Bhnjan-275101 (U.P)

ولادت صدی

عزیز احمد

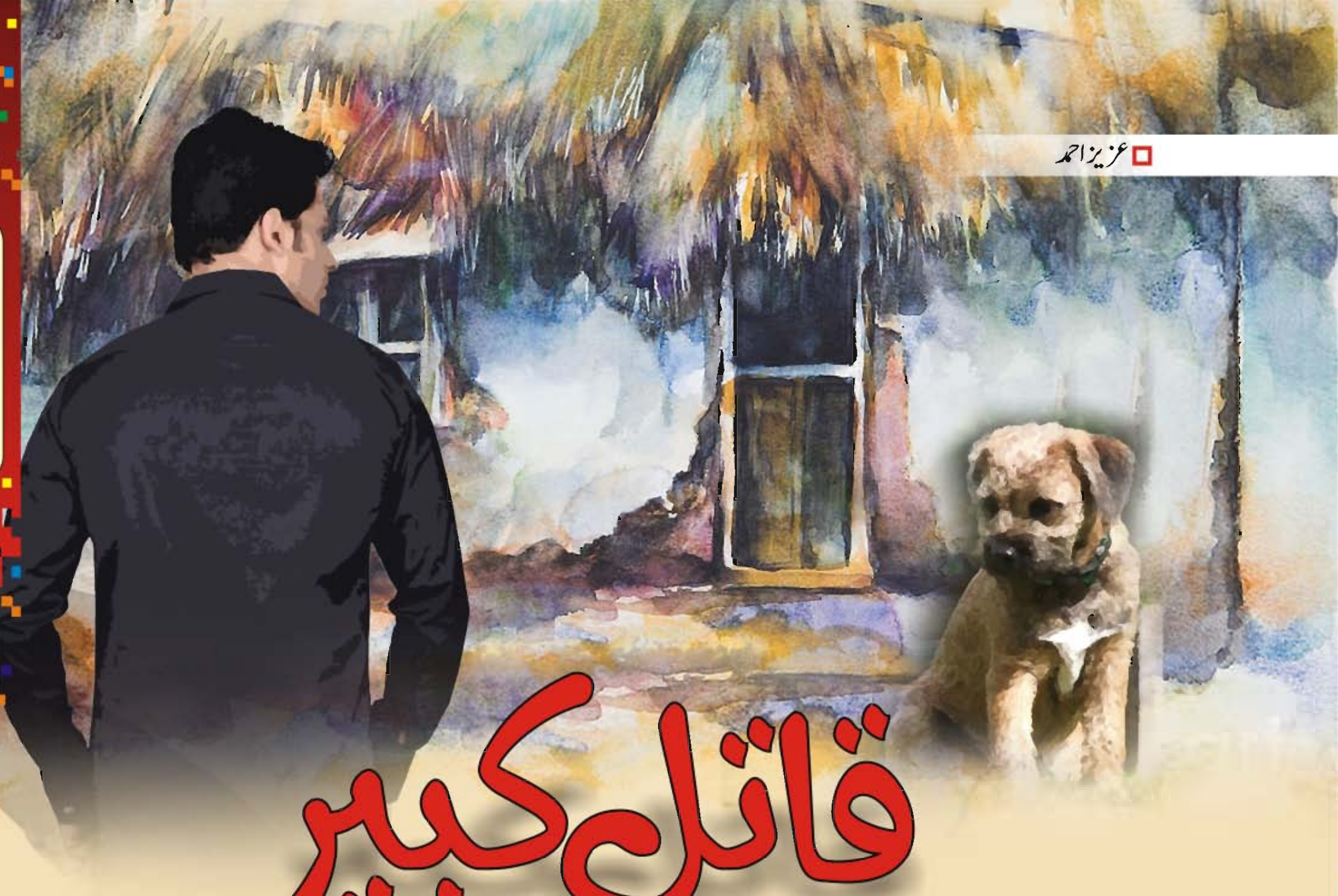

قاتل کبیر

اپنے کچے مکان کے دروازے کا قفل کھولنے سے پہلے کبیر نے کتے کے پلے کی طرف دیکھا جواب بھی اسی جگہ تھا۔ جہاں صبح کچہری جانے سے پہلے، اس نے اس کتے کے پلے پر اپنی چھڑی سے زور کا وار کیا۔ چھڑی کی نوک پر لوہا لگا ہوا تھا۔ کبیر کو یقین تھا کہ کتے کا پلا مر گیا ہوگا لیکن اگر مر گیا ہوتا تو میونسپلٹی والے اسے اٹھالے جاتے۔ وہ ابھی تک... شام کے پانچ بجے تو وہ عدالت کے برخاست ہونے کے بعد گھر روانہ ہوا تھا... وہیں کیسے پڑا ہوتا۔ کبیر نے موری کے قریب آکے کتے کے پلے کو دیکھا جس کی آنکھیں چڑھی ہوئیں تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا اور ایک کالا سا چیونٹا اس کی ناک کے نتھنے سے نکلا اور اس کے سفید جسم پر رینگنے لگا۔ جس پر بڑے بڑے کالے کالے دھبے تھے۔ ارے خدا اسم ہے بھگوان یہ تو مر گیا، کبیر نے اپنے آپ سے کہا۔ با مسمی ۔ کبیر خدا کو دونوں ناموں سے یاد کرتا تھا۔

دفعتاً کبیر نے محسوس کیا کہ ساری عمر میں پہلی مرتبہ ”اب جبکہ اس کی عمر اچھی خاصی ہو چکی تھی وہ قتل کا مرتکب ہوا ہے کتے کے پلے ہی کا سہی مگر قتل... یہ سامنے جو سفید جسم پڑا تھا جس کی کھال اجلی تھی اور جس پر کالے دھبے تھے۔ آج صبح اس میں جان تھی۔ اس نے کتے کے پلے کے لمبوترے جبڑے کی طرف دیکھا جو انسان کے جبڑے سے اس قدر مختلف تھا اور آج کل تو لوگ انسان کے بچوں کو نیزوں اور سنگینوں سے چھید رہے تھے کڑاہی میں تل رہے تھے۔

میونسپلٹی کا صبح والا چھکڑا کتے کے پلے کو اٹھا نہیں لے گیا نہ سہی، شام والا چھکڑا اٹھالے جائے گا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ کبیر کا عدالت والا کوٹ میلا میلا سا تھا۔ اس کا پاجامہ صاف تھا لیکن بڑے موٹے جھوٹے سفید کھادی کے کپڑے کا۔ وکیل درجہ سوم کا یونیفارم اور اس یونیفارم میں وہ گزشتہ اٹھائیس سال سے معمولی مجسٹریٹوں کو سرکار سرکار کہہ کر مقدمے چلاتا رہا اور زیادہ تر ہارتا رہا۔ کبھی اسے اتنا نصیب نہ ہوا کہ کچھ بچا سکے۔ کبھی زیادہ فیس مل گئی تو پراٹھے لوریاں کھالیں۔ کبھی چبینہ پر گزر ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ امید کرتا رہا کہ ایک دن اس کی آمدنی اتنی ہو جائے گی کہ وہ شادی بیاہ کر کے گھر بسا پائے گا مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ محلے والوں کے بچے اسے بہت پسند تھے۔ سررشتہ دار صاحب کا لڑکا ندیم، ہری رام پنت کا چھوٹا سا لڑکا گنپت، یہ کبھی کبھی بن بلائے مہمانوں کی طرح اس کچے مکان کے دروازے پر لٹکا ہوا ٹاٹ کا پھٹا پردہ اٹھا کر اندر آجاتے اور وہ ریوڑیاں، گڑ بیٹھے چنے اور جو کچھ ہوتا چینی مٹی کے برتن سے نکال کے کھانے کے لیے دے دیتا۔

نہ سررشتہ دار صاحب اور نہ ہری رام پنت کو پتہ تھا کہ کبیر کا مذہب کیا ہے؟ وہ ایک گاؤں ’خان پور‘ سے آیا تھا۔ جو شہر سے اکیس میل دور تھا۔ بہت تحقیق کے بعد سررشتہ دار صاحب کو پولیس کے ایک انسپکٹر نے بتایا کہ اس کا باپ خان پور میں ایک بنیے کے یہاں چوکیداری کرتا تھا اور اس نے ایک نیچ ذات کی لڑکی جس سے وہ پیدا تھا۔ باپ نے اس کا نام شیخ سعید رکھا تھا۔ ماں اس ڈر کے مارے کہ کوئی چڑیل اس کو کھا نہ جائے اسے ڈونگر کہا کرتی تھی لیکن یہ جب خان پور سے ایک انگریز صاحب کے پاس نوکر ہو کے شہر آیا، جو خان پور مرغابیوں کا شکار کھیلنے گئے تھے اور جب ذرا پڑھ کر کے اس نے کبیر کے دوہوں پر سر دھننا سیکھا تو اس نے اپنا نام شیخ سعید اور ڈونگر سے بدل کر کبیر رکھ لیا۔ صاحب کے زیر سایہ اس نے اردو مڈل تک تعلیم پائی۔ وکالت درجہ سوم کا امتحان پاس کیا اور پھر صاحب کی ملازمت چھوڑ دی۔

اس کے ہمسایوں نے کبھی اس کو کسی سے لڑتے بھڑتے نہ دیکھا تھا۔ وہ بات ہی بہت کم کرتا تھا۔ صبح کے دس بجے تک موکلوں سے سر مغزی کرتا تھا اور پھر عدالت کو چلا جاتا تھا۔ جہاں سے پانچ بجے واپس آ کے کھانا کھاتا۔ بشرطیکہ گھر میں پکانے کے لیے جوار یا گیہوں کا آٹا کچھ ہوتا اور پھر شام تک یا لیٹ کے ستاتا، یا پھر کبیر اردو کے صوفی شاعروں کے کلام گا گا کے پڑھتا اور پھر لالٹین جلا کے وکالت ناموں، مثلوں، عرضی دعوؤں اور مانگے تانگے کی قانون کی کتابوں میں

غرق ہوجاتا۔ کبھی کبھی شام کو سررشتہ دار صاحب اسے گھر سے باہر دیکھ کر بلا لیتے اجی او وکیل صاحب! اجی او کبیر صاحب ''اور وہ بڑے انکسار سے سررشتہ دار صاحب کو سلام کرکے ان کے گھر کے باہر کے چبوترے پر جو سب سے زیادہ شکستہ مونڈھا ہوتا اس پر بیٹھ کے دونوں ہاتھ باندھ لیتا۔ ندیم اس کی گود میں اچک کے بیٹھ جاتا اور وہ خود بڑی شائستگی سے سررشتہ دار صاحب کے سوالات کا جواب دیتا۔ سرکار! یہ وکالت پیشہ ہی ایسا ہے کہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ کیا غرض کروں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جو سوکھی روٹی کھاتا ہوں وہ بھی حلال کی نہیں۔ حرام کی ہے۔''

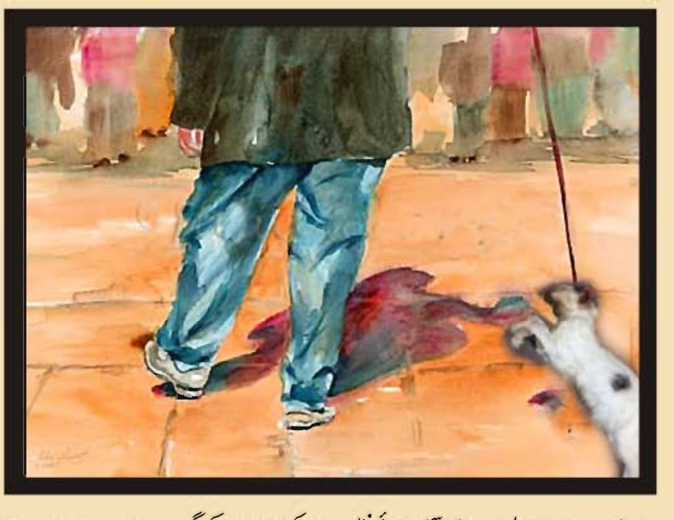

کبیر کا ایسا نیک شریف، مرنجاں مرنج، صوفی منش آدمی، یکلخت قاتل کیسے ہوگیا؟ اس کی کئی وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ دشمن کا قبضہ اس شہر پر ہوچکا تھا جس کے نواح میں کچے گھروں کا وہ محلہ بھی تھا جس میں وہ رہتا تھا اور جس میں اس نے دیکھا کہ سررشتہ دار صاحب اور ہری رام پنت ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے ہیں۔ ندیم اور گنپت کو اس کے دیکھتے دیکھتے نیزوں اور سنگینوں نے چھید دیا تھا اور اب کوئی بچہ پھٹے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کے اسے دیکھ کر کھلکھلا کر نہ ہنستا۔ جنونی ہجوم نعرے بلند کرتے آتے۔ سررشتہ دار اور ہری رام پنت اور محلے کے اور بہت سے باسیوں کے گھر خالی پڑے تھے۔ سامان سب لٹ چکا تھا۔ وہ اپنے مکان میں اسی طرح رہتا حالانکہ موکلوں نے دو مہینے سے اس کے گھر کا رخ نہ کیا تھا۔ مشتعل مجمع اس کے گھر میں کچھ ہوتا تو لوٹتے۔ وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ رہ گیا وہ خود، تو اسے دیکھ کے کوئی کہتا ''پاگل ہے'' کوئی کہتا ''جوگی ہے'' اس کے مذہب ہی کا کچھ ٹھیک پتہ نہ تھا۔ اس کے خون سے کون اپنا برچھا یا اپنی تلوار ناپاک کرتا۔

یہاں تک کہ طوفان گزر گیا۔ یکے بعد دیگرے ہری رام پنت اور سررشتہ دار صاحب اور دوسرے محلے والے پھر سے اپنے اپنے گھروں میں آ بسے۔ لیکن کچھ عورتیں غائب ہوچکی تھیں۔ کچھ بچے چھد چکے تھے اور محلے پر ایک سوگواری کیفیت طاری تھی اور کبیر کو وہ بچے بار بار یاد آتے تھے جو اس کے دروازے کے ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ اٹھا کے جھانکتے تھے اُر کہکاری مار کے ہنستے تھے۔

ایک وجہ اور تھی۔ اسے ہمیشہ سے کتوں سے نفرت رہی تھی۔ خان پور میں ایک دن وہ اپنے باپ کو جوار کی روٹی، مونگ پھلی کی چٹنی اور لوٹا بھر پانی دینے کے لیے بنیے کی دکان پر گیا اور جب اس کا باپ کھا چکا، پانی پی چکا اور ڈکار لے کر پیٹ پر ہاتھ پھیر چکا تو کبیر نے خالی برتن اٹھائے اور گھر کی راہ لی۔ پولیس پٹیل رانا کے مکان کے سامنے سے دو کتے کبیر پر جھپٹے۔ اس زمانے میں وہ مشکل سے دس برس کا ہوگا اور وہ چیختا اور ہانپتا ہوا بھاگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کتے رانا کے بیٹے نائک نے اس پر چھوڑے ہیں۔ مگر اس وقت اسے اپنی جان کی فکر تھی اور کتے بھونکتے جاتے تھے اور اسے دوڑا رہے تھے۔ ڈاک خانے کے سامنے رام سنگھ نے دو بڑے بڑے پتھر مار کر کتوں کو بھگا دیا اور روتا اور تھر تھر کانپتا ہوا کبیر زمین پر گر پڑا اور مٹی کے برتن چکنا چور ہوگئے۔

اس کے بعد سے کبیر کی کبھی کتوں سے نہیں بنی۔ جس گلی میں وہ کسی کتے کو کھڑا بیٹھا۔ یہاں تک کہ آنکھ موندے لیٹا دیکھتا۔ وہ گلی کے اس پار سے اس پار پہنچ جاتا اور کتے کی طرف بڑھی سہمی ہوئی نظر سے دیکھتا جاتا۔ کچے گھروندوں کے محلے کے اس پار کھیت تھے جن میں پگڈنڈیاں تھیں۔ لاکھ دیمک خوردہ سہی لیکن وہاں ہوا بڑی فرحت بخش تھی۔ پھر بھی کبھی کبیر کی ہمت نہیں ہوئی کہ اندھیرے منہ ان کھیتوں میں سیر کرنے نکل جائے کیونکہ جا بجا چوڑے چوڑے کانوں والے کالے، چتکبرے، مٹیالے اور زرد کتے اس کی صورت دیکھتے ہی بھونکنے لگتے۔

اور پھر ایک دن یہ ہوا کہ اس نے دو چھوٹے چھوٹے اجنبیوں کو ٹاٹ کے اس پھٹے ہوئے پردے سے جھانکتے دیکھا، جس سے پہلے ندیم اور گنپت جھانکا کرتے تھے۔ یہ دونوں زرد رنگ کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے کتے کے پلے تھے۔ کبیر اس وقت صحن میں بیٹھا دانت مانجھ رہا تھا۔ ان کتوں کے بچوں کو انسان کے مردہ بچوں کی طرح جھانکتے دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سردی کی سی ایک لہر دوڑ گئی۔ بلا کسی ارادے کے، بلا کچھ سوچے سمجھے اس نے ایک پتھر اٹھایا اور دونوں اجنبی کتوں کے پلے بھاگ گئے۔ وہ پھر بیٹھ کے دانت مانجھنے لگا۔

اس روز شام کو جب وہ کچہری سے گھر واپس آیا تو بڑا تھکا ہوا تھا۔ مقدمے یوں بھی بہت کم ملتے تھے اور کوئی تیس چالیس روپے سے زیادہ فیس کا نہیں۔ لیکن آج تو وہ مقدمہ ہار کے آیا تھا حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس کا موکل حق پر تھا۔ گھر آ کے اس نے جوار کی روٹی تھوپی۔ بھنڈیاں جو وہ کچہری سے آتے آتے خرید کے رومال میں باندھ لایا تھا۔ سرخ مرچ اور زیرہ ڈال کے تلیں اور کھانا حلق سے اتار کے زور سے ڈکار لی۔ منہ دھویا اور نظیر کا صوفیانہ کلام جھوم جھوم کے پڑھنے لگا۔ لیکن آج اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ بان کے پلنگ پر تکیہ دہرا کرکے اس نے سرہانے رکھا اور کمر سیدھی کرنے لیٹ گیا۔

اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ لیکن سویا نہیں تھا۔ اس وقت سونے سے سر میں درد ہوجایا کرتا تھا وہ ادھر اُدھر کی باتیں سوچ رہا تھا۔ اس کی زندگی اب بھی ویسی ہی گزر رہی تھی جیسے اٹھائیں برس سے گزرتی آئی تھی لیکن اب تھکن زیادہ تھی۔ اتنی کہ برداشت نہیں ہو پاتی تھی۔

وہ دفعتاً چونک پڑا۔ پیں پیں کی آواز آرہی تھی اور بہت قریب سے آرہی تھی۔ اس نے اپنی چارپائی کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ایک بیمار کمزور سا کتے کا پلا چارپائی کے ایک پائے سے لگا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کا جسم سفید تھا اور اس سفیدی پر کہیں کہیں بڑے بڑے کالے کالے دھبے تھے۔ یہ وہی کتے کا پلا تھا جس کا اس قصے کے شروع میں آپ سے تعارف ہوچکا ہے۔ اس کو اپنی چارپائی کے نیچے اس آرام سے بیٹھا دیکھ کر کبیر اپنا سفید خشخشی بالوں والا سر کھجانے لگا۔ پہلے تو اس نے چاہا کہ لات مار کے اس کتے کے پلے کو بھگا دے۔ قریب میں کسی کتیا نے جھولی بھر بچے دیے ہوں گے، اور یہ دشمن زادے اب اس کے سارے گھر کو غلط کر رہے تھے لیکن وہ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ چارپائی سے اٹھنے کو اس کا جی نہ چاہا اور وہ کروٹ بدل کر دیوار کی طرف دیکھنے لگا جس پر کچی اینٹوں پر چونے کی ہلکی سی تہہ جگہ جگہ کھردری ہوگئی تھی اور اس نے آنکھ بند کرلی۔

پھر ہلکی سی اور ذرا مسلسل پیں پیں کی آواز آئی اس مرتبہ اس آواز میں بیماری اور بیچارگی کا کرب تھا۔ کبیر نے آنکھیں کھولیں۔ یہ سفید کتے کا پلا کمزور اور بیمار سا معلوم ہوتا تھا۔ بلا ارادہ کبیر اٹھ بیٹھا ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے پتیلی سے بچی کھچی ارہر کی دال نکالی جو اس نے صبح کو اپنے ناشتے کے لیے پکائی تھی اور باقی پانچ بجے بھنڈی کے ساتھ نہیں کھائی تھی رات کے لیے اٹھا رکھی تھی۔ ڈوئی بھر دال

سامنے مٹی کے ایک چھوٹے سے پیالے میں انڈیلی اور اس سفید کتے کے پلے کے آگے بڑھادی کتے کے پلے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے دم ہلائی اور پھر پچھلے دھڑ کے بل بیٹھ گیا۔ جھنجھلا کے اپنے پیر کے انگوٹھے سے کبیر نے کتے کے پلے کا منہ جھکا کے دال تک پہنچایا۔ اس نے دال کو سونگھا، منہ ادھر ادھر جھٹکا۔ کبیر نے پیر کے انگوٹھے سے اس کا منہ دال کی طرف اور زیادہ جھکایا اور اس مرتبہ اس سفید کتے کے پلے نے لپ لپ دال کو چاٹنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں سارا برتن چاٹ گیا۔ خوش ہو کے کبیر نے اسی مٹی کے برتن میں اپنے پیتل کے لوٹے سے تھوڑا سا پانی ڈالا۔ کتے کے بچے نے ایک دو گھونٹ پانی کے پیے اور دم ہلانے لگا۔ کبیر نے پاؤں کے انگوٹھے سے اس کا سر پانی تک پہنچانے کی کوشش کی اس مرتبہ کتے کے پلے نے اپنے آگے کے دونوں پنجے مٹی کے برتن میں جما دیے اور پانی الٹ دیا۔ اس پر کبیر کا دبا ہوا غصہ جاگ اٹھا۔ اس نے زور سے کتے کے پلے پر ایک لات جمائی جو کمرے کے دروازے کے اس پار جا گرا اور بڑی تکلیف سے 'پیں پیں' چلانے اور بلبلانے لگا۔ اس کی اس تکلیف، اس طرح بلبلانے سے کبیر نے پہلی بار ایک خوشی، ایک نامعلوم اطمینان، سرور، ایک طرح کی اندرونی تکمیل کی لہر محسوس کی۔ وہ آگے بڑھا کہ کتے کے پلے کو ایک اور لات رسید کرے اور اسے آنگن کے دروازے کے باہر پھینک دے لیکن جب وہ کتے کے پلے کے قریب پہنچا تو اس کی پیں پیں بند ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک طرح سے وہ رو رہا تھا جیسے چھوٹے بچے روتے ہیں۔ بڑی فریاد کے لہجے میں۔ اس پر کبیر کا دل پسیجا اور اس نے اپنے پاؤں کے تلوے کو کتے کے پلے کے سفید داغدار جسم پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا۔ کتے کا پلا پھر دم ہلانے لگا اور زبان نکال کر اس نے کبیر کے پیر کے تلوے کو چاٹ لیا۔ اس پر کراہت کے عالم میں کبیر نے کتے کے پلے کو ایک اور لات رسید کیا۔ وہ صحن کی دیوار کے قریب جا کے گرا اور پھر زور زور سے پیں پیں کرنے لگا۔ کبیر نے اسے آنگن سے باہر پھینکنے کی کوشش نہیں کی اور واپس آ کے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

گرمیوں کی رات تھی۔ پھر بھی تین چار بار کتے کے پلے کے پیں پیں کرنے کی آواز آئی۔ کبیر اٹھا اور صحن کی دیوار کے پاس سے کان پکڑ کے کتے کے پلے کو اٹھایا، جس نے منہ سے آواز تک نہیں نکالی اور اسے دروازے کے باہر موری میں آہستہ سے پھینک کے دروازے کا کواڑ بند کر لیا اور سو گیا۔

صبح صبح دودھ والے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کبیر نے دروازہ کھولا۔ دودھ لیا، چائے بنائی اور پینے لگا۔ اپنے جوتے کے قریب اس نے پھر ایک نرم جسم کا لمس محسوس کیا۔ وہی سفید کتے کا پلا اس کا جوتا چاٹ رہا تھا اور دم ہلا رہا تھا۔ اس مٹی کے برتن میں اس نے تھوڑی سی چائے انڈیلی تھوڑا سا دودھ اور ڈالا اور پیر کے نیچے سے کتے کے پلے کا منہ برتن کے قریب کر دیا، ایک منٹ میں کتے کا پلا ساری چائے سپڑ سپڑ پی گیا اور برتن چاٹنے لگا۔ پھر دونوں پیروں کو سیدھا کر کے، پچھلے دھڑ پر بیٹھ کر بڑی نحیف اور کمزور آواز میں وہ ذرا بھونکا۔

"ابے کتے کے پلے بھونکتا بھی ہے؟" یہ کہہ کر کبیر نے پھر زور سے لات جمائی اور کتے کا پلا اپلوں کے ڈھیر کی طرف پیں پیں چیختا ہوا بھاگا اور اپلوں کے ڈھیر اور دیوار کے درمیان ذرا سی جگہ پا کے اس میں سرک کے مردہ اور نحیف آواز میں مسلسل پیں پیں کرنے لگا۔

اپنے پاؤں کے تلوے سے کبیر نے اس کا سر سہلانے کی کوشش کی لیکن وہ باہر نہیں نکلا نہ اس نے دم ہلائی۔ کبیر نے

اپنے پاؤں کے تلوے سے کبیر نے اس کا سر سہلانے کی کوشش کی لیکن وہ باہر نہیں نکلا نہ اس نے دم ہلائی۔ کبیر نے اپنی چھڑی اٹھائی جس کے سرے پر لوہا چڑھا ہوا تھا اور لوہے والا سرا کتے کے پلے کی ہڈیوں میں چبھویا کتے کے پلے نے پھر بھونڈی دردناک آواز میں پیں پیں شروع کی اور اپلوں کے ڈھیر سے باہر نکلنے کے لیے مڑا۔ کبیر پر اس وقت دفعتاً جنون سا چڑھا اور اس نے اپنی لوہے کی نوک والی چھڑی کی ایک بھرپور مار سے کتے کے پلے کو اچھال کے ٹاٹ کے پردے کے اس پار، گھر سے باہر گلی میں پھینک دیا۔

اپنی چھڑی اٹھائی جس کے سرے پر لوہا چڑھا ہوا تھا اور لوہے والا سرا کتے کے پلے کی ہڈیوں میں چبھویا کتے کے پلے نے پھر بھونڈی دردناک آواز میں پیں پیں شروع کی اور اپلوں کے ڈھیر سے باہر نکلنے کے لیے مڑا۔ کبیر پر اس وقت دفعتاً جنون سا چڑھا اور اس نے اپنی لوہے کی نوک والی چھڑی کی ایک بھرپور مار سے کتے کے پلے کو اچھال کے ٹاٹ کے پردے کے اس پار، گھر سے باہر گلی میں پھینک دیا۔ پھر سن لائٹ سوپ سے اچھی طرح مل مل کر اپنے ہاتھ اور پیر دھوئے اور کھچڑی کی ہانڈی کو چولہے پر چڑھا دیا اور مؤکلوں کا انتظار کرنے لگا۔

اور اس روز شام کو جب وہ کچہری سے واپس آیا تو اس نے اس سفید کتے کے پلے کو یہیں سڑک پر پڑا دیکھا۔ اس کا سفید جسم جس پر بڑے بڑے کالے کالے دھبے تھے اکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی کھلی ہوئی تھیں۔ منہ کھلا ہوا تھا اور ایک کالا چیونٹا اس کے سفید جسم پر رینگ رہا تھا۔

رات بھر اپنے اس پہلے قتل کے کرب کے عالم میں وہ سو نہیں سکا۔ اس نے آج پہلی مرتبہ ایک جان لی تھی۔ جان کا بنانا اس کے اختیار میں نہیں تھا لیکن جان لینا اس کے اختیار میں تھا۔ وہ جو دن رات کبیر کے دوہے پڑھا کرتا تھا جس نے اپنی زندگی کبیر کے نام کے پیچھے وقف کر دی تھی۔ آج اسے اپنے اندر ایک نشاط انگیز ظالمانہ جذبہ، ایک ابلیسی طاقت کا احساس ہوا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت بھی معلوم ہونے لگی اور ساتھ ہی ساتھ ایک ناقابل بیان اطمینان، ایک طرح کا نشاط بھی۔

اسی شام کو میونسپلٹی کا چھکڑا سفید کتے کے پلے کی لاش کو اٹھا لے گیا تھا اور یوں بھی اس محلے میں شاید ہی اس کتے کے پلے کے وجود کا علم یا اس سے کوئی دلچسپی ہو، سررشتہ دار یا ہری رام پنت یا راموگولی یا دوسرے جان پہچان والوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ اس کتے کے پلے کا قاتل کبیر ہو سکتا ہے اور یوں انھوں نے انسانوں کے قتل کے ایسے ایسے منظر دیکھے تھے کہ اب انسان ہو یا حیوان کسی کی جان کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی ہفتوں بعد تک کبیر اپنے کسی ہمسائے سے آنکھیں چار کر کے بات نہ کر سکا۔ اس کی گردن خود بخود جھکی جھکی سی رہتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے سینے پر کوئی خاص بار نہیں تھا بلکہ کتے کے پلے کی لاش پر رینگتا ہوا چیونٹا جب اسے یاد آ جاتا تو اس کے خون میں انبساط اور اطمینان کی ایک نشہ آمیز لہر دوڑ جاتی۔

کئی مہینے گزر گئے اور کسی کتے کے پلے نے کبیر کے گھر کے دروازے کے ٹاٹ کے پردے سے جھانک کر اندر نہیں دیکھا لیکن راموگولی کے مویشیوں کے قریب ایک زرد رنگ کی غلاظت بھری کتیا جس کی پسلیاں تک صاف گنی جا سکتی تھیں کروٹ چاروں پاؤں پھیلے گھنٹوں پڑی رہتی۔ کبیر جو کتوں کو دیکھ کر سڑک کی دوسری طرف نانگھ جاتا تھا بے خوف و خطر اس کتیا کے قریب سے ہو کر نکل جاتا اور وہ زیادہ سے زیادہ مریل انداز میں سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کتیا کا پیٹ پھولتا جا رہا تھا اور پھر کچھ دنوں کے لیے وہ غائب ہو گئی۔

ایک دن کچہری سے واپس آتے ہوئے کبیر نے دیکھا کہ سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک کھڈ میں وہی کتیا جھولی بھر بچے لیے بیٹھی ہے۔ طرح طرح کے کتے کے پلے ایک سفید، بالکل سفید ایک بالکل کالا، دو چتکبرے، ایک زرد اور یہ کتے کے پلے اس کے چاروں طرف رینگ رہے ہیں۔ کبیر کو قریب دیکھ کر کتیا ذرا نہیں ہلی۔

■

ماخذ: عزیز احمد فکر فن اور شخصیت (جلد اوّل)، شخصیت و افسانہ نگاری اور افسانے، **تحقیق، ترتیب اور انتخاب:** اعظم راہی، **سنہ اشاعت:** 2012، **ناشر:** ادارۂ پیکر، پلاٹ نمبر 115، برنداون کالونی، ٹولی چوکی حیدر آباد 8

شمس الہدیٰ انصاری

ملکۂ ترنم بیگم اختر

ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ خوشی اور غم، شادی بیاہ، فصل کی کٹائی، موسموں کے گیت کے علاوہ ہر موقعے کے گیت اور عوامی دُھنیں موجود ہیں۔

بھجن کیرتن کنہیا کی بانسری، درگاہوں میں صنف قوالی کی مقبولیت اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے فنکار پیدا کیے ہیں۔ جنھوں نے موسیقی کو نئے رنگ و آہنگ اور روایتی انداز سے سجایا سنوارا۔ ایسے ہی بڑے فنکاروں میں ایک نام بیگم اختر کا بھی ہے، جو موسیقی کی بدولت اپنی زندگی ہی میں عزت وشہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئی تھیں اور وفات کے بعد بھی جنھیں عقیدت ومحبت کے پھول پیش کیے جارہے ہیں۔

بیگم اختر کی جائے پیدائش فیض آباد کی ہے۔ ابتدائی عمر میں بیگم اختر نے گھر پر قرآن مجید اور اردو کی تعلیم حاصل کی، بعد میں اسکول گئیں۔ کم عمری سے ہی انھیں موسیقی کی تعلیم دی جانے لگی۔

اُستاد امداد خان ان کے پہلے استاد تھے۔ یہ نو دس برس کی تھیں کہ ان کے گھر میں آگ لگ گئی۔ بہت سارا اثاثہ جل کر راکھ ہوگیا۔

ان کی والدہ اس حادثے سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انھوں نے فیض آباد چھوڑ دیا اور گیا شہر چلی گئیں۔ مگر محرم منانے کے لیے پورا خاندان فیض آباد آجاتا تھا۔

کچھ عرصے تک اُستاد غلام محمد خان بھی انھیں موسیقی کی تعلیم دیتے رہے۔ لیکن بعد میں ان کی والدہ نے پٹیالہ والے اُستاد عطا محمد خان کو باقاعدہ تعلیم دینے پر راضی کرلیا۔

بیگم اختر اپنے استاد کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ ان کی آواز سدھارنے میں استاد عطا محمد خان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بیگم کی والدہ نے آخر گیا شہر کی سکونت بھی ترک کردی اور سب کو لے کر کلکتہ چلی گئیں۔ جہاں اُستاد عطا محمد خان بدستور بیگم اختر کو ٹھمری دادرا، اور غزل گائیکی کی تعلیم دیتے رہے۔ کلکتہ کی نجی محفلوں میں بیگم اختر گانے بھی لگیں اور ان کے گانے کی شہرت جلد ہی ہوگئی۔

میگا فون ریکارڈنگ کمپنی نے ان کے کئی گانے ریکارڈ کیے۔ اختری بائی فیض آبادی کی حیثیت سے اب وہ اتنی مشہور ہوگئی تھیں کہ فلمی دنیا نے بھی انھیں دعوت دے دی۔

1937 میں یہ فلمی دنیا میں داخل ہوئیں، جہاں انھوں نے ایکٹنگ بھی کی اور کئی فلموں میں موسیقی بھی ترتیب دی۔ لیکن فلمی دنیا سے ان کا تعلق زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ فلمی دنیا چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ بیگم اختر نے رامپور میں قیام کیا۔

اور پھر وہاں سے آکر لکھنؤ کی ایک ممتاز شخصیت بیرسٹر قاضی اشتیاق احمد عباسی سے شادی کرلی اور بیگم اختر کے نام سے مشہور ہوئیں۔ شادی کے بعد اپنے شوہر کی خاندانی روایات کے پیشِ نظر وہ موسیقی کی محفلوں اور ریکارڈنگ سے کنارہ کش ہوگئیں۔

مگر موسیقی نے انھیں چھوڑا نہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کے شوہر کی اجازت سے انھیں ریڈیو اسٹیشن نے براڈ کاسٹ کرنے کے لیے آمادہ کرلیا اور پھر اپنے مداحوں کے اصرار سے مجبور ہوکر اور عباسی صاحب کی اجازت سے سنگیت سمیلنوں میں بھی حصہ لینا شروع کردیا۔

لکھنؤ میں مستقل قیام اور شادی کے بعد بیگم اختر کی دلنواز شخصیت لکھنوی تہذیب کا مکمل نمونہ بن گئی۔ بااخلاق اور بامروت ایسی کہ کوئی شخص بھی جو ایک بار ان سے ملا ان کا گرویدہ ہوگیا۔ گل افشانی گفتار ایسی کہ گھنٹوں باتیں کیجیے اور اٹھنے کا جی نہ چاہے۔

فلمی دنیا ترک کرنے کے بعد بیگم اختر نے کیرانہ گھرانے کے استاد عبدالکریم خان کے بھائی استاد عبدالوحید خان سے شاستریہ سنگیت کی تعلیم حاصل کی اور دھرپد خیال وغیرہ سیکھا۔ یہ تعلیم ان کے بہت کام آئی۔ لیکن موصوف کا رجحان بدستور ہلکے شاستریہ سنگیت ہی کی طرف رہا اور اسی طرز موسیقی کی ممتاز ترین نمائندہ تسلیم کی گئیں۔

بیگم اختر نے ٹھمری گائن کو ایک نیا انداز دیا۔ ٹھمری کے دو خاص رنگ ہیں۔ ایک 'پچھمی رنگ' اور دوسرا 'پوربی رنگ'۔ 'لکھنوی ٹھمری' کو تیسرا رنگ کہا جاسکتا ہے جس میں بیگم اختر نے اپنی جدت طبع سے ان سب رنگوں کو ملا کر اپنی ایک طرز نکالی۔ یہ ہندوستانی موسیقی کو ان کی دین ہے۔

ٹھمریاں عام طور سے بھیرویں تلک کامرد پہاڑی وغیرہ میں گائی جاتی ہیں۔ لیکن بیگم اختر ان راگوں کے علاوہ انھیں دوسرے راگوں، مثلاً بھیم پلاسی، چندرکوش، سارنگ کلاوتی دیش کار نرائنی شنکرا مین بھی گانا شروع کیا۔

ہندوستانی موسیقی کے سارے نازک قاعدوں اور ضابطوں کے تحت وہ مختلف راگوں میں انھیں گاتی رہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ٹھمری اور غزل کو انھوں نے زمین سے آسمان کردیا۔

بیگم اختر کی گائی ہوئی کچھ مخصوص ٹھمریاں اور دادرے یہ ہیں:

''تورے بنا ناہی چین جب سے شام سدھارے بہت دن بیتے میاں کو دیکھے'' وغیرہ۔ ان کا ہی گایا ہوا ایک پرسوز ساون ہے:

''چھارہی کالی گھٹا جیارا مورا گھبرائے ہے۔'' اور دوسرا ہے:

''کوئلیا مت کر پکار لاگے کریجوا کٹار!''

ایک طرف ٹھمری گائیکی میں موصوفہ نے نام پیدا کیا تو دوسری طرف غزل کو مقبول بنانے اور ہندوستانی موسیقی کی صف میں ایک ممتاز مقام دلانے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

غزل گائیکی ان کے اس احسان کو بھلا نہیں سکتی۔ اس سے پہلے تک ماہرین موسیقی کے نزدیک ہندوستانی موسیقی میں غزل کا کوئی مقام ہی نہ تھا۔ لیکن بیگم اختر نے اپنی رسیلی آواز اور اپنے مخصوص انداز میں غزل کو مختلف راگوں میں پیش کرکے اتنا ہردل عزیز بنادیا کہ اب موسیقی کی کوئی محفل غزل کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ غزل اس وقت اچھی طرح گائی جاسکتی ہے جب گانے والے یا گلوکار نے شعر کے مفہوم اس کی نزاکتوں اور اس کی روح کو پالیا ہو۔ یہ خوبی صرف بیگم اختر میں تھی۔

موصوفہ نے بہت سے کم شہرت یافتہ اور گمنام شعرا کا کلام پیش کرکے انھیں مشہور کردیا۔ ان کے علاوہ انھوں نے ایک طرف بہزاد لکھنوی، فانی، اصغر، شکیل بدایوانی، جگر مرادآبادی، آنند نرائن ملا اور فیض احمد فیض تک کی غزلیں گائیں۔ تو دوسری طرف قدیم اساتذہ میر، سودا، غالب، مومن، اقبال اور داغ وغیرہ کی تخلیقات پیش کرکے اردو شاعری کی روح اور شیرنی سے اپنے لاکھوں سامعین کو آشنا کرایا۔ وہ زندگی بھر اپنے سنگیت سے گیسوئے غزل کو سنوارتی رہیں۔ موصوفہ کی غزل گائیکی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انھوں نے شعرا اور سنگیت کے سنگم کے اس حسن کو بے شمار انسانوں کی آسودگی کا ذریعہ بنایا یا بنادیا تھا۔ سنگیت اور شعر کا اگر یہی مقصد ہے تو پھر بیگم اختر اپنے مقصد میں ایک کامیاب فنکار کی عظمت پر فائز ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ دنیائے موسیقی میں بڑے بڑے فنکار گزرے ہیں اور آج بھی ہیں لیکن بیگم اختر کی پراثر آواز اس کی دلکشی ان کے فن میں پایا جانے والا نہایت باتہذیب اور نایاب انداز کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ اس لیے بیگم اختر ملکۂ غزل تو تھیں ہی ملکۂ ترنم بھی تھیں۔

بیگم اختر پر تین مرتبہ قلبی دورہ پڑا۔ پہلا دورہ 1967 میں لکھنؤ میں پڑا جو ہلکا تھا۔ دوسرا دورہ 25 جولائی 1974 کو لکھنو ہی میں پڑا۔ یہ زیادہ سخت تھا۔ لیکن کچھ دن آرام کرنے کے بعد ڈاکٹروں، عزیزوں اور دوستوں کی مخالفت کے باوجود پروگراموں میں حصہ لینے لگیں۔

اگر ان سے کہا جاتا کہ ان پروگراموں میں حصہ لینا آپ کی جان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے تو وہ جواب دیتیں۔ اس سے اچھی موت کیا ہوگی کہ میں گاتے گاتے مرجاؤں۔ ہوا بھی یہی اکتوبر 1974 میں یہ دہلی آئیں اور یہاں سے احمد آباد چلی گئیں۔ 26 اکتوبر کو احمد آباد میں ایک پروگرام تھا۔ پروگرام کے بعد رات کو یہ اپنے ہوٹل واپس آئیں۔ اسی رات لگ بھگ تین بجے تیسرا قلبی دورہ پڑا۔ فوراً اسپتال میں داخل کی گئیں۔ دوسرے دن کچھ افاقہ ہوا۔ مگر پھر طبیعت ایسی بگڑی کہ سنبھل نہ سکی اور 30 اکتوبر 1974 کو رات تقریباً ساڑھے آٹھ بجے اسپتال میں ہی انتقال ہوگیا:

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

احمد آباد سے ان کی نعش ایک تابوت میں دہلی پہنچی اور یہاں سے لکھنؤ یہاں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں پسند باغ ٹھاکر گنج میں اپنی والدہ کے پہلو میں دفن کردی گئیں۔

■

Shamsul Hoda Ansari (Alig), A.K. Hood House, Motor Market, Naya Bazar, Dhanbad - 826001 (Bihar)

کامل قریشی

ذاکر حسین
ایک سوانحی خاکہ

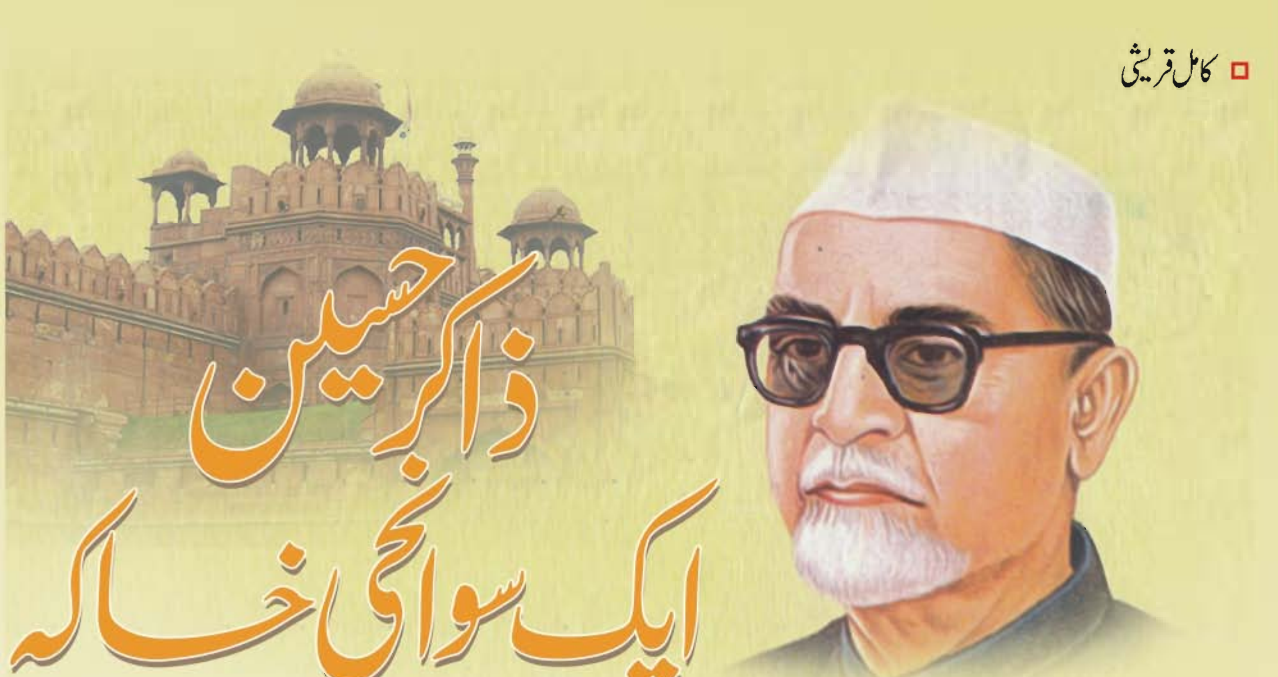

ذاکر صاحب کے آبا و اجداد آفریدی پٹھان تھے۔ پٹھانوں کی بستیاں یوں تو سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے دور 1266 تا 1287 کے دوران پٹیالی اور کمپل (ضلع ایٹہ اور فرخ آباد) میں آباد کردی تھیں جو رفتہ رفتہ مسلسل پھیلتی رہیں لیکن 18ویں صدی کے اوائل میں خیبر اور کوہاٹ کے بہادر اور جنگ جو پٹھان فرخ آباد کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہوئے اس علاقے میں بنگش قبیلے کے ایک سورما نوجوان محمد احمد خاں نے اپنی شجاعت اور بہادری کے سبب زبردست نام پیدا کیا تھا اس نے فرخ سیر کو اس کی تخت نشینی کی جدوجہد میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدد کی تھی اور فرخ سیر کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد نواب کا خطاب پایا تھا خطاب، جاگیر، اور منصب چار ہزاری پانے کے بعد اسی محمد احمد خان بنگش نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد اور اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا تھا اور اس طرح ان علاقوں میں خیبر اور کوہاٹ سے آفریدی پٹھان مسلسل آ آکر آباد ہوتے رہے اور زیادہ تر قائم گنج میں اپنے محلے بناتے رہے۔ اس علاقے میں اکثریت کے ساتھ ان پٹھانوں کی آبادی ہوئی جن کا کام میدان جنگ میں اپنے کارنامے دکھانا اور سورمائی کے کمالات پیش کرنا ہوتا تھا اور اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر سپاہیانہ شجاعت کی داد و تحسین حاصل کرتے تھے، انھی آفریدی پٹانوں کے ورثا کے طور پر آج تک بھی قائم گنج میں وہ خاندان آباد ہیں جن کی رگوں میں پٹھان خون موجود ہے اور جو اپنی شجاعت، غیرت، حمیت اور بات کے دھنی ہونے کے لیے مشہور ہیں۔ قائم گنج کے مردم خیز علاقے میں پتورہ نامی گاؤں کے ایک محلے مول خیل سے ذاکر صاحب کے خاندان کا تعلق ہے یہیں ان کا آبائی مکان ہے اور اسی علاقے میں ان کی کاشتکاری کی زمینیں بھی تھیں۔ قائم گنج کا پرانا نام مئو رشید آباد تھا اور اسی کو پرانی ڈانگ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔

والد کے انتقال سے قبل حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں ذاکر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی شروع ہوگئی تھی اور اس طرح اونچے خاندان کے بچوں کی طرح ذاکر صاحب گھر پر رہ کر انگریزیٹوٹر کے ذریعہ پڑھے، والد کے انتقال کے بعد جب قائم گنج آئے توانھیں مولوی بشیر الدین کے قائم کردہ (1889) اٹاوے کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کرادیا گیا، یہاں ذاکر صاحب کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین کی سرپرستی ملی۔

ذاکر صاحب کے مورثِ اعلا کا تعلق 'تورکاکا' کے قبیلے سے ہے جن کو اس کے آخون یعنی مذہبی پیشوا یا استاد یا گرو ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے دو مشہور بھائی تھے حسن اور حسین، حسین مدہ آخون یعنی بڑے استاد کے طور پر مشہور تھے۔ جو اس علاقے میں آنے سے پہلے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتے تھے یہاں بھی انھوں نے معلمی ہی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ ایک صوفی صافی اور پاکباز انسان تھے، پٹھان ان سے روحانی طور پر اس حد تک متاثر تھے کہ بہت سوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔

آج بھی قائم گنج کے قدیم قبرستان نندو خاں میں ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے لوگ وہاں نذر عقیدت پیش کرنے آتے ہیں انھی مدہ آخون حسین سے ذاکر صاحب کے خاندان کا براہِ راست تعلق ہے اور انھی مدہ آخون حسین سے ذاکر صاحب کے افراد خاندان کے ناموں کے ساتھ حسین لکھا جاتا ہے۔ مدہ آخون حسین کے بیٹے احمد حسین خاں تھے اور ان کے بیٹے محمد حسین خاں، محمد حسین خاں کے بیٹے غلام حسین خان عرف جھمّن خان، ذاکر صاحب کے دادا تھے جو نہایت درویش صفت تھے اور فقیروں کی صحبت میں رہتے تھے اور خصوصاً دو بزرگوں کرم علی شاہ اور بنس بہاری سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ غلام حسین خان کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے ایک بار وہ اپنا مکان تعمیر کرارہے تھے کہ کسی بات پر کسی مزدور کو جھڑک دیا، ان کے پیر و مرشد کو پتہ چلا تو وہ غلام حسین پر بہت ناراض ہوئے اور ان سے کہا کہ حسین اگر اس نو تعمیر مکان میں تم اور تمھاری اولاد عیش و آرام سے رہنا چاہتی ہے تو مزدور کو جھڑکنے اور سخت وست کہنے کے کفارے کے طور پر متھرا میں سنت سادھوؤں کی سنگت میں رہ کر کچھ دن گزارو اور جب تمھارے دل سے گناہ کی کثافت کا احساس دور ہو اور ضمیر مطمئن ہوجائے تو پھر واپس آ کر مکان مکمل کرانا، غلام حسین نے مرشد کے حکم کی تعمیل میں متھرا کا سفر کیا وہاں سادھو سنتوں کی صحبت میں رہے اور ایک اچھے خاصے عرصے کی تپسیا کے بعد جب ان کے قلب کو سکون ملا تو واپس ہوئے اور مکان کی تعمیر مکمل کرائی۔

ان ہی غلام حسین خاں عرف جھمن خاں کے دولڑکے عطاحسین خان اور فدا حسین خاں تھے، عطا حسین خان فوج میں رسالدار تھے اور ان کے کوئی اولاد نہیں تھی چھوٹے بیٹے فدا حسین خاں کی پیدائش 1868 میں ہوئی وہ بعمر بیس سال تجارت کے شوق میں حیدرآباد چلے گئے اور وہاں مرادآبادی برتنوں کا کام شروع کردیا لیکن حصول تعلیم کا شوق دل میں پھر پیدا ہوا تو پڑھنے لکھنے میں مصروف ہوئے اور قانون کا امتحان پاس کرکے اورنگ آباد میں وکالت شروع کردی، ساتھ ہی 'آئین دکن' کے نام سے ایک رسالہ جاری کردیا، وکالت اور رسالہ دونوں خوب چلے اور ان کی شہرت دکن بھر میں ہوگئی تو حیدرآباد آگئے اور بیگم بازار کے حلقے میں جہاں تجارت کا آغاز کیا تھا وہیں دفتر بنالیا اور پھر اسی جگہ زمین لے کر مکان بھی تعمیر کرالیا اس مکان میں وکالت کا دفتر، کتب خانہ، اخبار کا دفتر اور اپنی رہائش گاہ سب کچھ منتقل کرلیا، فدا حسین خاں کی شادی قائم گنج کے کلال خیل کے بنی داد خاں کی لڑکی نازنین بیگم سے ہوئی، بنی داد خاں شریف، نیک اور نہایت حلیم آدمی تھے ایسی ہی طبیعت ان کی بیٹی نازنین بیگم نے پائی تھی وہ سیرت وصورت دونوں اعتبار سے سادہ مزاج، بردبار، پاکباز، متواضع اور نیکی و شرافت کا نمونہ تھیں، فدا حسین اور نازنین بیگم کی یہ جوڑی طبیعتوں کے میلان اور عادات واطوار کے لحاظ سے آفتاب و ماہتاب کی طرح تھی۔ ان فرشتہ صفت میاں بیوی کے باہمی رشتۂ ازدواج کے نتیجہ میں فدا حسین کے گھر سات لڑکے ہوئے جن کی ترتیب یہ ہے مظفر حسین، عابد حسین، ذاکر حسین، زاہد حسین، یوسف حسین، جعفر حسین اور محمود حسین۔ بڑے بھائی مظفر حسین صرف تیس برس جیے جو شادی شدہ تھے اور ان کی اولاد میں دولڑکے امتیاز حسین اور مسعود حسین اور ایک لڑکی فاطمہ بیگم ہوئے امتیاز حسین خاں نے 1966 میں انتقال کیا۔ مسعود حسین خاں علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے اور ابھی بفضل خدا حیات ہیں، مظفر حسین خاں سے چھوٹے بھائی عابد حسین اور زاہد حسین کا انتقال بعارضۂ تپ دق علی گڑھ میں ہی دوران تعلیم ہوچکا تھا، جعفر حسین بھی صغرسنی ہی میں وفات پاگئے تھے۔ یوسف حسین خاں عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرووائس چانسلر رہے پھر کچھ عرصے کے لیے مرکزی حکومت کی تعلیمی اسکیم کے تحت شملے میں رہے پھر غالب انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی سکریٹری ہوئے۔ روح اقبال، اردو غزل، فرانسیسی ادب اور یادوں کی دنیا کے علاوہ انھوں نے کافی دوسری تصنیفات وتالیفات کیں، انتقال کرچکے ہیں اولاد میں راشد اور اجمل حسین ان کی یادگار ہیں سب میں چھوٹے بھائی محمود حسین خاں نے تاریخ میں جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے، سلطان ٹیپو کے فوجی نظام پر کام کیا، وہابی تحریک پر تحقیق کی۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر اور وائس چانسلر رہے اور پھر پاکستان کے وزیر تعلیم بھی بنے، انتقال کرچکے ہیں۔ ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین کی پیدائش قائم گنج میں 1893 میں ہوئی ان کے علاوہ باقی سب بھائی حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی سلسلے کے حساب سے ذاکر صاحب کا نمبر تیسرا ہے جن کی 8 فروری 1897 مطابق (6 رمضان المبارک 1314ھ بروز پیر) کو حیدرآباد میں ولادت ہوئی۔ ذاکر صاحب کے والد فدا حسین

حیدرآباد میں سخت بیمار ہوجانے کی وجہ سے اپنے وطن قائم گنج میں لوٹ آئے جہاں 1907 میں بعمر 39 سال انھوں نے وفات پائی اور اس خاندان کی سرپرستی کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی عطا حسین خاں کے سپرد ہوئی جنھوں نے اپنے انتقال 1910 تک بحسن وخوبی ذمہ داری کے فرائض انجام دیے اور پھر تمام بچوں کی نگرانی اور دیکھ بھال ان کے خالو حسن الدین خاں نے کی۔

والد کے انتقال سے قبل حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں ذاکر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی شروع ہوگئی تھی اور اس طرح اونچے خاندان کے بچوں کی طرح ذاکر صاحب گھر پر رہ کر انگریز ٹیوٹر کے ذریعہ پڑھے، والد کے انتقال کے بعد جب قائم گنج آئے تو انھیں مولوی بشیرالدین کے قائم کردہ 1889 اٹاوے کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کرادیا گیا، یہاں ذاکر صاحب کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین کی سرپرستی ملی۔ ذاکر صاحب پر سید الطاف حسین کی نیکی، شرافت، اعلا سیرت وکردار اور خلوص ومحبت کے نقوش اس قدر گہرے پڑے تھے کہ انھوں نے زندگی بھر ان کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنی ترقی کی راہیں روشن کیں اور سید صاحب کی یاد اپنے دل سے کبھی محو نہیں ہونے دی وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے محسنوں کو جب یاد کرتے تو سید الطاف حسین کا نام سرِ فہرست ہوتا اسی اسکول کے ان کے دوسرے استاد سید شرف الدین یاس بھی تھے جو دین و مذہب، شعر و ادب اور اپنے کٹر نیشلسٹ خیالات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ذاکر صاحب کی زندگی پر ان کے بھی اثرات پڑے اسی کی وجہ سے ذاکر صاحب میں علم وادب، تحریر وتقریر، بحث مباحثہ کا شوق پیدا ہوا نیز قومی وملی مسائل میں دل چسپی کا آغاز بھی اسی دور سے ہوا، علاوہ ازیں اس زمانے کے ترکی کے جنگی حالات نے مسلمانان ہند میں غیر معمولی قومی و اسلامی بیداری پیدا کردی تھی۔ ذاکر صاحب ترکی کی امداد کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کے لیے اسکول کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جوشیلی تقریریں کرتے، ان کی توجہ ترکی کے مظلومین کی طرف مبذول کراتے اور نہایت سرگرم رہ کر ان میں اسلامی غیرت وحمیت پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے، اسکول کے لڑکوں کے علاوہ ذاکر صاحب کی اپیل پر اٹاوے کے مسلمان گوشت کھانا بند کرکے ترکی کے امدادی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیتے تھے اور ذاکر صاحب یہ چندہ ترکی فنڈ میں بھیج دیا کرتے تھے۔ ترکی کی جنگ کے واقعات سے جہاں ان کو عالم اسلام کے واقعات سے واقفیت ہورہی تھی وہاں وہ اخباروں بالخصوص 'پانیر' وغیرہ کے ذریعہ مختلف سیاسی و سماجی معلومات فراہم کررہے تھے۔ 1911 میں طاعون کی وبا پھیلی جس میں گھر کے گھر ویران ہوئے اور یہ گھر بھی لپیٹ میں آگیا، دوسرے رشتہ داروں، عزیزوں کے علاوہ ذاکر

صاحب کی والدہ بھی اس وبا کی شکار ہوگئیں، اوران کی دنیا تیرو تار ہوگئی، ذاکر صاحب کی والدہ نے ان پر اپنی شخصیت کے نہایت گہرے نقوش چھوڑے تھے اسی دور میں ذاکر صاحب ایک صوفی بزرگ پیر حسن شاہ سے بھی بیعت ہوگئے تھے اور ان کی صحبتوں سے فیض حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے حسن شاہ کو بھی مرید سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ ذاکر صاحب کی بیماری کے زمانے میں دوا اور دعا دونوں میں شریک رہتے تھے، صوفی حسن شاہ کا بھی ذاکر صاحب نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول سے ذاکر صاحب فارغ ہوئے تو انھوں نے 1913 میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ یہاں داخل ہونے سے قبل ان کے دو بڑے بھائی عابد حسین اور زاہد حسین پہلے ہی سے طالب علم کے طور پر موجود تھے 1915 میں ذاکر صاحب کے بڑے بھائی نے قائم گنج میں ہی شاہ جہاں بیگم سے ان کی شادی کردی تھی جن سے ان کی تین لڑکیاں ہوئیں۔ سعیدہ بیگم، صفیہ بیگم اور رقیہ ریحانہ، رقیہ ریحانہ پانچ سال کی عمر میں وفات پاگئیں۔ سعیدہ بیگم کی شادی جناب خورشید عالم خاں سے ہوئی اور صفیہ بیگم ظل الرحمن شاہ جہاں پوری سے بیاہی گئیں۔

علی گڑھ کا داخلہ ذاکر صاحب کے لیے ایک نئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ انھوں نے قوم وملت کے اس بڑے تعلیمی ادارے میں آکر دنیا کو ایک نئے انداز سے دیکھا، وہ ساتھیوں سے ملے ان میں رہے نئی چیزوں اور نئے مسائل سے واقف ہوئے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ انھوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے ایف اے کا امتحان سائنس سے پاس کیا اور پھر لکھنؤ اس لیے چلے گئے کہ وہاں میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کا امتحان پاس کریں لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی وہ بیمار پڑ گئے اور جسمانی وذہنی الجھنوں کا شکار ہوکر قائم گنج واپس ہوئے لیکن جب صحت یاب ہوئے اور انھیں اپنی زندگی کی آس بندھی تو پھر ایک سال بعد دوبارہ علی گڑھ میں داخلہ لیا اور اس بار سائنس کے مضامین کے بجائے آرٹس کی طرف متوجہ ہوئے اور 1918 میں بی اے پاس کرنے کے بعد اقتصادیات کے ایم اے کے ساتھ قانون کے کورس میں بھی داخلہ لے لیا۔ بی اے میں ان کے پاس انگریزی، ادب، فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین تھے اس لیے ایم اے میں اقتصادیات لینا پسند کیا اور قانون سے انھیں گہرا شغف تھا اس لیے قانون کا مطالعہ یوں ضروری تھا۔

ذاکر صاحب نہایت ذہن، ہوش مند اور سمجھ دار طالب علم تھے وہ کتابوں اور کلاسوں سے اس زمانے میں زیادہ دل چسپی نہیں رکھتے تھے لیکن لائبریری، ریڈنگ روم اور خاص کتابوں کے علاوہ معلومات عامہ سے انھیں گہری دل چسپی تھی اور ان کی یادداشت اس قدر بلا کی تھی کہ جو ایک بار پڑھ لیا وہ ذہن نشین ہوگیا وہ امتحان کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہ ذہن پر کتابوں اور نوٹس وغیرہ کو بار بناتے تھے مگر جب لگ کر یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کے لیے بیٹھ جاتے تھے تو پھر ان سے بڑا پڑھنے والا اور کامیاب ہونے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ رشید احمد صدیقی ان کی ان تمام سرگرمیوں اور معمولات کے رازدار ہیں۔ انھوں نے 'ہمارے ذاکر صاحب' کے صفحات میں ایسے نہ جانے کتنے ہی پردے اٹھائے ہیں ان کا بیان ہے:

''جو بات ذاکر صاحب کو ممتاز کرتی وہ یہ تھی کہ یہ کورس کی کتابیں نہ خریدتے تھے نہ پڑھتے تھے، زیادہ وقت ادھر ادھر گھومنے یا جہاں تہاں بیٹھ کر خوش گپیوں میں گزار دیا کرتے تھے لیکن لٹن لائبریری اور یونین کے دارالمطالعے کا روزانہ گشت ضرور شامل ہوتا۔ رات کو واپس آتے یا دن میں کہیں ملاقات ہوجاتی تو معلوم ہوتا کہ ہندوستان یا اس سے باہر کا کوئی علمی یا سیاسی مسئلہ اور کالج کا کوئی حادثہ پرائیویٹ یا پبلک یا ادویات کا اشتہار ایسا نہ تھا جس کی ان کو خبر نہ ہو۔''

ذاکر صاحب کو علی گڑھ کے ماحول میں تحریر، تقریر، بحث مباحثہ، سیاسی وسماجی معاملات کو سمجھنے اور زندگی کے نشیب وفراز سے فاتحانہ انداز کے ساتھ گزرنے کی تربیت حاصل ہوئی یہیں ان کو ایسے دوست ملے جن کی یادیں ہمیشہ ان کی زندگی کا حصہ بنی رہیں۔ یہیں کی یونین کے ماحول کے تحت وہ ایسے جادو بیاں مقرر بنے جس کا کوئی منتر خالی نہیں جاتا تھا، وہ اپنی بات کو، اپنے نقطۂ نظر کو اور اپنے خیال کو منوانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے اور انھیں اپنے انداز بیان سے مخالفت سے مخالف ماحول کو اپنا کر لینے کا سلیقہ آتا تھا، ان کے ایسے معرکوں کا ذکر ان کے ہمجولیوں اور ہمدموں نے بعض جگہ کیا ہے جس سے ان کی ذہانت، موقع شناسی حاضر جوابی اور ذکاوت کے کمالوں پر گہری روشنی پڑتی ہے، علی گڑھ کے اسی طالب علمانہ دور کی ان کی وہ خدمات اور یادگار روشن ہیں جو انھوں نے طلبا کی ترقی، یونیورسٹی کی تعمیر واصلاح، استادوں اور شاگردوں کے درمیان محبت اور ادب واحترام کے گہرے رشتوں کی کوشش، ڈیوٹی، سوسائٹی کے لیے جدوجہد، یونین کی کارکردگی میں غیر معمولی دل چسپی اور طلبا کے لیے یونیورسٹی سے بہت سی سہولیات وآسانیاں فراہم کرنے کے تحت انجام دیں، وہ تعلیمی مصروفیات کے علاوہ اپنے احباب کے ساتھ ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے ماہانہ رسالے علی گڑھ منتھلی میں زپ کے فرضی نام سے مضامین لکھتے تھے، مباحثوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ تقریر کے فن میں ان کا لوہا سب مانتے تھے اور اسی زمانہ طالب علمی میں انھوں نے افلاطون کی کتاب Plato Republic کا اردو ترجمہ ریاست کے نام سے اتنی شاندار، سلیس اور دل کش اردو میں کیا تھا کہ ان کے اس دور کے ساتھی اور اردو ادب کی مشہور ومعروف ہستی مولانا اقبال سہیل نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

''افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔''

اردو کے ساتھ ان کی انگریزی کا بھی جواب نہ تھا وہ اپنی تحریر وتقریر میں اردو انگریزی دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر ریمز باتھم نے کہا تھا کہ:

''ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر وتقریر کا بالخصوص ان کی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بیشتر اراکین سے کیا جاسکتا ہے۔'' (آشفتہ بیانی)

ذاکر صاحب جب ایم اے (اقتصادیات) کے آخری سال میں آئے تو ان کا تقرر اکیناکس کے جونیئر لکچرار یا اسٹوڈنٹ لکچرر کے طور پر ہوگیا تھا، اس دور میں خلافت کی تحریک شروع ہوگئی اور اسی کے ساتھ تحریک ترک موالات کی تیز تر سرگرمیوں کا بھی آغاز ہوا، یہیں سے وطن کی جنگ آزادی اور انقلاب ملک نے ایک نیا ہنگامہ خیز موڑ لیا۔ تحریک خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے زور سے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک طوفان کھڑا ہوگیا اور ہندوستانیوں میں اتحاد واتفاق کی اس قدر گہری لہر پیدا ہوئی کہ ایسی مثال تاریخ جنگ آزادی میں پہلے نہیں ملتی تھی۔ ہندوستان بھر کے مختلف طبقوں کے علاوہ تعلیمی ادارے بھی

اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ علی گڑھ کالج جو برطانوی حکومت کے حلیفوں کا مرکز کہا جاتا تھا یہاں بھی طلبا میں دو گروپ بن گئے اور ایک انقلابی گروپ کی طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ علی گڑھ برطانوی حکومت کی امداد لینا بند کردے اور تمام امدادی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے ان طلبا کو یہ توجہ دلانے والے قائد حکیم اجمل خاں اور علی برادران تھے جب علی گڑھ کالج کے کارپردازوں پر کوئی بات کارگر نہیں ہوئی تو قائدین ملت نے براہِ راست رجوع کرنے کے لیے پیش رفت کی اور تحریک خلافت کے حامی طلبا نے یونین سے خطاب کرنے کے لیے مہاتما گاندھی، علی برادران، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو دعوت دی جنھوں نے 20 اکتوبر 1920 کو طلبا کے سامنے اپنا نقطۂ نظر واضح طور پر رکھ کر اپنا موقف منوالیا اور انجام کار ذاکر صاحب اور ان کے کچھ انقلابی ساتھیوں نے علی گڑھ کالج کو خیر آباد کہہ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد 29 اکتوبر 1920 کو علی گڑھ ہی میں رکھی جس میں علی برادران، حکیم اجمل خان، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر صاحب پیش پیش تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا اس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی مقرر کیے گئے اور ذاکر صاحب ان کے مددگار کے طور پر شریک رہے۔ تقریباً دو برس تک وہ جامعہ ملیہ کے اساتذہ وطلبا کے ساتھ گھل مل کر کام کرتے رہے اور پھر 1922 میں معاشیات کی اعلا تعلیم کے لیے (برلن) جرمنی روانہ ہوگئے برلن میں انھیں پروفیسر رومبارٹ اور اسپرنیگر کی سرپرستی نصیب ہوئی اپنے قیام کے دوران وہ جرمنی کے ہندوستانیوں کی انجمن کے صدر مقرر ہوئے۔ یہیں ان کی ملاقات مسٹر چٹوپادھیائے اور برادر مسز سروجنی نائیڈو سے ہوئی اور یہیں ان کے دن رات کے ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر مجیب تھے جن کا بعد میں زندگی بھر ساتھ رہا۔ برلن میں انھوں نے جرمن زبان پر قدرت حاصل کی ایک کتاب مہاتما گاندھی کے پیغام اور مقصد حیات سے متعلق انھوں نے لکھی اور چھاپی اور اپنی تقریروں، تحریروں اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ مہاتما گاندھی اور ان کے مشن سے متعلق لوگوں کو

واقفیت بہم پہنچائی۔ ان مصروفیات کے علاوہ انھوں نے برلن ہی میں دیوان غالب، اور دیوان حکیم اجمل خان شیدا بھی چھپوائی، برلن میں ذاکر صاحب نے تقریباً تین سال کا عرصہ گزارا اور معاشیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے علاوہ بے پناہ مشاہدہ، گہرا تجربہ اور مغربی دنیا کے حالات کا مطالعہ وجائزہ لے کر وطن لوٹنے کا ارادہ کررہے تھے کہ اِدھر ملک میں حالات تیزی سے بدلے اور تحریک خلافت سرد پڑنے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی بددلی کا شکار ہونے لگی ایسے حالات میں اراکین جامعہ اسے بند کرنے کا ارادہ کررہے تھے کہ ذاکر صاحب نے جرمنی سے تار دیا کہ جامعہ کو بند نہ کیا جائے وہ اور ان کے ساتھی جامعہ کے لیے خود کو وقف کرنے کی قسم کھا چکے ہیں اس یقین دہانی اور مہاتما گاندھی کی ہمت افزائی پر جامعہ کو بند کرنے کا ارادہ ترک ہوا اور ذاکر صاحب ہندوستان جب واپس آئے تو علی گڑھ سے اسے گاندھی جی کی رائے کے مطابق قرول باغ دہلی منتقل کردیا گیا۔ اور ذاکر صاحب شیخ الجامعہ بنائے گئے اور اس کے تنِ بے جان کو نئی زندگی ملی۔ ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور دوسرے اساتذہ نے قومی جوش اور ملّی فرض کے پیش نظر نہایت قلیل تنخواہوں پر جامعہ کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا، ذاکر صاحب، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور جامعہ کے دوسرے ساتھیوں نے اسے اٹھانے کے لیے تن من کی بازی لگادی۔ اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی جدوجہد کی اور ملک کے مختلف حصوں سے مالی امداد اور چندہ وغیرہ جمع کرکے جامعہ کو چلایا جاتا رہا اس کی مستقل مدد کے لیے اجمل جامعہ فنڈ قائم ہوا، نیز انجمن تعلیم ملی کا قیام عمل میں لایا گیا اور ملک کے دورے کیے گئے، اسے چلانے کے لیے ڈاکٹر انصاری ذاکر صاحب اور جمنالال بجاج پیش پیش رہے۔

جامعہ کے اس قومی وملّی اور تعلیمی کام میں ذاکر صاحب کا سابقہ اور ملک وقوم کے عظیم رہنماؤں سے ہورہا تھا، خاص طور پر وہ حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے ان کی زندگی پر اپنی سادگی، تپ، تیاگ اور قربانی کے اعلا اوصاف کی وجہ سے حکیم اجمل خاں صاحب نے بڑے گہرے نقوش چھوڑے تھے وہ ان کی ملت کے لیے تعلیم کی کوشش عوام میں بیداری کی جدوجہد اور ہندوستانیوں کی تعمیر وترقی کے لیے دوڑ دھوپ سے بہت متاثر تھے، اسی طرح وہ مہاتما گاندھی کی ذات کو ملک وقوم کے لیے ایک ایسی مشعل راہ سمجھتے تھے جس کی روشنی ملک کے لیے بے انتہا ضروری تھی انھوں نے کہا تھا کہ:

''میں نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز گاندھی جی کے قدموں میں بیٹھ کر کیا تھا اور وہی میرے پیرومرشد تھے۔''

انھوں نے گاندھی جی کی تعلیمات اور اپنے آدرشوں کے پیش نظر ایک بار یہ بھی کہا تھا:

''انفرادی اور سماجی طور پر سادہ و پاک زندگی بسر کرنا، پسماندہ اور کمزور افراد کے ساتھ حقیقی اور پرخلوص ہمدردی کا اظہار کرنا اور ہندوستان کے مختلف طبقوں میں اتحاد و وحدت پیدا کرنا میرے آدرش رہے ہیں۔''

یہ سب کچھ انھوں نے زندگی میں اپنے آدرش بنا کر قدم قدم پر برتا اور عمل میں لائے انھوں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ حکیم اجمل خاں کے لیے بھی ایک بار یوں اظہار کیا تھا:

''گاندھی جی کی حق بیانی حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر

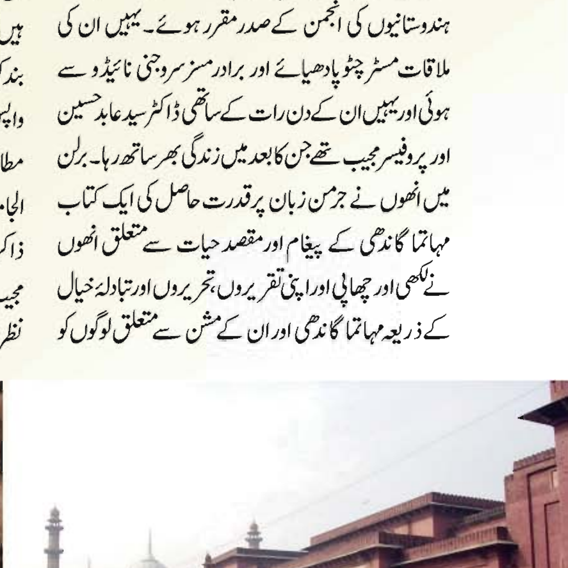

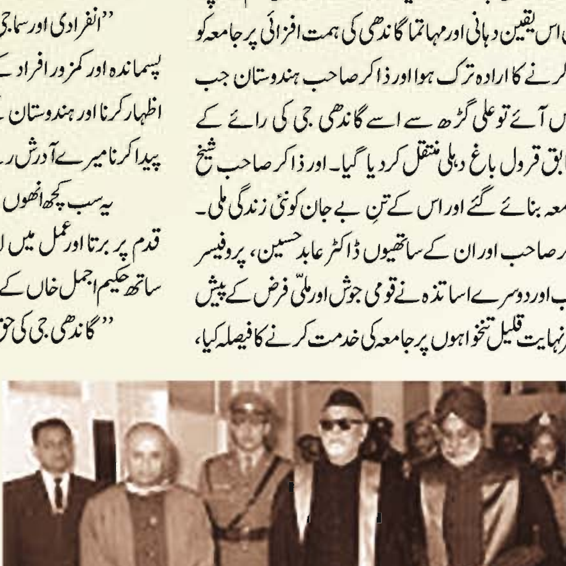

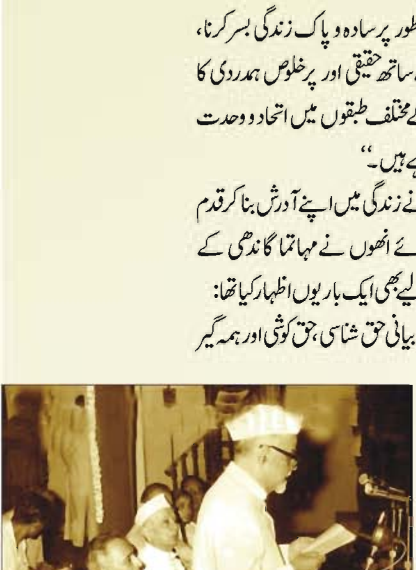

انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنادیا تو حکیم اجمل خاں کے خلق ومروت صبر وحلم نے اس پر جلا کردی۔''

ذاکر صاحب نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ جامعہ کی ترقی کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک ادارے کو زندگی دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے اور اس میں اپنے وقت، انرجی، صحت اور پوری زندگی کو اس طرح کھپایا کہ وہ صرف جامعہ کے ہوکر رہ گئے اور شب وروز کی جدوجہد سے جامعہ کو معراج کمال پر پہنچانے میں ہر قسم کے جتن کیے، ان کی کوشش سے حیدرآباد دکن کے دورے سے مالی امداد میں بہت کامیابی ہوئی اور جامعہ کے لیے اوکھلے کی زمین خریدی گئی۔ جہاں یکم مارچ 1935 کو جامعہ کی نئی عمارتوں کا سنگِ بنیاد ایک چھوٹے بچے کے ہاتھوں رکھا گیا۔

مہاتما گاندھی کے ایما سے ذاکر صاحب نے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں ایک نیا انقلاب لانے کے لیے واردھا اسکیم تیار کی چونکہ اس سلسلے میں 21/22 اکتوبر 1937 کو مہاتما گاندھی کی صدارت میں بمقام واردھا یہ کانفرنس منعقد کی گئی اس لیے اس نئی تعلیمی اسکیم کا نام واردھا اسکیم پڑا، اس کے صدر ذاکر صاحب مقرر ہوئے اور دیگر ممبران کے طور پر اس میں ملک کے مشہور ماہرینِ تعلیم کو شامل کیا گیا۔ یہ اسکیم جب عوام کے سامنے آئی تو اس پر نکتہ چینی اور اعتراض شروع ہوگئے جن کے مختلف جلسوں، اجلاسوں اور کانفرنسوں میں جواب دیے گئے جس کی تفصیل کے لیے وقت درکار ہے چنانچہ اس سے قطع نظر اتنا کافی ہے کہ واردھا اسکیم کے علاوہ ذاکر صاحب کے زیر قیادت ہی ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا بھی قیام عمل میں آیا اور اس طرح ملک وقوم نئے تعلیمی ڈھانچے کے تجربے سے گزرے، چنانچہ جامعہ نے واردھا اسکیم کے تجربے کی روشنی میں اپنے تربیتی مرکز کھولے انھی مختلف منزلوں سے سے گزرتی ہوئی جامعہ، ذاکر صاحب کے ان الفاظ کی مکمل تصویر بنی جسے ذاکر صاحب نے مقصد سے تعبیر کیا ہے: ''ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے اس کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے۔''

بڑھتی ہوئی ترقی کے ساتھ ساتھ جامعہ میں عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، علمی وادبی دلچسپیوں کو فروغ ہوا، ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی سرگرمیاں تیز ہوئیں اس دوران جنگِ عظیم ثانی شروع ہوئی اور ادھر جنگ آزادی کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہونے لگی اور ساتھ ہی ملک میں فرقہ واریت کا زہر اور علاحدگی کے رجحانات بھی فروغ پانے لگے۔ ادھر جامعہ ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہوگیا تھا اور اس کی جوبلی کا جشن منانے کے لیے نومبر 1946 کا وقت طے کیا جاچکا تھا جس کے لیے ملک کے بیشتر مقامات سے مالی امداد اور چندے کی کوششیں ہورہی تھیں چنانچہ 15 نومبر 1946 کو جامعہ کی جوبلی تقریبات کا آغاز ہوا، اور اس کے خاص دن 17 نومبر 1946 کو کانگریس اور لیگ کے سربرآوردہ قائدین ایک ہی ڈائس پر موجود تھے اور یہ صرف ذاکر صاحب کے اتحاد پسند مزاج، صلح کل طبیعت اور جمہوری انداز نظر کے سبب ہی تھا۔ 1946 میں ہی عارضی حکومت کے قیام کے وقت ذاکر صاحب کو وزارت میں دعوت دی گئی تو انھوں نے انکار کردیا اور جب عارضی حکومت کا تجربہ ناکام ہوا اور 15 اگست 1947 کو ملک آزاد ہوا تو جامعہ میں آزادی کی

تقریبات قومی وقار کے ساتھ منائی گئیں انھیں دنوں ذاکر صاحب شدید علالت کے سبب اپنے ڈاکٹروں کے مشورے سے کشمیر روانہ ہوئے تو جالندھر کے اسٹیشن پر فسادیوں نے انھیں ٹرین سے اتار کر زدوکوب کیا اور بندوق کی نال ان کے سینے پر رکھ دی، کچھ لوگوں کے پہچان لینے کی وجہ سے جان تو بچ گئی لیکن سامان سب لٹ گیا جب وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر دہلی آئے تو شہر فسادات کے شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا اور مسلمانوں کا کشت وخون کیا جارہا تھا ان حالات میں جامعہ اور اہل جامعہ کو بھی شدید خطرے تھے، ذاکر صاحب نے ایسے عالم میں مظلومین کی مردانہ وار خدمت کی جو 1947 کے ہولناک دنوں کی تاریخ میں یادگار ہے۔

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی وجہ سے جس تباہی و بربادی سے ملک وقوم کو گزرنا پڑا وہ تو اپنی جگہ، لیکن اس کی سب سے شدید ضرب ہندوستان کے قومی تعلیمی اداروں پر پڑی اور اس کا سب سے بڑا نشانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بننے کا خطرہ پیدا ہوگیا، اس کو طرح طرح سے مطعون کیا جانے لگا اور اس پر بڑی نظریں پڑنے لگیں اور خدشہ اس بات کا تھا کہ کہیں یہ ادارہ حالات کا شکار نہ ہوجائے اور کہیں اس کے سربراہ احساس کمتری کا شکار ہوکر اس سے ہاتھ نہ اٹھالیں چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما سے اس آڑے وقت میں ذاکر صاحب یونیورسٹی کی دست گیری کے لیے آگے بڑھے اور 1948 میں بحیثیت وائس چانسلر علی گڑھ پہنچ کر اہم ذمہ داری سنبھالی۔

ذاکر صاحب کا علی گڑھ کا دور (1948 تا 1956) اپنی جگہ تعمیری اعتبار سے بڑا تابناک اور تاریخی ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے دفتر درکار ہے لیکن اختصار کے ساتھ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ذاکر صاحب کے علی گڑھ آجانے کے بعد وہ خطرے ٹل گئے تھے جن سے علی گڑھ دوچار تھا وہ شبہات اور شکوک دور ہونے لگے تھے جنھوں نے علی گڑھ کو گھیر لیا تھا زندگی نئی فضاؤں میں پھر نظر آنے لگی تھی اور کارواں پھر چل پڑا تھا۔ اس برے وقت میں ذاکر صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے ایک بڑا سہارا بنی اور علی گڑھ کو وہ سب کچھ ملنے لگا جس سے اس کے محروم ہوجانے کا خوف تھا۔ ذاکر صاحب کے دم سے وہ غلط فہمیاں دور ہوئیں جو علی گڑھ، علی گڑھ قوم اور علی گڑھ یونیورسٹی سے متعلق علی گڑھ کے بدخواہوں میں موجود تھیں۔ ذاکر صاحب کا دور وائس چانسلری ایک اعتبار سے یونیورسٹی کے لیے نئی زندگی کا دور ہے، تعمیری دور ہے اصلاحی دور ہے اور قوم کے کارواں کو مسلسل آگے بڑھاتے رہنے کا دور ہے۔ اس کا اگر صحیح اندازہ لگانا مقصود ہے تو اس دور کی تاریخ کے اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھنے سے ہر شے واضح اور روشن نظر آسکتی ہے، اپنی وائس چانسلری کے دور میں ہی وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر تھے اور انھوں نے اپنی رہنمائی میں اردو والوں کے پچاس ساٹھ لاکھ دستخط اس دور کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کو پیش کیے تھے۔

1956 میں کچھ ناموافق حالات کے تحت اور اپنی دوسری ٹرم ختم کرنے سے کچھ قبل ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہونا چاہا تو انھیں اپنی ٹرم تک رہنے کے لیے کہا گیا لیکن وہ مصر رہے اور خرابی صحت اور علالت کی وجہ کا اظہار کرکے سبکدوش ہوئے اور پھر کچھ دنوں آرام کے بعد مولانا آزاد کی خواہش پر یونسکو کانفرنس میں شریک ہوئے وہاں سے پیرس اور پھر جرمنی چلے گئے اسی دوران اپنے علاج کی طرف بھی متوجہ ہوئے ابھی وہ جرمنی سے سوئزرلینڈ ہی پہنچے کہ انھیں پنڈت نہرو کا پیغام ملا کہ جلد وطن لوٹو اور بہار کی گورنری سنبھالو چنانچہ ہندوستان لوٹ کر انھوں نے گورنر بہار کی حیثیت سے جولائی 1957 میں چارج لیا اور پانچ سال

اس عہدے پر متمکن رہ کر بہار کی کایا پلٹ دی ایسے سرکاری و غیر سرکاری، علمی و ادبی، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی کام انجام دیے کہ بہار کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے اور جب تک بہار میں ایک منتظم اعلا کے طور پر رہے وہاں کی حکومت کو استحکام حاصل رہا، اصلاحات کا کام برابر جاری رہا، بہار کے تمام طبقے ان کی کارکردگی، حسنِ انتظام اور کارناموں سے اس قدر خوش تھے کہ آج تک 1957 تا 1962 کا زمانہ یاد کرتے ہیں۔

1962 میں ذاکر صاحب کی گورنری ختم ہوئی اور ادھر 1962 میں جنرل الیکشن کے نتیجے میں کانگریس کو ایک بار پھر غالب اکثریت حاصل ہوئی اور اس دوران ان کی صحت بھی بہت بہتر ہو چکی تھی تو پنڈت نہرو کی تحریک پر کانگریس کے جہاں ڈاکٹر رادھا کرشنن کو صدارت کے لیے نامزد کیا وہاں ذاکر صاحب کا نام نائب صدر جمہوریۂ ہند کے طور پر تجویز کیا۔ 7 مئی 1962 کو ذاکر صاحب کا الیکشن ہوا اور وہ نائب صدر جمہوریہ چن لیے گئے اور انھوں نے اپنے دورِ نائب صدارت میں راجیہ سبھا کی صدارت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے کر اسے بھی یادگار بنا دیا، علاوہ ازیں وہ فرائض جو نائب صدر کو انجام دینے ہوتے ہیں مثلاً تقریبات کا افتتاح، صدارتیں، اجرا کی رسمیں، عظیم بیرونی مہمانوں کا خیر مقدم، بیرونی ملکوں کے دورے، صدر کی غیر حاضری میں صدر کے فرائض کی انجام دہی حکومت کی نمائندگی، کانفرنسوں میں شرکت کنووکیشنوں کے ایڈریس وغیرہ پڑھنا یہ سب کام بھی بڑی خوش اسلوبی اور بڑی دل چسپی کے ساتھ انجام دیے۔ افریقی اور عرب ممالک سے گہرے تعلقات قائم کرانے، معاہدے کرانے اور تمام سرکاری ذمہ داریوں کو نہایت اچھے انداز سے نبھانے میں ذاکر صاحب نے ایک تاریخی رول ادا کر کے ملک کے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

ان کی غیر معمولی فرض شناسی، کارکردگی اور مقبولیت کی وجہ سے اب ملک و قوم کی نگاہیں ان پر صدر جمہوریۂ ہند کی صدارت کا بوجھ ڈالنے کے لیے اٹھ رہی تھیں۔ ہر چند کہ ملک کی سیاسی صورت حال کافی تبدیل ہو چکی تھی اور کانگریس کے اندر اور باہر زبردست انقلاب رونما ہو چکا تھا لیکن شریمتی اندرا گاندھی کی تحریک اور ان کے سینئر کانگریسی ساتھیوں کی تائید پر جب ذاکر صاحب کو صدارت کے لیے نامزد کیا گیا تو اگر ایک طرف ملک میں خوشی و مسرت کا اظہار کیا گیا تو دوسری طرف فرقہ پرستوں کی صفوں میں ماتم کی فضا چھا گئی اور فرقہ پرستی نت نئے روپ بدل کر ظاہر ہوئی پھر بھی جیت سیکولرازم اور جمہوریت کی ہوئی، ذاکر صاحب 9 مئی 1967 کو صدر جمہوریۂ ہند منتخب ہوئے اور 13 مئی 1967 کو انھوں نے صدارتی ذمہ داریاں سنبھالیں اور جمہوری طاقتوں میں ملک و بیرون ملک اس پر زبردست خوشی کا اظہار کیا گیا، دنیا کی عظیم جمہوریت کا یہ عظیم عہدہ سنبھالنے کے بعد انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ نہایت پر اثر اور متاثر کن تھی جس کا لب لباب یہ ہے:

''سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے باشندے میرا کنبہ، عوام نے کچھ عرصے کے لیے مجھے اس کنبے کا سربراہ منتخب کیا ہے۔ میں سچی لگن سے اس گھر کو مستحکم اور خوب صورت بنانے کی کوشش کروں گا تا کہ یہ گھر ان عظیم لوگوں کے شایان شان بن سکے جو انصاف، خوش حالی اور شائستگی کی بنیادوں پر زندگی سنوارنے میں لگے ہیں۔''

انھوں نے اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت بھی کر دیا کہ

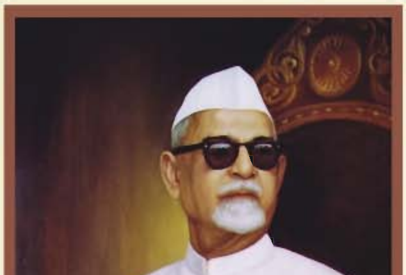

سارا ہندوستان واقعی ان کا گھر ہے اور اس کے باشندے ان کا کنبہ اور وہ اس کنبے کے سچے اور حقیقی سربراہ ہیں۔ یوں تو انھوں نے اپنی ہر ذمے داری کو نبھانے کے لیے ہمیشہ فرض شناسی کا خیال رکھا لیکن اس عہدۂ جلیلہ کی عظمت کو چار چاند لگانے کے لیے وہ ہمہ وقت سرگرم و مصروف رہے اور اپنی شخصیت و خدمت سے انھوں نے ملک و قوم کی بھلائی کے لیے جو یادگار کارنامے انجام دیے اور ہندوستان کی سیکولر و جمہوری اقدار کو مستحکم بنانے کے لیے جو سعی و جدوجہد کی وہ ان کے دور صدارت کی ایک ایسی داستان ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی صدارت ہی کے دور میں انھوں نے غالب صدی کو تاریخی اور یادگار طور پر منانے کا سامان پیدا کر کے پوری دنیا میں غالب کا ڈنکا بجایا تھا، آخر وہ وقت آ پہنچا جو ہر ایک کے لیے مقرر ہے۔ چند روز پہلے ہی وہ ملک کے دورے سے واپس ہوئے تھے، ڈاکٹروں نے انھیں ایک ہفتے آرام کا مشورہ دیا تھا امید تھی کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد اپنا کام شروع کر دیں گے۔ 3 مئی 1969 کو وہ حسب معمول صبح چھ بجے اٹھے، انھوں نے وقت مقررہ پر ایک گلاس دودھ پیا پھر کچھ کاغذات وغیرہ دیکھے اور پھر کسی ایسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئے جسے وہ گزشتہ رات دیر تک پڑھتے رہے تھے، تقریباً گیارہ بجے ڈاکٹر ان کے معائنے کو آئے اس کے کچھ دیر بعد وہ غسل خانے میں گئے اور جب خلاف معمول انھیں زیادہ وقت ہوا تو ان کے خدمت گار اسحاق نے آواز دی، جواب نہ ملنے پر دروازہ کھٹکھٹایا۔ بالکل خاموشی پر دوسری طرف سے دروازہ کھولا گیا تو انھیں فرش پر گرا ہوا پایا، ڈاکٹروں نے پہنچ کر انھیں ہوش میں لانے کی پوری کوشش کی لیکن سب بے سود، آخر گیارہ بج کر 5 منٹ پر ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ ذاکر صاحب خدا کو پیارے ہو گئے گویا کہ آفتاب اپنی تابانیاں دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا۔ ذاکر صاحب ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ اس خبر سے ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی صف ماتم بچھ گئی تھی، سارا ماحول غم و اندوہ میں ڈوب گیا تھا، ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ دو روز تک راشٹرپتی بھون کے دربار ہال میں ان کا جسد خاکی آخری دیدار کے لیے لا کر رکھ دیا گیا تھا، لاکھوں انسانوں نے ان پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے۔ ہر مذہب و ملت کے پیشواؤں نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا، مقدس مذہبی کتابوں کی تلاوت اور پاٹھ ہوئے اور سب نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے دلی احترام کا اظہار کیا۔

پورے قومی و سرکاری اعزاز کے ساتھ 5 مئی 1969 کو ان کا جنازہ توپ گاڑی پر رکھ کر جامعہ لے جایا گیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کے لیے وہ زندگی بھر جدوجہد میں لگے رہے جس کی تعمیر و ترقی کے خواب عمر بھر دیکھتے رہے جس کے آدرشوں کو بنانے میں انھوں نے اپنے فکر و عمل اور کردار کے ذریعے جہاد مسلسل کیا جس کو اپنے خون سے سینچا اور جس کی آبیاری کے لیے اپنے جسم و جان کھپا دیے ان کا جسد خاکی آج اسی کی خاک کے سپرد کر دیا گیا اور ذاکر صاحب کی زندگی کا وہ سفر جو 8 فروری 1897 میں شروع ہوا تھا۔ 3 مئی 1969 کو پورے 72 سال کی جدوجہد، ایثار، تپ، تیاگ، وطن پرستی اور انسان دوستی سے بھری داستان بیان کرتا ہوا اپنی کامیابی کی بلندیوں پر ختم ہوا اور ہر طرف سے ایک ہی آواز آئی:

کارواں خوابوں کا تیرے روز و شب جاری رہے
تا ابد تیری لحد پر رحمتِ باری رہے

■

ماخذ: ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار، مرتبہ: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، دوسری طباعت: 2011، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سلیم قدوائی

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت

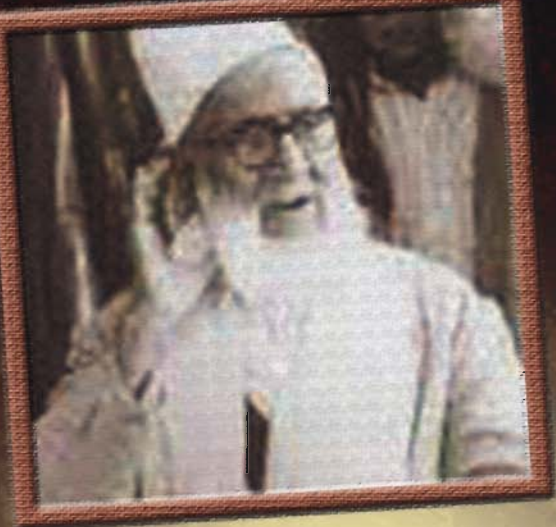

مولانا عبدالماجد دریابادی سے خط و کتابت کی روشنی میں

(پیدائش: 8 فروری، 1897 وفات: 3 مئی 1969)

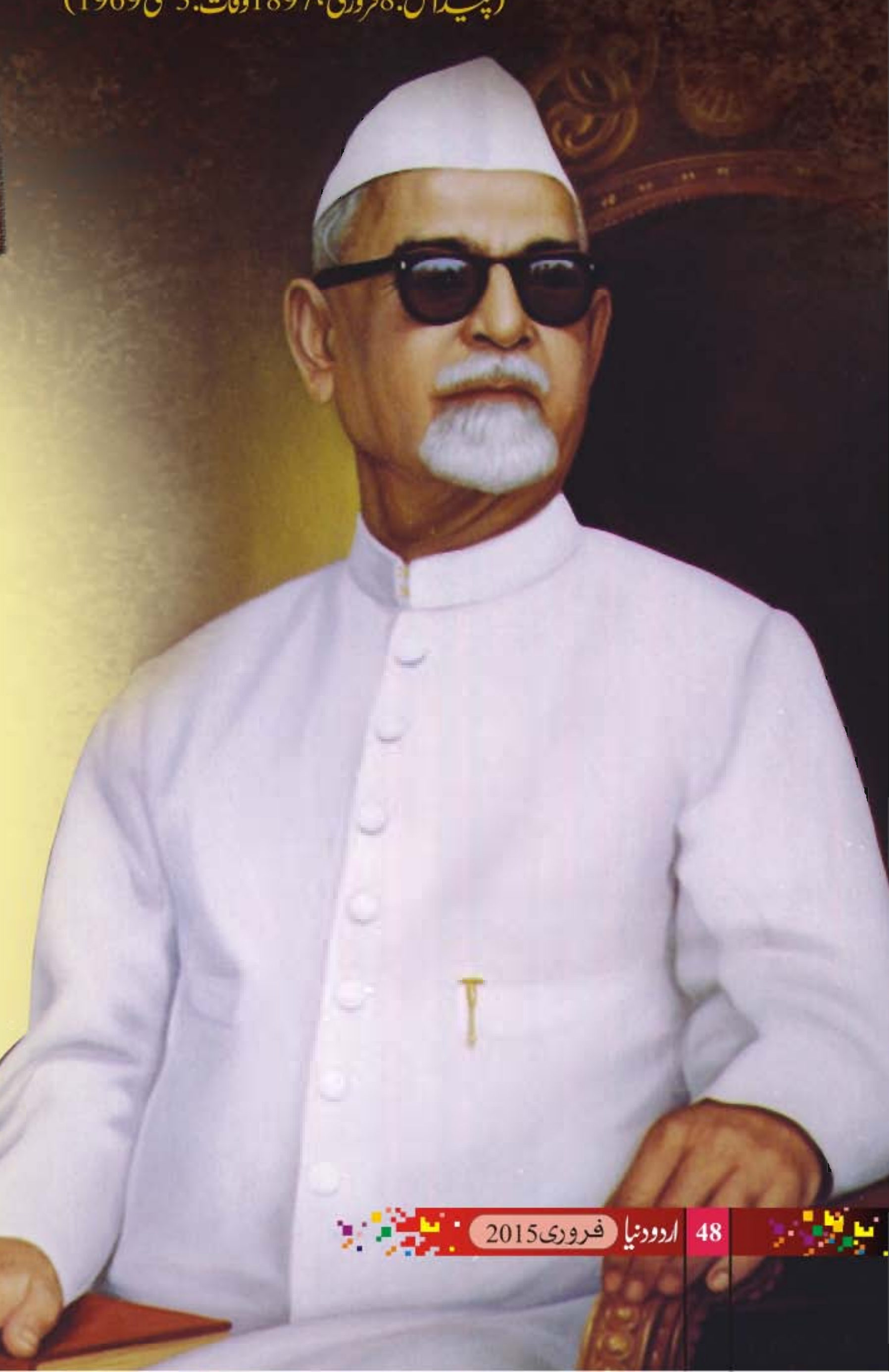

صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کا حلقۂ احباب نہایت وسیع تھا اور اس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی نمایاں ہستیاں شامل تھیں۔ وہ تعلقات نبھانے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ علمی و ادبی اور صحافتی مصروفیات کے باوجود وہ اپنے احباب سے مستقل رابطہ رکھتے تھے اور ان کے معمولات میں 'نصف ملاقات' کے لیے بھی وقت مقرر تھا۔ خط و کتابت وہ کثرت سے کرتے تھے۔ ان کے خاص احباب میں ایک اہم نام ڈاکٹر ذاکر حسین کا بھی تھا۔ زیر مضمون میں ان دونوں شخصیتوں کے درمیان ہوئی مراسلت کی روشنی میں ان کے باہمی تعلقات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ 45 سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ پہلا خط 1925 کا ہے اور آخری خط 1969 کا ہے۔ اکثر خطوط محض خیر و عافیت، شکریہ یا مبارکباد تک محدود نہیں بلکہ مختلف موضوعات و مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی صحبت کو پسند کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جامعہ کے پرنسپل کی حیثیت سے ذاکر صاحب مولانا دریابادی کو برابر دہلی آنے اور جامعہ میں قیام کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں ''آپ دہلی تو تشریف لاتے رہتے ہیں۔ اگر کسی مرتبہ کچھ وقت نکال کر جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنی نصائح سے مستفیض فرمائیں تو عین عنایت ہوگی۔''[1] ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں ''آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا بے حد جی چاہتا ہے۔ صحیح صورت اس کی یہی ہے کہ

حاضر خدمت ہوں اور یہ سعادت حاصل کروں لیکن اس میں خود غرضی ہوگی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں اور سب جامعہ والے کچھ روز آپ کی صحبت سے فیضیاب ہوسکیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ آپ کو تکلیف دیں اور یہاں چند روز کے قیام کے لیے آمادہ کریں۔ کیا یہ معلوم ہوسکے گا کہ آپ کو کس زمانے میں مقابلتاً فرصت رہتی ہے۔" [2] ایک اور خط میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں "اگر کسی موقعے پر یہ صورت نکل سکے کہ آپ چند روز جامعہ کے کسی اقامت گاہ میں تشریف رکھیں تو ہم سب کو اور طلبہ کو صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملے گا اور جس کام کو اس وقت نہایت ناقص طور پر انجام دے رہے ہیں۔ شاید آپ کی توجہ اور مدد سے اسے کچھ بہتر کرسکیں۔" [3] مولانا دریابادی اپنی بے پناہ مصروفیات اور کم سفر کرنے کے باعث ذاکر صاحب کے ان دعوت ناموں کو قبول نہ کرسکے۔ لیکن جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر بنے اور انھوں نے مولانا کو راج بھون میں ٹھہرنے کی دعوت دی تو وہ وقت نکال کر چند روز کے لیے پٹنہ گئے اور نہایت خوشگوار تاثر لے کر واپس آئے۔ ذاکر صاحب نے مولانا دریابادی کے مبارکباد کے خط کے جواب میں ان کو مدعو کرتے ہوئے لکھا [4] "پٹنہ ضرور تشریف لائیے۔ آئیے اور یہیں میرے ساتھ ہی قیام فرمائیے۔ راج بھون میں فقیروں کو ہی رہنا چاہیے۔" مولانا دریابادی نے دعوت نامہ قبول کرتے ہوئے لکھا 'دعوت فخر و مسرت سے قبول کرتا ہوں بشرطیکہ آپ اس کا وعدہ فرمائیں کہ میری وجہ سے (1) آپ ہرگز کسی سرکاری مصروفیت میں فرق نہ آنے دیں۔ (2) کوئی ایسی بات نہ کرگزریں جو آپ کے موجودہ جاہ و منصب سے فروتر سمجھی جائے۔" [5] مولانا دریابادی کا پروگرام طے ہوجانے کے بعد ذاکر صاحب نے لکھا "4 اگست کو چشم براہ رہوں گا۔ تینوں دن سواری کا انتظام رہے گا۔ میری مصروفیات کا ذرا خیال نہ فرمائیے۔ آپ کے ساتھ کچھ وقت گزار سکنے سے بہتر مصروفیت کہاں سے لاؤں گا۔" [7] غرضیکہ مولانا دریابادی نے اس سفر کے لیے تین دن کا وقت نکالا اور سفر بہار میں ذاکر صاحب کی میزبانی اور سادگی سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اپنے سفرنامے میں ایک مثالی میزبان قرار دیا۔

ذاکر صاحب نے نائب صدر جمہوریہ بننے کے بعد بھی مولانا دریابادی کو دہلی آنے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی۔ مبارکباد کے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا "دہلی ضرور تشریف لائیے لیکن اگر سردیوں میں تشریف لائیں تو بہتر ہو۔ آج کل موسم بہت خراب ہے اور میں ابھی ٹھیک سے جما بھی نہیں ہوں۔" [6] ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میں جولائی کے پہلے ہفتے میں دہلی میں نہیں ہوں گا لیکن 8 جولائی کے بعد سے ان شاء اللہ یہیں ہوں گا۔ آپ ضرور تشریف لائیں۔ ہر چند کہ آپ کے آرام کا فوراً انتظام نہ کرسکوں گا۔ میرے ساتھ ہی قیام فرمائیں تو بڑی ذاکر نوازی ہوگی۔" [7] مولانا دریابادی کا پروگرام طے ہوجانے کی اطلاع پاکر ذاکر صاحب نے لکھا "17 اگست کا انتظار رہے گا۔ ایک ایک دن گنوں گا۔ آئیے اور ضرور آئیے۔ آپ نے تشریف لانے کی بشارت کے ساتھ پروگرام منسوخ ہوسکنے کا اندیشہ کیوں پیدا کردیا۔ کیا اس میں خوف و رجا کی درمیانی کیفیت پیدا کرنے کا تعلیمی نکتہ مضمر ہے؟ آپ نہ آئے تو بڑی مایوسی ہوگی۔ ملے ہوئے مدتیں گزر گئیں۔" [8] غرضیکہ اگست 1963 میں مولانا دریابادی نے دہلی کا سفر کیا اور ذاکر صاحب کے یہاں قیام فرما کر وعدے کو پورا کیا۔ وہ ذاکر صاحب کی میزبانی سے بہت

ذاکر صاحب نے نائب صدر جمہوریہ بننے کے بعد بھی مولانا دریابادی کو دہلی آنے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی۔ مبارکباد کے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا "دہلی ضرور تشریف لائیے لیکن اگر سردیوں میں تشریف لائیں تو بہتر ہو۔ آج کل موسم بہت خراب ہے اور میں ابھی ٹھیک سے جما بھی نہیں ہوں۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میں جولائی کے پہلے ہفتے میں دہلی میں نہیں ہوں گا لیکن 8 جولائی کے بعد سے ان شاء اللہ یہیں ہوں گا۔ آپ ضرور تشریف لائیں۔ ہر چند کہ آپ کے آرام کا فوراً انتظام نہ کرسکوں گا۔ میرے ساتھ ہی قیام فرمائیں تو بڑی ذاکر نوازی ہوگی۔

خوش واپس آئے جس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا "سراپا سپاس بن کر واپس پہنچا۔" [9] اس کے جواب میں ذاکر صاحب نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا "آپ کے ساتھ جو وقت گزر سکا اسے اپنے لیے سعادت جانتا ہوں۔ کاش ایسے مواقع جلد جلد ملتے۔" [10] 1967 میں مولانا کو عربی اسکالر کی سند اعزاز صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے عطا کی۔ اس سفر میں بھی وہ ذاکر صاحب کے اصرار پر ان کے مہمان رہے اور یہ خوشگوار ملاقات دونوں فاضلوں کے درمیان آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ ذاکر صاحب جب جامعہ کے پرنسپل تھے جولائی 1929 میں مولانا سے ملنے دریاباد گئے تھے۔ اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے لکھا "دیکھیے وقت کیسے گزرتا ہے۔ دریاباد حاضر ہوئے 32 برس ہوگئے۔ ایسا لگتا ہے کہ کل کی بات ہو۔" [11]

ذاکر صاحب مولانا کے علمی و ادبی کارناموں کے قائل و معترف تھے اور ان کی تحریریں شوق اور دلچسپی سے پڑھتے تھے خاص طور سے ان کی تفسیر اور ترجمہ قرآن۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "گرامی نامہ بھی ملا اور پہلے پارے کا ترجمہ بھی۔ یاد فرمائی اور کرم کا شکریہ کسی طرح ادا کروں۔ شاید اس طرح کچھ ادا ہوسکے کہ ترجمے کو بار بار پڑھوں اور اس سے کتاب مبین کے سمجھنے میں مدد لوں۔ پارے کے ملتے ہی کہیں کہیں سے اسے پڑھا۔ مجھے ترجمہ بہت اچھا معلوم ہوا۔ ان شاء اللہ غور سے پڑھوں گا اور حسب ارشاد اپنے تاثرات کو لکھوں گا بھی۔" [12] ایک دوسرے خط میں ذاکر صاحب نے لکھا "قرآن کے پہلے پارہ کا ترجمہ میں نے غور سے پڑھا تھا۔ رائے دینے کا اہل تو نہیں ہوں، لیکن مجھے ترجمہ بہت پسند آیا اور نوٹ بھی۔ اس پر کچھ لکھنا بھی چاہتا تھا لیکن کاغذ کی دقتوں کے باعث رسالہ 'جامعہ' بند ہوگیا اس لیے کچھ نہ لکھ سکا۔ اب کھلے تو کچھ لکھوں۔" [13] تفسیر قرآن کے سلسلے میں ایک دوسرے خط میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں "تفسیر جستہ جستہ دیکھی۔ اس میں بہت سی وہ باتیں پائیں جو اور جگہ نہیں ملتیں۔ خدا خدمت دین میں آپ کی مساعی جمیل کو مقبول و مشکور فرمائے۔" [14] ایک اور خط میں جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ کے بلند منصب پر فائز ہوچکے تھے، تفسیر کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "تفسیر کی پہلی جلد مجھے مل گئی۔ پچھلے دنوں سفر بہت کڑا پڑا اور مصروفیت بھی بہت رہی اس لیے اسے دیر میں پڑھ پایا۔ میرے خیال میں یہ اس دور کی اعلیٰ ترین دینی خدمات میں شمار کی جائے گی۔" [15]

تفسیر قرآن کے علاوہ ذاکر صاحب مولانا کی دیگر تصانیف کو بھی بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے اور قدرداں تھے۔ مثال کے طور پر ایک خط میں لکھتے ہیں 'قصص و مسائل' [16] سفر میں ساتھ لے گیا تھا۔ پوری کتاب پڑھی۔ بعض حصے دوبارہ۔ خوب ہے اور بہت خوب۔ رسالہ جامعہ کے مدیر صاحب کو بھیجتا ہوں تا کہ اس پر ریویو کا اہتمام کریں۔" [17] دو دیگر تصنیفات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے لکھا "حیوانات [18] اور مقامات [19] سے متعلق دونوں رسالے دیکھ لیے ہیں۔ بہت ہی مفید تحقیق ہے۔ [20] مکتوباتِ سلیمانی یعنی سید سلیمان ندوی کے مولانا کے نام خطوط پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے لکھا "مکتوبات از اول تا آخر پڑھے۔ بہت ہی بھولی ہوئی چیزیں یاد آئیں۔ مولانا آزاد کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں ان پر سنا ہے بعض لوگ برہم ہیں۔ برہمی کی کچھ ایسی بات تو نہیں۔ آپ نے تو اس بات میں اپنا مسلک شروع ہی میں صاف کردیا ہے۔" [21]

ذاکر صاحب مولانا کو اپنا مخلص بزرگ تصور کرتے تھے اور ان کی دعاؤں اور نیک خواہشات کے ہمیشہ طالب رہتے تھے۔ مثال کے طور پر گورنر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ذاکر صاحب مولانا کو لکھتے ہیں ''جی ہاں چارج لے لیا۔ آپ بزرگوں کی دعائیں جو نہ کرادیں کم ہیں۔ اپنی نااہلی کا پورا احساس رکھتا ہوں۔ لیکن اب کہ یہ ذمے داری اپنے سر لے لی ہے، دعا کرتا ہوں اور دعا کا طالب ہوں کہ بے آبروئی نہ ہو۔ دعا کیجیے کہ راج بھون میں فقیر و درویش کی طرح دن کاٹ دوں۔''[22] بعد میں جب ذاکر صاحب کا نام نائب صدر جمہوریہ کے لیے چل رہا تھا تو مولانا دریابادی نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا ''خبر پڑھ کر بغیر کسی سابق ارادے کے معاًیہ دعا دل سے نکل کر زبان پر آئی کہ الٰہی اگر تیرے علم میں اس میں خیر و برکت اس ذات کے لیے بھی ہے تو ضرور اس آوازِ خلق کو نقارہ خدا بنا دے۔''[23] اس کے جواب میں ذاکر صاحب نے لکھا ''آپ کی دعا سے خیال ہوتا ہے کہ شاید خبر صحیح ہوجائے۔''[24] ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ''آپ نے دعا قبول ہونے کے متعلق جو لکھا ہے اس سے جی بھر آیا۔ وہ تو ہم جیسے گناہ گاروں کی سن لیتا ہے، اپنے ایک مقبول بندہ کی کیو ں نہ سنے گا اور جب نہ سننے کی صورت میں اس سے بڑے انعام کا آسرا نکل آئے تو پھر کیا کہنا۔''[25] نائب صدر منتخب ہونے کے بعد ذاکر صاحب نے لکھا ''آپ نے بھی بزرگانہ شفقت کے ساتھ مبارکباد دی ہے اس کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ گرامی نامہ کو اپنا انعام جانتا ہوں۔ دعا فرمائیے کہ میں اس کا اہل ثابت ہوں۔''[26] ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ''آپ سے دعا کا طالب ہوں کہ فرائض کے ادا کرنے کی توفیق ارزانی ہو اور خاتمہ بالخیر ہوجائے۔''[27] اس کے بعد جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہوئے تو مولانا کی مبارکباد کے جواب میں لکھا ''آپ بزرگوں کی دعاؤں سے یہ منصب نصیب ہوتا ہے آپ ہی کی دعاؤں سے شاید اس کے فرائض کو کماحقہ ادا کرسکوں۔ یقین ہے کہ ان سے محروم نہ رہوں گا اور اگر یہ انعام ہے تو اس کا مستحق بنوں گا، آزمائش ہے تو اس میں پورا اتروں گا۔''[28]

خطوط کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دونوں شخصیتوں کے درمیان اتنی ہم آہنگی پائی جاتی تھی کہ وہ مختلف کاموں کے سلسلے میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔

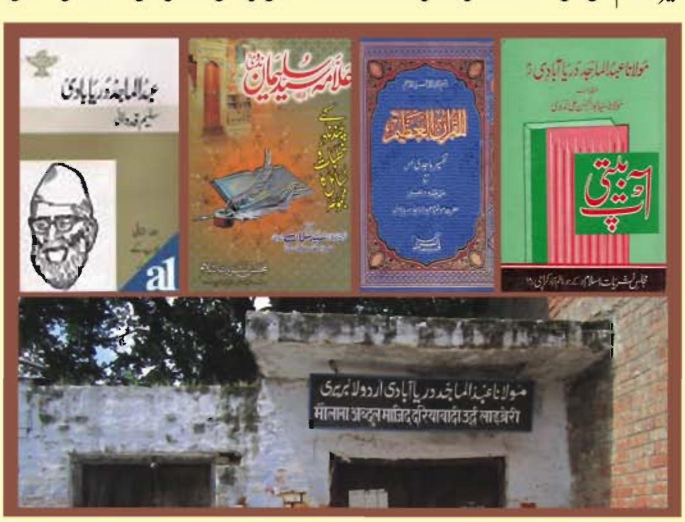

مثال کے طور پر جب مولانا نے خواہش کی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈاکٹر اقبال اور سید سلیمان ندوی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کرے تو انھوں نے ذاکر صاحب سے اس سلسلے میں تعاون چاہا اور ذاکر صاحب نے جواب میں لکھا ''مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق ہے۔ ڈاکٹر اقبال اور سید صاحب کو اعزازی سند دینا مسلم یونیورسٹی کے لیے عزت کا باعث ہوگا۔ لیکن ابھی دو اکابر کو سندیں دی جاچکی ہیں۔ اگر کچھ تھوڑا سا فصل ہوجائے تو اچھا ہے، بہرحال آپ جب تجویز پیش کرنا چاہیں۔ میری تائید حاضر ہے۔''[29] اس طرح مولانا دریابادی ذاکر صاحب کو علمی وادبی اداروں سے وابستہ کرنے میں گہری دلچسپی رکھتے تھے مثال کے طور پر دارالمصنّفین اعظم گڑھ اور ہندوستانی اکادمی، مولانا نے دارالمصنّفین کی مجلس انتظامی میں شرکت کے لیے ذاکر صاحب کے نام کی تحریک کی اور وہ اس کے رکن مقرر بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں ''دارالمصنّفین کی مجلس انتظامی میں شرکت میرے لیے باعث عزت افزائی ہے۔ منظور کیسے نہ کروں گا لیکن آپ نے مجھے اس کے قابل کیوں سمجھا؟ محبت کی عیب پوشی کا کرشمہ ہوگا۔''[30] اس طرح ہندوستانی اکادمی کے اعزازی فیلو کے لیے بھی مولانا دریابادی نے ذاکر صاحب کا نام پیش کیا۔ چنانچہ ایک خط میں مولانا دریابادی لکھتے ہیں ''ہندوستانی اکادمی چھ اعزازی فیلوز کا انتخاب کر رہی ہے ملک کے مشاہیر علم وادب میں سے میں نے ایک نام آپ کا پیش کر دیا ہے۔ جسٹس ملا ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ کے ساتھ گو یقین نہیں کہ ہندی والے ان ناموں کو کامیاب ہونے دیں گے تاہم اگر آپ منتخب ہوگئے تو براہِ کرم قبول فرما لیجیے گا۔''[31] اس کے جواب میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں ''آپ نے اعزازی فیلوز میں میرا نام تجویز فرمایا ہے یہ آپ کی ذاکر نوازی ہے۔ میرا رشتہ تو علم وادب سے اگر ہے تو بہت دور کا ہوگا۔ اکادمی والے مجھے کیوں منتخب کرنے لگے لیکن اگر انھوں نے منتخب کیا تو آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''[32]

ایک زمانے میں مولانا کو جرمن زبان سیکھنے کا شوق ہوا تو انھوں نے اس سلسلے میں ذاکر صاحب سے رجوع فرمایا۔ ذاکر صاحب نے جواب میں لکھا ''آپ نے جرمن زبان سیکھنے کا قصد فرمایا خوب کیا۔ آپ جیسے فاضل کے لیے تھوڑی سی توجہ سے ایک نئی ذہنی دنیا کا یہ دروازہ کھل جائے گا اور اردو والوں اور جرمن والوں دونوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔''[33] اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے مناسب رہنمائی کی اور مولانا دریابادی نے جرمن کی مشق کاپیاں اصلاح کے لیے ذاکر صاحب کو بھیجیں۔ ان کو پا کر ذاکر صاحب نے لکھا ''آپ کی جرمن مشقیں دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ جرمن صحیح لکھنا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن آپ نے تو ان مشقوں میں بہت کم غلطیاں کی ہیں۔ اب تو آپ غالباً مسلسل عبارت لکھتے ہوں گے . . . آپ جرمن اس تیزی سے سیکھ رہے ہیں اور میں بدنصیب نہ جانے کب سے چاہتا ہوں کہ کچھ عربی پڑھ لوں اور اس کی نوبت نہیں آئی۔ اور کسی نئی چیز کا سیکھنا تو درکنار جو پڑھا لکھا تھا وہ بھی سب بھلا دیا ہوں۔ مگر کیا کیجیے اپنی اپنی قسمت۔''[34]

اس طور مولانا کی تفسیر کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں بھی ذاکر صاحب کے تعاون کا پتہ ان خطوط سے چلتا ہے مثال کے طور پر ایک خط میں لکھتے ہیں ''اردو تفسیر کے دوسرے ایڈیشن پر آپ کا نوٹ پڑھا۔ ضرور شائع کرائیے اور اگر یہیں چھپوانے کا فیصلہ کیجیے تو مجھے بھی مطلع فرما دیجیے گا اور اس کارِ خیر میں مجھے بھی شرکت کا موقع دیجیے گا۔''[35] ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ''جس کام کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے وہ نہایت مہتم بالشان کام ہے۔ میں ضرور اس کا خیال رکھوں گا اور جب بھی کہیں موقع ہوگا اس کے لیے کوشش کروں گا۔''[36] اس موضوع پر ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''میں نے چاہا تھا کہ اپنے پاس سے مبلغ ایک ہزار روپیہ اگلی اشاعت کے مصارف میں شرکت کرنے کے لیے بھیج دوں مگر یہ اتنی قلیل رقم تھی کہ جھجکتا رہا۔ آج آپ کا نوازش نامہ ملا کہ اگلی اشاعت کا انتظام ہوگیا۔ الحمدللہ لیکن میں نے جو نیت کی تھی وہ آپ پر ظاہر کردی۔ اگر آپ مجھے اس کارِ خیر میں شرکت کا شرف دینا گوارا فرمائیں تو تحریر فرما دیں رقم فوراً ارسال خدمت کردوں گا۔ کویت وغیرہ سے میرا کچھ کہنا اپنے منصب کی وجہ سے غیر مناسب رہے گا مگر اب شکر ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں

رہی۔ [37]اس طرح مولانا کی انگریزی تفسیر کے سلسلے میں بھی ذاکر صاحب نے گہری دلچسپی لی۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''چند روز ہوئے کولا مپور (ملایا) سے ایک صاحب احمد داؤد جی دادا بھائی کا ایک خط آیا ہے جس میں انھوں نے مجھ سے چاہا ہے کہ آپ کی ''ذات اور علمی قابلیت اور ترجمہ قرآن کے متعلق تعارف قدردانی وقدر شناسی کے طور پر پرزور اور موثر الفاظ میں تصدیق وشہادت کے طور پر پانچ عدد نسخے انگریزی زبان میں تحریر کر کے انھیں بھیج دوں۔ وہ غالباً آپ کا ترجمہ قرآن شائع کرنا چاہتے ہیں۔ [37]رائے تو میری جو ہے اس کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا اور میں نہایت خوشی سے وہ رائے لکھ کر بھیج سکتا ہوں لیکن میں ان صاحب کو جانتا نہیں ہوں۔ اس لیے ان کو لکھنے سے پہلے آپ سے مشورہ کر لینا مناسب سمجھتا ہوں۔''[38] پھر ذاکر صاحب نے اپنی رائے انگریزی میں لکھ کر بھیجی جو بڑی مداحانہ تھی۔ اس کو پڑھ کر مولانا دریابادی نے لکھا ''اس انگریزی تحریر کے پڑھنے سے طبیعت رکی، ہمت کر کے پہلا فقرہ پڑھا اور پھر وہی آخری فقرہ رہا، ہمت جواب دے گئی ایک لفظ نہ پڑھ سکا۔ محض ایک عامی ہوں، مشرقی ہوں نہ شاعر کہ درمدح خود گوید کہہ کر تسلی کے مضامین باندھتا ہوں نہ کسی ملک کا فرماں روا کہ مدحیہ قصیدے سن کر خوش ہوتا رہتا ہوں۔ بہت چھوٹے ظرف کا ہوں۔ عرصہ دراز سے اپنی کتابوں پر تبصرے اس مد میں چھوڑ دیتا ہوں۔''[39]

اس سلسلۂ خط وکتابت کا اہم ترین خط وہ ہے جس میں ذاکر صاحب نے مولانا کی فرمائش اور اصرار پر 1947 کے پرآشوب دور میں جالندھر اسٹیشن پر ان کے ساتھ جو گزرا اس کی تفصیلات لکھی ہیں جو اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس تاریخی خط کو پا کر مولانا نے لکھا ''اتنے مفصل اور قدرتاً بڑے مکتوب کا دلی شکریہ۔ میں نے تو بہت ڈرتے ڈرتے عرض کیا تھا۔ یہ عریضہ محض ادائے سیاسی کے لیے ہے۔ انشاءاللہ اس کی اشاعت نہ کی جائے تاوقتیکہ آپ خود ہی اجازت نہ دے دیں۔''[40] ان خطوط کے مطالعے سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اس طویل مدت میں کئی ایسے مواقع بھی آئے جب مولانا نے اپنے اخبار اور خطوط کے ذریعے جامعہ سے متعلق کئی باتوں پر نکتہ چینی اور اعتراضات بھی کیے لیکن ایسے ہر موقعے پر ذاکر صاحب نے بڑے ظرف کا ثبوت دیا اور معذرت کر کے مولانا کو مطمئن بھی کیا۔ وہ مولانا کا بہت احترام کرتے تھے اور ان کے 'گلے' کو تنبیہ کا درجہ دیتے تھے۔ اپنی غلطی پر معافی کے طلب گار ہوتے اور یہ بھی اصرار کرتے کہ مولانا ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے رہیں اور ہدایت کی دعا بھی۔ مثال کے طور پر ایک خط میں لکھتے ہیں ''امید ہے اس واقعے سے جو ملال آپ کو ہوا ہے اسے آپ محو فرما دیں گے۔ اور ہمیں ہماری کوتاہیوں سے ایک سچے ہمدرد اور سرپرست کی طرح متنبہ فرماتے رہیں گے تاکہ بروقت ان کی اصلاح ہو جائے۔[41] ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ''آپ نے جو تنبیہ فرمادی اس پر میرا شکریہ قبول فرمایئے اور دعا فرمایئے کہ انھیں بہتر طریق پر انجام دینے کی توفیق عطا ہو۔'' ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''افسوس کہ ہماری طرف سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی ہے جس سے آپ کا دل دکھتا ہے۔ اگر آپ مجھے یا عابد صاحب کو ان خامیوں پر

متنبہ فرماتے رہیں تو ہم دونوں پوری کوشش کریں گے کہ پھر یہ غلطیاں سرزد نہ ہوں۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ذاکر صاحب کے جن خطوط کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں ذاکر صاحب کی جو شخصیت ابھر کر آئی ہے وہ ایک عجز وانکسار کا پیکر عاقبت کے لیے فکرمند اور فرائض کی ادائیگی کے لیے دعا کی طالب، اخلاقی قدروں کی پاسدار اور خدمت خلق سے سرشار ہے۔ دوسری طرف مولانا عبدالماجد دریابادی ذاکر صاحب کی شرافت، ذہانت، قابلیت اور سادگی کے بڑے معترف اور قائل نظر آتے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تعلقات اخلاص ویگانگت پر مبنی تھے۔ ان سے دونوں حضرات کے تعلقات کی شگفتگی اور خلوص پر ایک گونہ روشنی پڑتی ہے۔ ان سے محسوس ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب مولانا دریابادی کے نیازمندوں میں تھے اور ان کی معیت اور صحبت کو باعث ہدایت سمجھتے تھے اور مولانا دریابادی ان کی ترقیوں سے خوش ہوتے تھے اور ان کے لیے دعا گو رہتے تھے۔

حواشی وحوالے جات

1. مورخہ 13 نومبر 28، ذاکر صاحب کے خط جلد سوم مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام مرتبہ پروفیسر مختارالدین احمد، خدابخش اورینٹل، پبلک لائبریری، پٹنہ 1999
2. مؤرخہ 10 جنوری 29، ایضاً
3. مورخہ 9 دسمبر 33، یضا
4. مورخہ 11 جولائی 57، ایضا
5. مورخہ 19 جولائی 57، مکتوباتِ ماجدی (جلد ششم) مرتب ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ادارۂ انشائے ماجدی، کولکاتا 2010
6. مؤرخہ 16 جون 62، ذاکر صاحب کے خط
7. مؤرخہ 25 جون 63، ایضاً
8. مؤرخہ یکم اگست 63، ایضاً
9. مؤرخہ 15 اگست 63۔ مکتوبات ماجدی
10. مورخہ 4 ستمبر 63، ذاکر صاحب کے خط
11. مورخہ 16 جون 62، ذاکر صاحب کے خط
12. مورخہ 13 جولائی 43، ذاکر صاحب کے خط
13. مورخہ 20 اپریل 44، ذاکر صاحب کے خط
14. مورخہ 26 اگست 57، ذاکر صاحب کے خط
15. مورخہ 10 اکتوبر 68، ذاکر صاحب کے خط
16. مکتوب الیہ کا مجموعہ مضامین 'مسائل وقصص' حیدرآباد، 1944
17. مورخہ 20 اکتوبر 44، ذاکر صاحب کے خط
18. الحیوانات فی القرآن بنارس سے 55 میں شائع ہوئی۔
19. ارض القرآن (جغرافیہ قرآنی) لکھنؤ سے 55 میں شائع ہوئی۔
20. مورخہ 26 اگست 57، ذاکر صاحب کے خط
21. مورخہ 22 فروری 64، ذاکر صاحب کے خط
22. مورخہ 11 جولائی 57، ذاکر صاحب کے خط
23. مورخہ 27 مارچ 62، مکتوبات ماجدی
24. مورخہ یکم اپریل 62، ذاکر صاحب کے خط
25. مورخہ 16 اپریل 62، ذاکر صاحب کے خط
26. مورخہ 17 مئی 62، ذاکر صاحب کے خط
27. مورخہ 30 مئی 62، ذاکر صاحب کے خط
28. مورخہ یکم جون 67، ذاکر صاحب کے خط
29. مورخہ 9 دسمبر 33 ذاکر صاحب کے خط
30. مورخہ 31 اگست 46، ذاکر صاحب کے خط
31. مورخہ 24 ستمبر 58، مکتوباتِ ماجدی
32. مورخہ 26 ستمبر 58، ذاکر صاحب کے خط
33. مورخہ 3 فروری 42، ذاکر صاحب کے خط
34. مورخہ 20 اپریل 44، ذاکر صاحب کے خط
35. مورخہ 22 فروری 64، ذاکر صاحب کے خط
36. مورخہ 6 دسمبر 64، ذاکر صاحب کے خط
37. مورخہ 10 اکتوبر 68، ذاکر صاحب کے خط
38. مورخہ یکم جون 59، ذاکر صاحب کے خط
39. مورخہ 24 جون 59، مکتوباتِ ماجدی
40. مورخہ 30 اپریل 59، مکتوباتِ ماجدی
41. مورخہ 14 مارچ 32، ذاکر صاحب کے خط
42. مورخہ 5 جنوری 32 ذاکر صاحب کے خط

Dr. Saleem Qidwai, C 501, Rowswoods Apts, Mayur Vihar I, Delhi - 110091

ڈاکٹر رشید اشرف خان

وحیِ منظوم کی ادبی اہمیت وانفرادیت

اردوزبان وادب کی ترویج وارتقااور اس کو عالم گیر اور ہردل عزیز بنانے میں جہاں بہت سے عوامل شامل تھے وہیں ترجموں نے اس کی ترقی وترویج میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔اردو ادب کے ابتدائی عہد میں بہت بڑی تعداد میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے اردو نثر میں ترجمے کیے گئے۔ یہ ترجمے مذہب، تصوف، شاعری، داستانوں اور فلسفے کی کتابوں کے تھے۔ اس ضمن میں شاہ میراں جی خدا نماں کا نام سر فہرست ہے جنھوں نے اردو میں پہلا باضابطہ ترجمہ 'تمہیداتِ ہمدانی' کے نام سے 1603 میں کیا جو عربی زبان کے مشہور عالم دین ابوالفضائل عبداللہ بن محمد کی کتاب 'تمہیدات عین القضاۃ' کی فارسی شرح کا اردو ترجمہ ہے۔ علاوہ ازیں ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ دنیا میں اب تک جتنے بھی تراجم ہوئے ہیں ان میں مذہبی تراجم کی تعداد نصف سے زیادہ ہے۔

یہی سبب ہے کہ پروردگار عالم نے انسانوں کو بطور خاص یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ وہ قرآن مجید کو حسبِ منشا اپنی بولی یا زبان میں ڈھال سکیں۔ حضور کے آغاز بعثت میں ''اُم القریٰ وَمن حولھا'' سورۃ شوریٰ آیت نمبر 7 کے مطابق صرف اُمّ القریٰ والے مخاطب قرآن تھے لہٰذا ان کی زبان یعنی عربی میں قرآن کا نازل ہونا قدرتی بات تھی لیکن جیسے جیسے حفاظ نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور خلیفہ ثالث حضرت عثمان نے اسے کتابی شکل بخشی اور یہ قرآن دور دراز کے علاقوں تک پہنچا تو شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کتاب کے ترجمے کیے جائیں۔ اس میں پوشیدہ مطالب کی تفسیر بیان کی جائے۔ چنانچہ قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا اس کے بعد فرانسیسی اور پھر انگریزی زبان میں ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن مجید کا ترجمہ کماحقہ کرنا ممکن ہے۔ میری طرح بہتوں کا ماننا ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس عربی زبان میں نازل کی گئی ہے وہ نہایت اعلیٰ درجے کی فصیح وبلیغ عربی ہے اور جو عربی آج عرب ممالک یا عربی داں حلقوں میں بولی اور لکھی جاتی ہے وہ اپنے تلفظ اور قواعد کے اعتبار سے وہ عربی ہرگز نہیں جو قرآن پاک کی عربی ہے۔ بہرحال صحاح ستہ، ملفوظات اور معروف تراجم وتفاسیر کی مدد سے تراجم قرآنی کا کام ہوتا رہا ہے۔

اردو میں قرآن شریف کے ترجمے کی روایت میں پہلا نام مولانا شاہ رفیع الدین کا ہے جنھوں نے قرآن کا لفظی ترجمہ 1776 میں کیا۔ یہ ترجمہ گرچہ اردو ترجمے کا نقش اول اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے لیکن مولانا نے اردو کے اس ترجمے میں عربی قواعد کی رو سے فاعل اور مفعول سے پہلے فعل کا استعمال کیا ہے جو قواعدِ اردو کے اصول وضوابط کے خلاف ہے۔ اس ترجمے کو مدنظر رکھتے ہوئے 1790 میں مولانا شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا جو ماقبل ترجمے کے مقابلے میں زیادہ سلیس، شگفتہ اور قابل فہم تھا۔ اس کے علاوہ جن علمائے کرام نے قرآن کریم کے ترجمے کیے ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا امین احسن گیلانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولوی ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ حسن نظامی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مرزا حیرت دہلوی کے نام خصوصی طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو میں منظوم ترجمے کے ابتدائی نقوش ہمیں شاہانِ گولکنڈہ کے فرماں روا محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں لیکن یہ سب فارسی مثنویوں کے اردو میں کیے گئے منظوم

محمد قلی قطب شاہ

مولانا ابوالکلام آزاد

ڈپٹی نذیر احمد

سیماب اکبرآبادی

جگر مرادآبادی

ترجے ہیں۔ قرآن کریم کے منظوم اردو تراجم میں سب سے پہلے شمس الدین شائق ایزدی لاہوری نے 1324 ہجری میں چار حصوں پر مشتمل قرآن کا مکمل منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ آغا شاعر دہلوی، مرزا ابراہیم چغتائی، کیف بھوپالی، عبدالرحیم عرشی، مجید الدین احمد اثر زبیری، احمد حسین قلعہ داری اور جوش ملیح آبادی نے چند مخصوص پاروں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان تمام ترجموں میں علامہ سیماب اکبرآبادی کا اردو میں مکمل منظوم ترجمہ 'وحیِ منظوم' جواز اول تا آخر اپنی ادبی شان اور مذہبی تقدس کے اقدار کو ملحوظ رکھتا ہے۔ منظوم ترجمے کے تعلق سے ظ انصاری نے کہا ہے کہ ''یہ ترجمے کی ایک ایسی شاخ ہے کہ جس میں بڑے بڑے اہلِ علم کی انگلیاں جل جاتی ہیں''۔

'وحیِ منظوم' کے خالق اور 284 کتابوں کے مصنف مولانا عاشق حسین سیماب صدیقی الوارثی کی پیدائش 5 جون 1882 کو شہر اکبرآباد کے محلہ نائی منڈی میں ہوئی تھی۔ وہ فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

'وحیِ منظوم' جس پر مصنف علّام نے سنہ طباعت 1365 ہجری لکھا ہے اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ شاہکار عقیدت و تعظیم اور کارنامۂ شعروادب آج سے تقریباً ستّر برس پہلے عالم وجود میں آیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً 990 صفحات پر مشتمل یہ کنز العلوم و معرفت کتنی سعی و مشقت اور محنت و ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس ضمن میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد نثار اٹاوی کی حسب ذیل تحریر مصنف کے کارنامۂ حیات اور توشۂ آخرت 'وحیِ منظوم' کے سلسلے میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے:

''مولانا جس زمانے میں 'وحیِ منظوم' کی تکمیل فرما رہے تھے، مجھے آگرے میں ان کے ہمراہ چند دن قیام کا اتفاق ہوا۔ مولانا صبح غسل فرماتے اور نماز سے فارغ ہو کر کمرے میں آبیٹھتے تھے۔ لوبان اور اگر بتیاں جلائی جاتی تھیں۔ کلام پاک کے متعدد نسخے میزوں پر ارد گرد کھول کر رکھ دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ ترجمہ شروع فرماتے تھے۔ ایک ایک آیت تلاوت کرتے تھے۔ پھر مختلف تراجم کا مطالعہ کر کے اس آیت کا ترجمہ نظم کرتے تھے۔ دوپہر کو تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد پھر وہی شغل شروع ہو جاتا تھا۔ برسوں کا کام تھا مگر مولانا کو چونکہ زبان اور بیان پر بے انتہا قدرت حاصل تھی لہٰذا انھوں نے صرف سات ماہ اور نو دن میں یہ عظیم الشان کام سرانجام دے لیا۔''

ماہنامہ نقوش لاہور: شخصیات نمبر 2 اکتوبر 1965 ص 864

'وحیِ منظوم' کو پڑھ کر قاری پر جو پہلا اثر مرتب ہوتا ہے وہ یہ کہ شاعر بیک وقت عربی، فارسی اور دیگر عالمی و دیسی زبانوں سے نہ صرف کماحقہ واقف ہے بلکہ اُن جملہ زبانوں پر قابلِ رشک اقتدار رکھتا ہے۔ اگر وہ ایک طرف اپنی مادری زبان اردو کا مکمل مزاج داں ہے تو دوسری طرف عربی زبان وادب کا زبردست عالم بھی ہے۔ اسے تاریخ عالم سے بھرپور واقفیت ہے اور خصوصیت کے ساتھ قبل از اشاعت و بعد از اشاعت اسلام کے جملہ احوال وافکار کا مستند و واضح علم بھی ہے۔

'وحیِ منظوم' جس پر مصنف علّام نے سنہ طباعت 1365ہجری لکھا ہے اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ شاہکار عقیدت و تعظیم اور کارنامۂ شعر وادب آج سے تقریباً ستّر برس پہلے عالم وجود میں آیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً 990 صفحات پر مشتمل یہ کنز العلوم ومعرفت کتنی سعی ومشقت اور محنت وریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس ضمن میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد نثا ر اٹاوی کی حسب ذیل تحریر مصنف کے کارنامۂ حیات اور توشۂ آخرت 'وحیِ منظوم' کے سلسلے میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے

علامہ سیماب اکبرآبادی شاعری کے کامل الفن استاد اور بحر زبان و عروض کے ماہر شناور تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ قرآن کریم کے بے مثال ترجمے پر قادر ہو سکے۔ انھوں نے قرآن کریم کے انداز ترتیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ایک پارے اور سورۃ کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ترجمے سے یوں کیا ہے:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغازِ بیاں
جو بڑا ہی رحم والا ہے، نہایت مہرباں

غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کس قدر سلاست وروانی کے ساتھ بسم اللہ کے سبھی اجزاء ترتیبی کو دو مصرعوں میں سمیٹ لیا ہے اور اپنی قدرت بیانی کا پہلا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی نے قرآن کریم کے اس منظوم ترجمے میں ابتدا ہی سے اپنی فن کاری کا جو نادر و نایاب نمونہ پیش کیا ہے وہ سورۃ فاتحہ میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

ہیں سزا وارِ خدا ے پاک ساری خوبیاں
جو ہے رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک بے گماں
یا الٰہی ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی
اور ہوتے ہیں تجھی سے طالبِ امداد بھی

اس کے برعکس مرزا ابراہیم چغتائی اکبرآبادی کا سورۃ فاتحہ کا یہ منظوم ترجمہ بھی دیکھیے:

ہے وہ رحمن رحم والا بڑا
وہ ہی حاکم ہے روزِ محشر کا
بندگی کرتے ہیں فقط تیری
اور مدد مانگتے ہیں تجھ سے ہی
راہ سیدھی پہ ہی ہمیں دے لگا
راہ ان کی انعام جن پہ ہوا

درج بالا دونوں ترجموں میں علامہ سیماب کے ترجمے میں خاصی سلاست، روانی اور پختگی ہے۔اپنے کمال فن کا مظاہرہ نہایت چابکدستی سے کیا ہے کہ کہیں پر بھی لغزش کا گمان تک نہیں ہوتا۔ جبکہ مرزا ابراہیم چغتائی اکبرآبادی کے یہاں زبان وبیان کی پختگی میں کمی پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ آخری مصرع کا 'عین' ساقط ہوتا دکھائی دیتا ہے۔منظوم ترجمے میں لفظوں کے انتخاب اور قافیے کی بندش کا جتنا خصوصی التزام علامہ سیماب کے یہاں ملتا ہے باقی کسی دوسرے منظوم ترجموں میں یہ خصوصیات نظر نہیں آتیں۔یہی وہ تمام فنی لوازمات ہیں جو علامہ سیماب اکبرآبادی کو دوسرے منظوم ترجمے میں ممتاز کرتے ہیں۔

ترجمۂ قرآن کو زیادہ عام فہم اور بلیغ بنانے کے لیے علامہ سیماب نے کچھ ایسے گھریلو روزمرہ کا استعمال کیا ہے جس سے مفہوم واضح ہوجاتا ہے اور حظ بھی حاصل ہوتا ہے۔مثلاً سورۂ قمر میں قوم لوط پیغمبر کی باغیانہ روش اور ملحدانہ حرکتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے درج ذیل آیت کو کس طرح شعری پیکر میں ڈھالا ہے:

وَ لَقَدۡ اَنۡذَرَهُم بَطۡشَتَنَا فَتَمَارَوۡا بِالنُّذُرِ

تھا گرفت و قہر سے ان کو ڈرایا لوط نے
حجتیں ان کے ڈرانے میں مگر کرتے رہے
اور اڑانا چاہا مہمانوں کو ، پھسلا کر اُسے
ہم نے ان کی آنکھیں پٹ کردیں وہ اندھے ہوگئے
اور کہا چکھو، ہمارے قہر اور ڈر کے مزے

(وحیِ منظوم ص:849)

اس منظوم ترجمے کو پڑھتے وقت ایک اہم بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ شاعر نے اپنے بیان کو رواں اور موثر بنانے کے لیے اکثر وبیشتر قدرے ادق اور اعلیٰ درجہ کے علمی الفاظ ومصطلحات کا بے تکلف استعمال کیا ہے جو اس کے مافی الضمیر کو ہم پر منکشف کردیتا ہے اگرچہ آج 50 فیصد بد مذاق طالب علمانِ ادب کو بہ جبر و کراہ لغات زبان اور بچے کھچے بزرگوں سے پوچھنا پڑتا ہے۔حسب ذیل مثالیں میرے دعوے کا بیّن ثبوت ہیں:

حق و باطل کا نہ آپس میں کرو تم التباس
اور نہ دانستہ چھپاؤ حق علیٰ ھذا القیاس
اب سفیہہ و جاہل و احمق کہیں گے طنز سے
قبلۂ اول سے اپنے ، کیوں مسلماں پھر گئے

سیماب اکبرآبادی نے کہیں کہیں ایسی زبان کا استعمال بھی کیا ہے جو بہ ظاہر غیر فصیح اور دیہاتی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی جگہ دوسرے پیرائے بیان کا لانا امرِ محال تھا:

ان میں ناخواندہ بھی ہیں جن کو نہیں علمِ کتاب
صرف لفظی بڑبڑاہٹ اور خیالاتِ خراب

اگر آپ 'وحیِ منظوم' کو لفظ بہ لفظ پڑھیں تو قدم قدم پر یہ احساس ہوگا کہ سیماب اکبرآبادی نے انتہائی بے تکلفی اور فراوانی کے ساتھ قوسین (Brackets) کا استعمال کیا ہے۔ایسا انھوں نے خدانخواستہ عجز یا مجبوری کی بنا پر نہیں کیا ہے بلکہ شعوری طور پر عمداً کیا ہے جن کی مدد سے ہم اس شاہکار ترجمے کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ دوران مطالعہ ہمیں 'وحیِ منظوم' میں کچھ ایسے ہندی الفاظ، محاورات، کہاوتیں اور اقوال ملتے ہیں جو عموماً ادبی یا اعلیٰ درجے کی ادبی کتابوں میں نہیں ملتے لیکن اس ادبی شاہکار میں جو خالص نظم میں ہے، یہ چیزیں ناقابل بیان لطف عطا کرتی ہیں۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

اس نے چوپائے بنائے ہیں تمھارے واسطے
ہے جڑاول ان میں اور ایسے بہت سے فائدے

جاڑے (سردی) کے سامان کو جڑاول کہتے ہیں جو مویشیوں کی کھالوں اور بالوں سے بنائے جاتے ہیں۔

(وحیِ منظوم ص:429)

'وحیِ منظوم' اس لحاظ سے ایک نایاب صحیفہ ہے کہ اس میں آسمان وزمین کو یکجا کردیا گیا ہے۔ایک طرف لسان اللہ کے نمونے ہیں تو دوسری طرف زمین پر بسنے والے لیکن رفیع وبلند خیالات کے ترجمان علامہ سیماب اکبرآبادی کے قلم کی بوقلمونی تصاویر جس کی بدولت 31 جولائی 1981 کو اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد میں صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے والے چار زبانوں کے مترجمین کو اعزاز سے نوازا جس میں 'وحیِ منظوم' کو پہلے اعزاز سے سرفراز ہونے کا شرف حاصل ہے۔

219 دنوں کے مختصر عرصے میں تصنیف کردہ 'وحیِ منظوم' قرآن کریم کا پہلا ایسا منظوم ترجمہ ہے جو اردو شاعری اور اس کے علم بیان کے معیار پر پورا اترنے کے ساتھ ساتھ قرآن کی عظمت و تقدس کو بھی ملحوظ رکھتا ہے جو شاعر کی زود نویسی، +02.02.0 قادر الکلامی اور طبیعت میں بلا کی آمد کا آئینہ دار ہے۔جسٹس آفتاب حسین چیرمین وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد 'وحی منظوم' کی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''علامہ سیماب اکبرآبادی نے قرآن کریم کا جو اردو میں منظوم ترجمہ بنام 'وحیِ منظوم' کیا ہے یہ اس امت کے چودہ سو سال میں پہلا کامیاب اور مستحسن اقدام ہے۔ یہ ان کی بلند پایہ شاعری اور ان کی قادرالکلامی، عروج فن اور قرآن کریم پر حد درجہ عبور کی بے نظیر مثال ہے۔علاوہ ازیں اس سے ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ادب کے اس ترقی یافتہ دور میں 'وحیِ منظوم' ایک اہم تقاضے کو پورا کرتا ہے۔''

اس مضمون میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے منظوم قرآنی ترجمے کے حوالے سے جن چند نکات کی طرف اشارہ کیا گیا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ عربی، اردو تراجم کی روایت کو نہ صرف توانائی عطا کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعے ہم سیماب اکبرآبادی کی ہمہ جہت شخصیت سے بھی واقف ہوتے ہیں۔انھیں اردو کے علاوہ عربی اور دیگر زبانوں پر جو دسترس حاصل تھی اس کی وجہ سے یہ منظوم ترجمہ مفہوم کی کامیاب ترسیل کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اہم ادبی مقام و مرتبے کا حامل ہے۔مختصر یہ کہ علامہ سیماب اکبرآبادی نے اپنے اس قرآنی منظوم ترجمے 'وحیِ منظوم' کو تمام تر شعری جمالیات وفنی لوازمات نیز پیغام الٰہی کا حسین امتزاج مرقع بنا کر بطور شاہکار پیش کیا ہے۔بہ قول جگر مرادآبادی:

اے متاعِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

اس مضمون میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے منظوم قرآنی ترجمے کے حوالے سے جن چند نکات کی طرف اشارہ کیا گیا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ عربی، اردو تراجم کی روایت کو نہ صرف توانائی عطا کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعے ہم سیماب اکبرآبادی کی ہمہ جہت شخصیت سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ انھیں اردو کے علاوہ عربی اور دیگر زبانوں پر جو دست رس حاصل تھی اس کی وجہ سے یہ منظوم ترجمہ مفہوم کی کامیاب ترسیل کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اہم ادبی مقام و مرتبے کا حامل ہے۔

Dr.Rasheed Ashraf Khan, D-3, Darussalam Society, Near Gazi Miyan Dargah, New Hall Road, Halav Pool, Kurla (W) Mumbai-400070 (M.S.)

پریمی رومانی

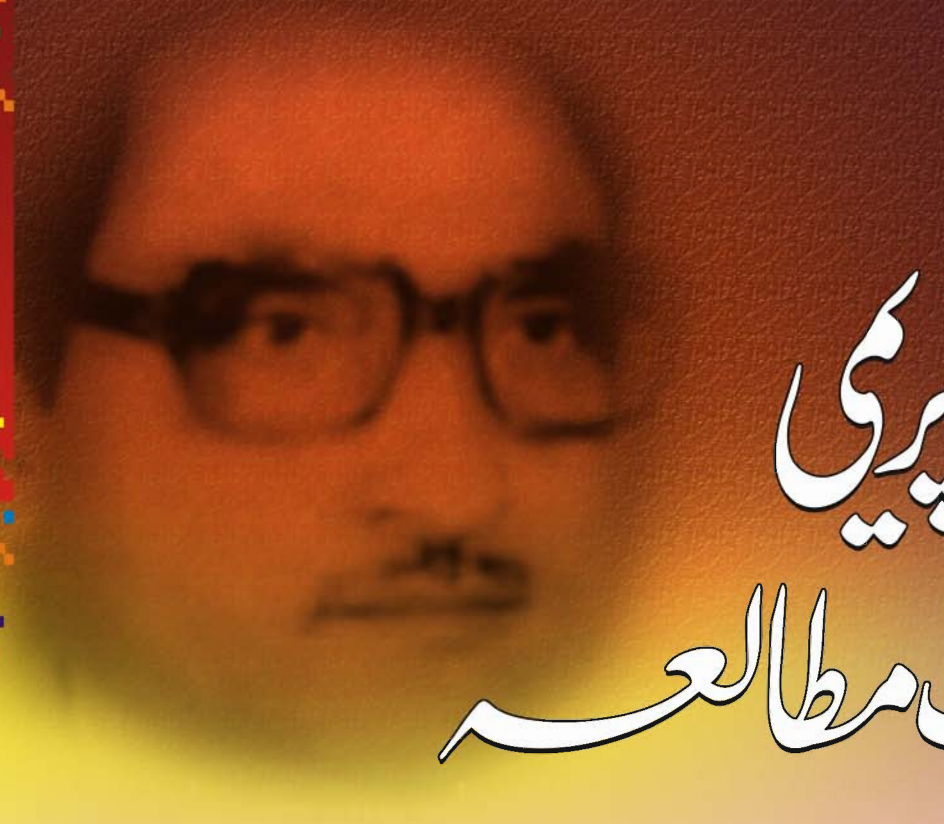

برج پریمی ایک مطالعہ

برج پریمی کا اصلی نام برج کشن ایمہ ہے۔ وہ 24 ستمبر 1935 میں درابی یار حبہ کدل سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت شیام لال ایمہ اپنے عہد کے ایک معروف قلم کار اور سماجی کارکن تھے۔ وہ اردو اور فارسی ادبیات کے عالم تھے۔ برج پریمی کے ذوقِ سلیم کو سنوارنے میں ان کا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ 14 سال کی عمر میں برج پریمی والد کے سائے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ ان کے بے وقت انتقال کے بعد مشہور افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی (مرحوم) نے ذوق ادب کی تہذیب کی۔

ڈاکٹر برج پریمی بنیادی طور پر ایک کہانی کار تھے۔ وہ برسوں تک کئی ادبی تنظیموں اور پرچوں کے ساتھ وابستہ رہے۔ 1976 میں 'سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا جس پر انھیں کشمیر سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ برصغیر ہند و پاک کے نامور ناقدین گرامی کے مطابق یہ مقالہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی اردو کے معروف نقاد اور محقق تھے۔ ادبیات کے موضوع پر ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ادب کے علاوہ کشمیریات سے بھی وہ بڑا گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے کشمیر کی تاریخ، ثقافت اور ادب کے بیش بہا پہلوؤں کو اردو قارئین تک پہنچانے کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے قابلِ قدر علمی اور ادبی کارناموں کے پیش نظر جموں و کشمیر کلچرل اکادمی، یوپی اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور آل انڈیا ہندی اور سنگم نے انھیں وقتاً فوقتاً گراں قدر اعزازات سے نوازا۔ برج پریمی کی شخصیت اور فن پر درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

- برج پریمی: ایک مطالعہ، ڈاکٹر پریمی رومانی
- برج پریمی: شخصیت اور فن، ڈاکٹر پریمی رومانی
- برج پریمی کی ادبی خدمات: ڈاکٹر چمن لال بھگت
- برج پریمی: ایک ہمہ جہت شخصیت: ڈاکٹر پریمی رومانی

شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں 'برج پریمی کی افسانہ نگاری' کے موضوع پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی اردو اکادمی سری نگر کشمیر نے 2011 میں ریاست کے معروف افسانہ نگار اور ادیب جناب نور شاہ کو برج پریمی میموریل لٹریری ایوارڈ سے نوازا۔ 1990 کے المناک حالات میں جب وہ ترکِ وطن کر کے جموں آئے تو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

افسانہ نگاری

برج پریمی نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو اس زمانے میں ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ چنانچہ اس دور میں بڑے بڑے افسانہ نگار ادبی افق پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، کوثر چاند پوری، مہندر ناتھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اردو افسانے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اس کو نیا وقار بخشا۔ ہندوستان کی باقی تمام ریاستوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر میں بھی اس تحریک نے کافی زور پکڑ لیا تھا۔ پریم ناتھ پردیسی میرِ کارواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھیں کشمیر میں اردو کے اولین افسانہ نگار ہونے کا فخر حاصل ہے اور اس حوالے سے وہ کشمیر کے پریم چند کے کام سے بھی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ جو افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں پریم ناتھ ڈار، تیج بہادر بھان، اختر محی الدین، محمد لون، اُمیش کول، گنگا دھر بٹ دیہاتی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ راما نند ساگر، محمود ہاشمی، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، کشمیری لال ذاکر بھی اسی کارواں سے تعلق رکھتے ہیں، جو پردیسی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اردو افسانے کی خوب آبیاری کرتے رہے۔ برج پریمی ان کے بعد آنے والی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے خیالات کی فراوانی اور جذبات کی نزاکت سے بہت ہی قلیل مدت میں اردو افسانہ نگاری میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ اگرچہ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی سے متاثر تھے لیکن ان

کے افسانوں میں کرشن چندر کا رنگ نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اگر چہ وہ ترقی پسند دور میں ابھرے لیکن وہ روایتی افسانے پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کے اکثر افسانوں میں داخلی کرب کے ساتھ ساتھ خارجی دنیا کے حالات وواقعات جلوہ گر ہوتے ہیں۔ انھوں نے جہاں کشمیر کے حسن کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے، وہاں وہ کشمیر کی بدحالی، غربت، افلاس، اور ناداری میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی زندگی اپنے افسانوں میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ان کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

''برج پریمی بھی اپنے عہد کی ترقی پسندی سے متاثر ہیں۔ چنانچہ اُن کے افسانوں میں بھی مہاجن، ٹھیکہ دار، لمبی توندوں کے ڈراؤنے سائے سارے عناصر موجود ہیں۔''

برج پریمی کا پہلا افسانہ 'آقا' (1949) میں روزنامہ امرجیوتی سری نگر میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے بیسوں افسانے لکھے جن میں آقا، میرا گنوار دوست، رنگوں کے جیون میں، ناکام محبت، یہ انسان، اس کی موت، لہریں اور کنارا، یہ بھی ایک کہانی ہے، ولر کے کنارے، شرنارتھی، جب اہنسا کا خون ہوا، فرض، مانسبل جب سوکھ گیا، میرے بچے کی سالگرہ، سپنوں کی شام، پھٹی پھٹی آنکھیں، ٹیسیں درد کی، لمحوں کی راکھ، خوابوں کے دریچے، اجالے کی راکھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے اس دور کے مشہور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور قارئین سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ برج پریمی نے اپنے بعض افسانے انجمن ارباب ذوق سری نگر اور حلقہ علم وادب خانیار (سرینگر) کی مختلف نشستوں میں پیش کیے۔ یہ انجمنیں 60-1955 کے آس پاس سری نگر کے اندرونی علاقوں میں فعال تھیں۔ ان دونوں انجمنوں نے اس دور میں اردو زبان وادب کی ترقی و بقا کے لیے کام کیا۔ برج پریمی خود بھی ان انجمنوں کے عہدے داروں میں شامل تھے۔ انھوں نے اپنا ایک مشہور افسانہ 'سپنوں کی شام' حلقہ ارباب ذوق کی محفل میں پیش کیا۔ اردو اور ہندی زبان کے معروف شاعر، ادیب اور فلم ساز راہی معصوم رضا (جواُن دنوں کشمیر میں ہی مقیم تھے) اس محفل میں شریک تھے۔ انھوں نے برج پریمی کی اس کہانی کو اس دور کی نمائندہ کہانی قرار دیا اور اس کی خوب داد دی۔ یہ کہانی بعد میں ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی میں 1953 میں شائع ہوئی اور بے حد پسند کی گئی۔

برج پریمی کی ایک کہانی 'میرے بچے کی سالگرہ' بھی ایک عمدہ کہانی ہے جو انھوں نے 1958 میں لکھی۔ یہ ایک نفسیاتی کہانی ہے جو ان لمحات کی طرف اشارہ کرتی ہے جن سے ایک عورت کو پہلا بچہ تخلیق کرنے کے دوران گزرنا پڑتا ہے۔ افسانہ حقیقت آمیز ہے اور اس کا پلاٹ خوبصورت طریقے سے بنا گیا ہے۔ برج پریمی کا ایک اور خوبصورت افسانہ 'پھٹی پھٹی آنکھیں' 1952 میں شائع ہوا۔ یہ ان کا ایک اور نفسیاتی افسانہ ہے، جس میں خود ان کی ذاتی زندگی کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ 'آنسوؤں کے دیپ' 'ایک پھول ایک کلی' اور امرجیوتی بھی اسی قبیل کے افسانے ہیں جن سے ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی عکاسی ہوتی ہے۔

'ہنسی کی موت' برج پریمی کا ایک عمدہ افسانہ ہے جو انھوں نے اپنی جوان مرگ بہن کے اچانک لقمۂ اجل ہونے پر لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ ان کے ذاتی المیے کی دلالت کرتا ہے۔ فرض، شرنارتھی، یہ گیت یا مزار اور مانسبل جب سوکھ گیا بھی ان کے اہم اور قابلِ قدر افسانوں میں شمار ہوتے ہیں جو ان کے ذاتی غم، مشکلات ومصائب کا احاطہ کرتے ہیں۔ برج پریمی کے لنگوٹیے یار اور عصر حاضر کے مشہور شاعر وادیب موتی لال ساقی، برج پریمی کے افسانوں کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں:

''برج پریمی کا افسانہ 'پھٹی پھٹی آنکھیں' سری نگر سے شائع ہونے والے ماہنامہ آزاد میں 1952 میں شائع ہوا۔ افسانے کے تانے بانے پریمی کی ذاتی زندگی کے اردگرد گھومتے ہیں۔ افسانے کا محرک پریمی کا ایک ذاتی المیہ ہے۔ اسی دور کی کہانیوں میں 'آنسوؤں کے دیپ' اور 'ایک پھول ایک کلی' دسمبر 1957 کے ماہنامہ دیش میں شائع ہوئی ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدے شعلہ و شبنم میں پریمی کی ترجمہ کی ہوئی کہانی 'امرجیوتی' فروری 1950 میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی بے حد پسند کی گئی۔''

'ٹیسیں درد کی، لمحوں کی راکھ' اور 'خوابوں کے دریچے' برج پریمی کے بعد کے برسوں کے افسانے ہیں۔ ان افسانوں کا انداز الگ اور منفرد ہے۔ ان میں جہاں ایک طرف زبان و بیان اور تکنیک کی تبدیلیاں نمایاں طور پر ملتی ہیں وہاں سماج اور سوسائٹی پر طنز بھی ملتا ہے۔ یہ تینوں افسانے بے حد دلچسپ اور معنی خیز ہیں جن میں تازہ تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ان کے اس دور کے افسانوں میں بعض سماجی گتھیوں کو سلجھانے کے ٹھوس اقدامات کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض افسانوں میں شعور کی رو کی تکنیک بھی ملتی ہے۔ ان افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے اور خود کلامی کا انداز بھی۔ دور حاضر کے ایک بزرگ اور معروف ادیب اور ناول نگار کشمیری لال ذاکر، برج پریمی کے افسانوں پر رائے زنی کرتے ہوئے 'سپنوں کی شام' کے پیش لفظ میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''برج پریمی کا کہانی لکھنے کا انداز خود کلامی کا انداز ہے یعنی سلی لوکی (Soliloquy) کا انداز — اس کا ہر کردار خود کلامی کر رہا ہے اور جب وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں بولتا ہے یا اپنے سماج اور ماحول کا ذکر کرتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ ہی سے گفتگو کرتا ہے۔''

برج پریمی کی کہانیوں میں کشمیر کا ہوبہو عکس نظر آتا ہے۔ دراصل ان کی کہانیاں کشمیر کی کہانیاں ہیں۔ ان میں کشمیر کا ماحول، کشمیر کی تہذیب و تمدن، کشمیر کی شاندار روایت کے ساتھ ساتھ 1990 تک کا کشمیر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے کردار کشمیر کے محنت کش عوام اور ہنرمند اور باصلاحیت باشندے ہیں جو شب و روز اپنا خون پسینہ ایک کر کے کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں۔ پیپر ماشی اور شال، نمدے اور گبھے بناتے ہیں۔ سڑکوں پر پتھر کوٹنے کا کام کرتے ہیں۔ غربت اور مفلسی ان کا مقدر ہے۔ اتنی مشکلات اور مصائب جھیلنے کے بعد وہ اف تک نہیں کرتے۔ برج پریمی ایک حساس اور دردمند افسانہ نگار ہیں۔ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ عوام کا ظلم وتشدد، رشوت خوری، کینہ پروری اور جور واستبداد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ انھیں غریب، بے بس اور لاچار عوام سے ہمدردی ہے۔

برج پریمی نے بہت سے منی افسانے بھی لکھے ہیں جو

برج پریمی نے اپنے بعض افسانے انجمنِ ارباب ذوق سری نگر اور حلقہ علم و ادب خانیار (سرینگر) کی مختلف نشستوں میں پیش کیے۔ یہ انجمنیں 1955-60 کے آس پاس سری نگر کے اندرونی علاقوں میں فعال تھیں۔ ان دونوں انجمنوں نے اس دور میں اردو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے لیے کام کیا۔ برج پریمی خود بھی ان انجمنوں کے عہدے داروں میں شامل تھے۔ انھوں نے اپنا ایک مشہور افسانہ 'سپنوں کی شام' حلقہ اربابِ ذوق کی محفل میں پیش کیا۔ اردو اور ہندی زبان کے معروف شاعر، ادیب اور فلم ساز راہی معصوم رضا (جواُن دنوں کشمیر میں ہی مقیم تھے) اس محفل میں شریک تھے۔ انھوں نے برج پریمی کی اس کہانی کو اس دور کی نمائندہ کہانی قرار دیا اور اس کی خوب داد دی۔ یہ کہانی بعد میں ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی میں 1953 میں شائع ہوئی اور بے حد پسند کی گئی۔

اُس دور کے موقر رسائل واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ افسانے بھی کشمیر کے مظلوم عوام کی بدحالی، غربت، مفلسی اور ان پر کیے گئے مظالم کی کھلی داستان پیش کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ان افسانوں میں مذہب اور سماج کے ٹھیکے داروں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور ان پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔

ریاست میں منی افسانے کا آغاز اگرچہ پریم ناتھ پردیسی نے کیا لیکن اس کو آگے بڑھانے میں گنگادھر بٹ نے کافی پہل کی ان کے افسانے اس دور کے مقبول رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ برج پریمی کے منی افسانوں میں یاد، جھلکیاں، بہتے ناسور، ننھی کہانیاں، یہ انسان وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں جو بہت ہی مقبول ہوئے۔ چند منی افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''مگر ویدجی۔ میرا بچہ بیمار ہے۔ میرا للو سخت بیمار ہے۔ کہیں اس کو کچھ ہو گیا تو کل ضرور دوں گا۔ دیوی کی قسم کل ضرور شہر جا کر سارے بھیج دوں گا۔ بھگوان کے لیے میرے للو کی جان بچائیے... میں اور بھی۔ جاؤ بدبخت! دفع ہو جاؤ یہاں سے...'' (بہتے ناسور)

''چپ بڑا آیا سمجھانے والا، مہاتما بدھ کا سالا، جلدی کرو، مالک کی آنکھیں جلتی رہیں۔ ایک خونی ناچ اس کی آنکھوں میں ناچتا رہا۔ ایک وحشی خمار! مالک... آپ آخر کیا چاہتے ہیں۔ ہوش کی دوا کیجیے۔ آپ آخر کیا سمجھتے ہیں۔ فضلی میری روح ہے۔ اس کی عزت تار تار کر دینا چاہتے ہیں...''
(ایک جھلک، روزنامہ جیوتی، سری نگر، 1954)

منٹو شناسی: ڈاکٹر برج پریمی کو شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر سے 'سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے' کے موضوع پر 1976 میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس کے تقریباً 10 سال کے بعد 1968 میں ان کا یہ تحقیقی مقالہ منظر عام پر آ گیا۔ چونکہ منٹو کی زندگی کا بیشتر حصہ پاکستان میں گزرا تھا۔ اُن کی بیشتر کتابیں اور مختلف رسائل و جرائد کے خاص نمبرات پاکستان میں شائع ہو چکے تھے۔ اُن دنوں ہند و پاک کے سیاسی تعلقات کشیدہ تھے۔ منٹو کے بارے میں کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ رسائل و جرائد میں بعض مقالات ضرور شائع ہو چکے تھے۔ لیکن برصغیر ہند و پاک میں منٹو کی شخصیت اور فن پر کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی جس میں منٹو کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہو اور اردو افسانے میں ان کی اہمیت متعین کی گئی ہو کیونکہ منٹو کو رجعت پسند، سنکی، پاگل، اور لطیفہ باز قرار دیا گیا تھا۔ جدید انھیں ترقی پسند قرار دیتے تھے اور ترقی پسند انھیں رجعت پسند کہتے تھے اور انھیں کسی بھی قیمت پر اپنانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ برج پریمی، منٹو کے اولین نقاد اور محقق تھے جنھوں نے انھیں صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی جس کی تصدیق برصغیر ہند و پاک کے معتبر نقادوں اور منٹو کے معاصرین نے بار بار کیا ہے۔ ان میں سے بعض اکابرین ادب کی آرا ملاحظہ فرمائیے:

پروفیسر آل احمد سرور: ڈاکٹر برج پریمی نے اردو زبان و ادب کی تدریس اور تنقید کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دیے ہیں اُن کی اہمیت مسلم ہے۔ منٹو پر ان کی کتاب ایک بڑے فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین: آپ کی کتاب 'سعادت حسن منٹو- حیات اور کارنامے' ملی۔ کتاب خوب سے خوب تر ہے۔

کشمیر شناسی: برج پریمی نہ صرف ایک منفرد انداز کے افسانہ نگار تھے بلکہ وہ ایک منٹو شناس ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیر شناس بھی تھے۔ ان کی ادب کے ساتھ ساتھ کشمیر کی تاریخ پر بھی گہری نگاہ تھی۔ کشمیر کے بعض اہم گوشوں پر ان کی دو تصانیف جلوۂ صد رنگ اور 'کشمیر کے مضامین' شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں کشمیر کے بعض اہم اور مشہور پہلوؤں پر معنی خیز بحث ملتی ہے۔ عصر حاضر کے ایک معتبر ادیب، دانشور اور محقق محمد یوسف ٹینگ ایک جگہ برج پریمی کی کشمیر شناسی کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کشمیر کی تواریخ کی بھول بھلیوں میں بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے ہیں لیکن پریمی نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا۔''

کشمیر سے متعلق برج پریمی کے نظریے کا ایک ہلکا سا جائزہ ان کے درج ذیل اقتباس سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں میں رہتا ہوں اسے صدیوں سے دھرتی کا سورگ کہا جاتا ہے۔ اپسراؤں کا یہ دیس تہذیب کی صبح سے اپنے ملکوتی حسن اپنے رنگ اور اپنے نور سے سورگ کے انسانی تصور کا پیکر ہے۔ یہ وہ خطۂ ارضی ہے جہاں کے صد رنگ جلوؤں نے صدیوں سے سیلانیوں کو برمایا ہے۔ یہاں گیان و عرفان کے کتنے سوتے پھوٹے ہیں، آگہی و بصیرت کے کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں اور عقل و عشق کے کتنے مرحلے انجام کو پہنچے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پر یہ سب داستانیں منقش ہیں۔''

نہ صرف یہی اقتباس بلکہ کشمیر کے بارے میں ان کی بے شمار تحریریں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ انھیں کشمیر سے والہانہ عقیدت تھی۔ وہ کبھی اس کے حسن اور خوبصورتی کی بات کرتے ہیں، اور کبھی قدیم تواریخی مقامات کا جائزہ لیتے ہیں۔ کبھی یہاں کی رواداری، اخوت اور بھائی چارے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور کبھی یہاں کے لوگوں کی ذہانت کی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ ان کا دل ایسے قلم کاروں کی تحریروں سے اوب گیا تھا جنھوں نے کشمیر کی تصویر کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق ایسے بعض فنکاروں نے صرف کشمیر کے حسن اور اس کی خوبصورتی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے افلاس و ناداری اور غربت کو کسی نے بھی محسوس نہیں کیا۔ برج پریمی ان پردوں کو سرکانا چاہتے ہیں جن میں کشمیر کے حسن، اس کی رعنائی، اس کی مٹی کی خوشبو اور اس کے عرفان کے لازوال گوشے چھپے ہوئے ہیں۔ ان کا مشن کشمیر اور صرف کشمیر کی تلاش تھا۔

برج پریمی نے نہ صرف کشمیر کی تہذیب و تمدن، کلچر و تاریخ کے چھپے ہوئے گوشوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر کیا ہے بلکہ اپنی کتاب 'جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما' میں بہت ہی اہم ادبی گوشوں کو بھی بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ سردار جعفری اور قومی یکجہتی، آتسو ادب اور قومی وحدت، اردو افسانے کے بدلتے ہوئے رنگ، کشمیر کا اولین افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، حامدی کاشمیری- فرینڈ فلاسفر اور گائیڈ، پریم چند اور تحریک آزادی، پریم چند کے تکنیکی تجربے، پریم چند اور دیہات، پریم چند اور فلم، مختصر افسانہ اور خواتین، تحریک آزادی اور آتسو ادب، قومی وحدت اور آتسو شاعری، پردیسی اور ان کے افسانے اور اردو کے چند قد آور افسانہ نگار وغیرہ ان کے بعض تنقیدی و تحقیقی مقالات ہیں جن کی اہمیت مسلم ہے۔ ہندوستانی فلم کے حوالے سے بھی ان کے بعض گراں قدر مقالات شائع ہو چکے ہیں جن میں سعادت حسن منٹو اور نگار خانے، سعادت حسن منٹو اور ہندوستانی فلم، راجندر سنگھ بیدی اور ہندوستانی فلم، ہماری فلموں میں ہندوستانیت، ہندوستانی فلم اور اوپندر ناتھ اشک، ہندوستانی فلم میں خواجہ احمد عباس کا حصہ، نغموں کا جادوگر ساحر لدھیانوی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے انشائیوں اور خاکوں میں، باتیں توہمات کی، باتیں استدلال کی، قدیم اخلاقی قدریں اور جدید سماجی تقاضے، وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی- شیر کشمیر، ہمارے میکدے کا بجھ گیا اک اور چراغ- پریم ناتھ بزاز، دو دو چراغ محفل- کشپ بندھو، جلتی بجھتی یادیں- سوم ناتھ سادھو، بزم احساس میں قائم ہے خلا تیرے بغیر- کلدیپ وغیرہ شامل کیے جا سکتے ہیں۔

اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت قلم کار تھے جنھوں نے ہر موضوع کو بڑے سلیقے سے برتا اور اپنی زبان کی شیرینی اور اسلوب کی ندرت سے اپنے فن کو ایک نیا وقار بخشا۔

■

Dr. Premi Romani, 1/3 Naseeb Nagar, Janipur, Jammu - 180007

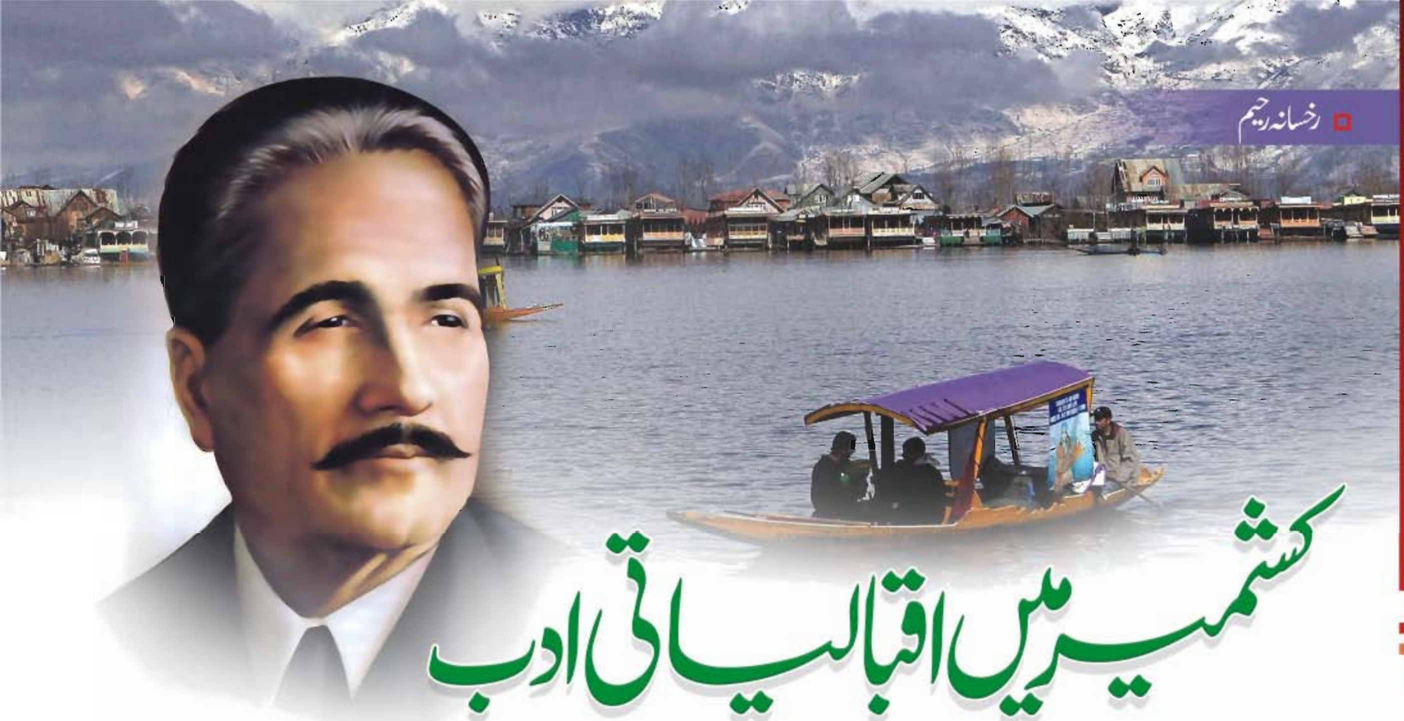

رخسانہ رحیم

کشمیر میں اقبالیاتی ادب

کشمیر کے ساتھ اقبال کا نسلی، ذہنی اور جذباتی اعتبار سے خاص تعلق رہا ہے اور اقبال نے کشمیر کے ساتھ اپنے اس تعلق پر ہمیشہ ناز کیا ہے۔ چنانچہ یہ اسی خاص تعلق کا نتیجہ ہے کہ کلام اقبال میں جگہ جگہ کشمیر اپنے تاریخی، سیاسی اور ثقافتی حوالوں کے ساتھ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ حجاز کی ارض مقدس کے بعد اقبال کی عقیدت ومحبت کا مرکز سرزمین کشمیر ہے۔

اہالیان کشمیر کی بھی اقبال کے ساتھ بڑی گہری عقیدت رہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت وہ تعلیمی اور علمی ادارے، ادبی انجمنیں، مساجد، مقامات، باغات اور پارکیں ہیں جو اقبال کے نام سے منسوب ہیں۔ چنانچہ اقبال شناسی کے سلسلے میں بھی یہاں پر بڑے پیمانے پر کام ہوتا رہا۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور اقبال انسٹی ٹیوٹ، جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو، ریاستی کلچرل اکادمی اور دیگر اداروں کی کوششیں اس سلسلے میں قابل قدر ہیں۔ علاوہ ازیں انفرادی سطح پر بھی خاطر خواہ کام ہوتا رہا۔ یہاں کے ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے اقبال کے فکروفن اور ان کی شخصیت سے متعلق اپنے مطالعات پیش کیے۔

اقبال کی حیات وشخصیت اور ان کے افکار واشعار سے متعلق اردو تحقیق کا ایک قابل لحاظ حصہ کشمیر کی دین ہے۔

محققین نے انفرادی سطحوں پر بھی اقبال کے تعلق سے تحقیقی کارنامے انجام دیے۔ کشمیر میں اقبال کی مقبولیت کا سبب صرف ان کا فکروفن ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اقبال اصل میں فرزندِ کشمیر ہیں۔ لہٰذا برعظیم کے ہر حصے بلکہ تمام دنیا سے زیادہ اہل کشمیر کو اقبال پر فخر وناز ہے۔ ان کے کلام کے علاوہ خطوط میں کشمیر کا ذکر موجود ہے اور پھر ان ہی کی حیات میں مسائل کشمیر کی جو معنویت رہی ہے اس سے کسی بھی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کشمیر میں اقبال کی شاعری اور فکروفن کے اثرات کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کا آغاز ان ہی کی زندگی میں ہوگیا تھا۔ اقبال کے ہمعصر ادبا و شعرا نے اسی دور میں ان کا طریقہ اپنالیا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی محمد الدین فوق، غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد، خلیفہ عبدالحکیم جو شرفائے ادب میں شرف اولیت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان میں فوق ہی نے سب پر فوقیت حاصل کی جس نے علامہ کی سوانح حیات کشمیری میگزین اپریل 1909 میں شائع کی۔ اس کے بعد مشاہیر کشمیر 1930، نیرنگ خیال 1932 اور تاریخ اقوام کشمیر جلد اول 1934 او رجلد دوم 1934 میں اقبالؔ کے حالات زندگی آبائی گاؤں اور ذات وغیرہ سے بحث کی ہے۔

دوسری معروف شخصیت مولوی احمد دین کی ہے۔ جنھوں نے اقبال پر اردو میں پہلی کتاب 'اقبال' 1924 میں لکھی۔ لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔ اس کتاب میں مولوی احمد دین نے علامہ اقبال کی اردو شاعری کے فکری پس منظر اور ان کے شعری کارناموں پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ 1932 میں معروف ادبی جریدہ 'نیرنگ خیال' کا اقبال نمبر شائع ہوا۔ اقبالیاتی ادب میں خلیفہ عبدالحکیم کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ موصوف نے اقبال کی مختلف جہات سے متعلق ایک کتاب 'فکر اقبال' تصنیف کی۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے مضامین جو اقبالیات سے تعلق رکھتے ہیں وہ مقالات حکیم کے نام سے شائع ہوئے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد جن کی بار آور تحقیقی اور تخلیقی کاوشوں سے اقبالیاتی سرمائے میں قابل قدر اضافے ہوئے۔ موصوف نے اقبالیات کے موضوع پر تقریباً ایک درجن کتابیں اور بیسیوں مقالات تحریر کیے اور علامہ کے فن کو مختلف طریقوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ہی نے پہلی دفعہ 1954 میں کشمیر یونیورسٹی میں اقبال پر تین لکچر دیے اور یہ تینوں لکچر 'اقبال اور اس کا عہد' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ اگر موصوف کی کسی بھی تصنیف کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی کہیں نہ کہیں ذکر اقبال دیکھنے کو ملے گا۔ علامہ کے مختلف فکروفن پر انھوں نے جو خامہ فرسائی کی وہ حسب ذیل ہیں:

(1) اقبال او راس کا عہد (2) اقبال او ر مغربی مفکرین (3) اقبال کی کہانی (4) اقبال اور کشمیر (5) بچوں کا اقبال (6) محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات (7) مرقع اقبال (8) اقبال زندگی شخصیت اور شاعری (9) ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد۔

اقبال کی شخصیت، شاعری اور فکروفن کے بارے میں آزاد کی یہ تخلیقات کشمیر میں اقبالیاتی ادب کے سلسلے میں اہم اضافہ ہے۔

کشمیر میں علامہ اقبال کے فکروفن، فلسفہ اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے میں جن ادیبوں، محققوں او رناقدین نے اہم اور تاریخی کردار ادا کیا، ان میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر اکبر حیدری، پروفیسر محمد عبداللہ شیدا، مرزا کمال الدین شیدا، مرزا غلام حسن بیگ، پروفیسر محمد امین اندرابی، پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر غلام رسول ملک، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر تسکینہ فاضل اور ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور اردو ادب کی ایک نامور شخصیت کے ساتھ ماہر اقبالیات بھی ہیں۔ 21 مئی 1977 میں کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر کو ایک ادارے کی شکل دی او راقبال پر کام کی شروعات کے حوالے سے افتتاحی خطبہ دیا۔ جو 'اقبال کے مطالعے کے تناظرات' کے عنوان سے 1978 میں شائع ہوا۔ اس کتابچے میں موصوف نے اقبال کے متعلق تحقیقی کام کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اقبال کی

شاعری کی شعریت، آفاقیت، عظمت اور ان کے فلسفے کے بنیادی پہلوؤں پر بھی اور ان کے مضمرات پر بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ 'اقبال اور ان کا فلسفہ' لاہور، پاکستان سے 1977 میں شائع ہوئیں۔

تفہیم اقبال کے تناظر میں لکھی گئی ایک اور کتاب 'اقبال کا نظریہ شعر' ہے۔ سرور صاحب نے اقبالیات پر کئی معرکتہ الآرا مضامین کے علاوہ ایک جامع اور وقیع کتاب 'دانشور اقبال' کے نام سے رقم کی جو اقبالیاتی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ یہ کتاب ان بیس مضامین کا مجموعہ ہے جو 1977 سے لے کر 1990 تک مختلف سیمیناورں میں پڑھے گئے۔ ان کے مضامین میں ضرب کلیم کا اسلوب، جبریل وابلیس، اقبال کا فن، اقبال اور نئی مشرقیت اور جدیدیت اور اقبال (1958)، تشخص کی تلاش کا مسئلہ (1984) اور اقبال وغیرہ میں پروفیسر سرور نے اپنی دانش وری اور تخلیقی وتنقیدی محویت سے اردو زبان وادب اور خاص کر اقبالیاتی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری کی شخصیت کشمیر میں اقبال شناسی کے زمرے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اقبالیات پر ان کی چار تصنیفیں ہیں۔ اقبال او رغالب، حرف راز، آئینہ ادراک او راقبال، کا تخلیقی شعور اس کے علاوہ انھوں نے متعدد مضامین قلمبند کیے۔ حامدی کاشمیری نے اپنی کتاب 'اقبال او رغالب' میں نقد ونظر پر اقبال کی قدر سنجی کی خاطر بطور ماڈل غالب کا انتخاب کیا ہے اور اس انتخاب کی دو وجوہ بیان کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ "موجودہ صدی میں غالب کی عظمت پہچاننے والوں میں اقبال کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔" دوسرے یہ کہ حسن اتفاق سے غالب کی شاعری کئی ایسے شعری اور فنی تقاضوں کو پورا کرتی ہے، جو عالمی ادب میں مسلمہ معیار کا درجہ رکھتے ہیں۔

اقبال کا تخلیقی شعور میں مصنف نے اقبال کے تخلیقی سرچشموں کی نشاندہی کی ہے۔ حامدی کی ایک اور تصنیف حرفِ راز جو 1983 میں شائع ہوئی اقبال کی تخلیقی شخصیت سے متعلق ہے۔ آئینہ ادراک میں اقبال کی شاعری اور شخصیت سے متعلق مقالات ہیں۔

اسی نوعیت کی دوسری اہم کتاب پروفیسر قدوس جاوید کی ہے۔ 'اقبال کی تخلیقیت' یہ کتاب سات مقالات پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں کے مصنّفین اردو زبان وادب کے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں نے فکری صلابت او رتنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اقبالیاتی ادب میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ قدوس جاوید کی دوسری کتاب 'اقبال کی جمالیات' بھی قارئین اقبال میں کافی مقبول ہیں۔

پروفیسر اکبر حیدری کا بھی اقبالیاتی ادب میں اپنا ایک الگ مقام ہے۔ کشمیر میں اقبالیاتی مطالعے کے سلسلے میں ان کا کام مجموعی حیثیت سے تحقیقی نوعیت کا ہے۔ علامہ اقبال پر ان کی کتابیں یوں ہیں: (1) اقبالیات کے نئے گوشے (2) علامہ اقبال اور شیخ زنجانی (3) نوادر اقبال (4) زمانہ کانپور او راقبال (5) اقبال ایک مطالعہ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

پروفیسر مرغوب بانہالی کی اقبالیات پر دو کتابیں۔ آدم گریِ اقبال اور اقبال کے روحانی، فکری اور فنی سرچشمے ہیں جن کے مطالعے سے موصوف کی اقبال شناسی او راقبال سے عقیدت مندی کی جہتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک اور علمی شخصیت پروفیسر بشیر احمد نحوی کی ہے۔ وہ نہ صرف کشمیر بلکہ برصغیر کے اقبالیاتی ادب میں ایک درخشندہ ستارے کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ نحوی صاحب کی اقبال پر یہ کتابیں ہیں:

پروفیسر آل احمد سرور — پروفیسر حامدی کاشمیری — پروفیسر اکبر حیدری — ڈاکٹر مشاق احمد گنائی

وہ دانائے سبل، نفحات اقبال، حکیم مشرق، اقبال کی تجلیات، مسائل تصوف اور اقبال، اقبال عرفان کی آواز، اقبال افکار واحوال، اقبال ایک تجزیہ، اقبالیات شمارہ نمبر 12 تا 20۔ انھوں نے اقبال پر متعدد مضامین بھی قلمبند کیے ہیں۔

پروفیسر محمد امین اندرابی نے بھی اقبال پر مختلف کتابیں تحریر کیں، جن میں اقبالیات کے سات شماروں کے علاوہ کئی کتابیں جیسے اقبال اور غزل 1988، اقبال اور فارسی شاعری 1989، اقبال خطبات اور شاعری 1989، اقبال اور قرآن 1996، اور اقبالیات کا تنقیدی جائزہ 1997 شامل ہیں۔

کشمیر میں اقبال شناسوں نے اقبال اور اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل کام کیا ہے او رعلامہ کی فہم و فراست، تخلیقیت اور تنقیدی شعور جیسے پہلوؤں پر بصیرت افروز مقالات تحریر کیے ہیں۔

کشمیر ہی کے ایک اہم رہنما سید علی گیلانی کی کتاب 'اقبال: روح دین کا شناسا' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اقبال کے اسلامی انقلابی اور ملی عشق سے لبریز ہے۔

پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی کی تحریر کردہ کتاب خطبات اقبال کا تنقیدی جائزہ 2002 میں شائع ہوئی۔

پروفیسر تسکینہ کی دو کتابیں 'مطالعہ مثنوی اسرار خودی'، 'اقبال اور ان کے معاصر ادبا وشعرا' ہیں۔

پروفیسر محمد عبداللہ شیدا نے بھی اقبال پر کچھ مضامین تحریر کیے جن میں 'علامہ اقبال اور دعوت رجوع الی القرآن'، 'اقبال او رمعاصر نظام تعلیم'، 'اقبال اور غنی، ایک تقابلی مطالعہ'، 'اقبال شناسی اور حامدی کاشمیری'، 'اقبال اور قرآن' قابل ذکر ہیں۔

اقبالیاتی ادب میں پروفیسر غلام رسول ملک کی اہم کتاب سرودِ سحر آفرینی 1992 میں شائع ہوچکی ہے جو بڑی حد تک اقبالیات کے بارے میں معلوماتی کتاب تصور کی جاتی ہے۔

نامور استاد پروفیسر قاضی صاحب نے اقبالیات سے متعلق مختلف مضامین تحریر کیے ہیں۔ 'معیاروں کی باتیں' جو 'اقبال اور مغرب' نامی کتاب میں چھپا ہے اس مضمون میں قاضی صاحب نے کلیم الدین احمد کے ایک مضمون 'اقبال اور عالمی ادب' میں اقبال پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ایک او رمضمون 'حافظ اور اقبال' میں موصوف نے شعر حافظ اور شعر اقبال کا موازنہ کیا ہے۔

کشمیر کے معروف صحافی اور شاعر غلام نبی خیال کی کتاب 'اقبال او رتحریک آزادی' ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ سید رسول پونپر کی تین کتابیں 'رشحات اقبال'، 'آ بگینے' اور 'پیش آہنگ' وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

کشمیر کے ایک اور جانے پہچانے شاعر جناب حکیم منظور نے اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر ایک مونوگراف اقبال ایک تذکرہ لکھا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کی اقبال پر اب تک چار کتابیں شائع ہوچکی ہیں جو اس طرح ہیں۔ 'اقبال عشق رسول کے آئینے میں'، 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مسلم اعلام'، 'نظریہ اجتہاد کی معنویت' سید بشیر احمد بخاری کا مقالہ 'کلام اقبال کے اعلام و مشاہیر' ڈاکٹر فریدہ کاک کا مقالہ 'اقبال اور کشمیر' او رڈاکٹر ریاض توحیدی کے 'اقبال پر مضامین کا انتخاب' جہان اقبال چھپ چکا ہے اور کشمیر میں اقبالیاتی ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ کشمیر میں اقبال شناسوں کی نئی پود سامنے آرہی ہے اور اقبال شناسی کے میدان میں اہم تحقیقات سامنے آرہی ہیں۔

■

Rukhsana Raheem.,Ph.D Scholar, Dept of Urdu, Kashmir University - 190006 (J&K)

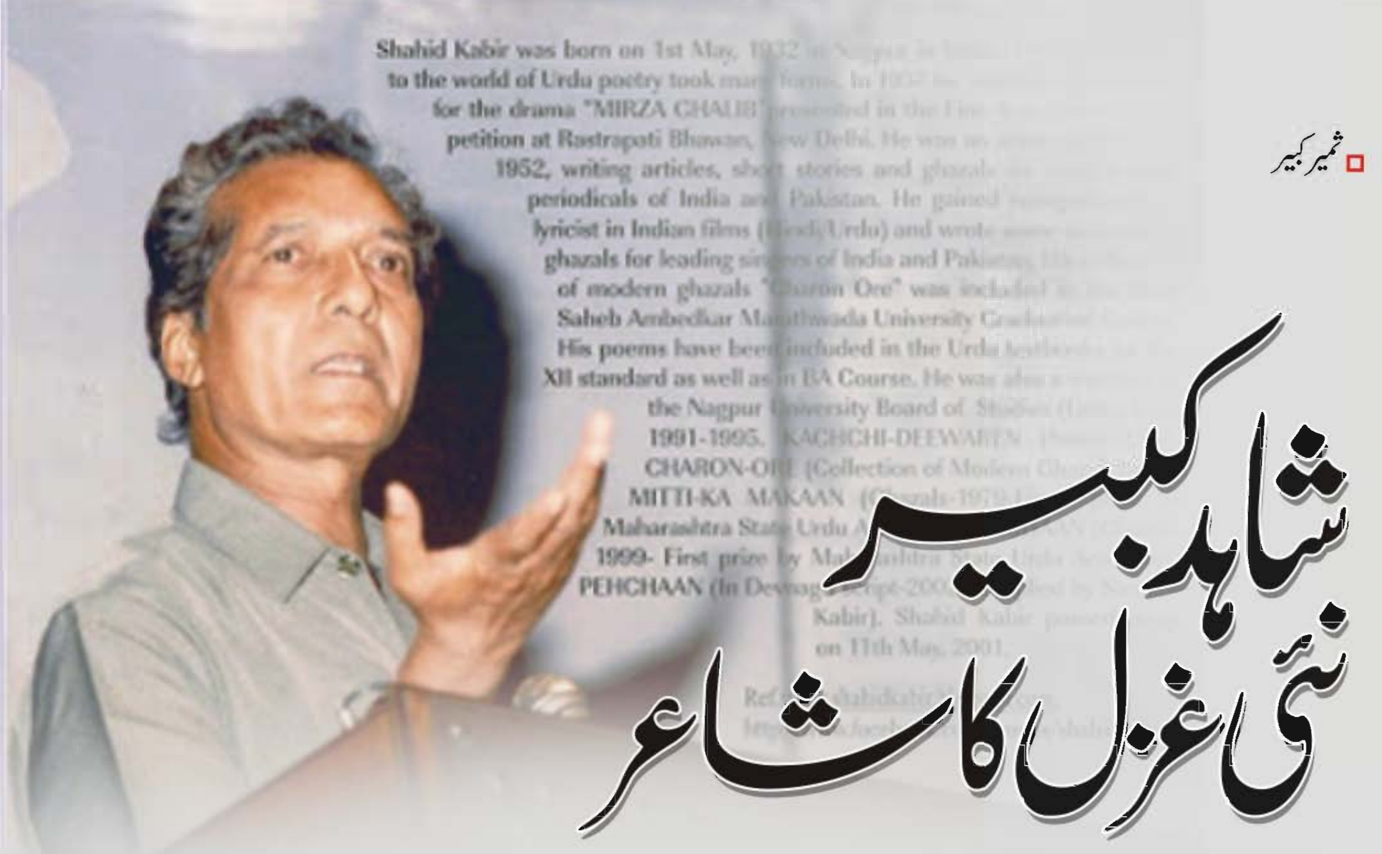

ثمیر کبیر

شاہد کبیر
نئی غزل کا شاعر

غزل 14-13 صدی میں ایران کا سفر طے کرتی ہوئی ہندوستان آئی جہاں پر حضرت امیر خسرو نے جب اس کا دیدار کیا تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر ادا ہوا:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن مورا من پیو کا دونوں بھے اک رنگ

غزل کا یہ سفر قلندروں، فقیروں، صوفیوں کی چوکھٹ سے ہوتا ہوا سنت کبیر داس تک پہنچا جہاں کبیر نے اپنے انداز اور کھڑی بولی سے غزل کو ایک رنگ دیا ہے:

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہے آزاد، یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا

غزل اپنے سفر میں ہر رنگ سے شرابور ہوتی گئی چاہے وہ ولی دکنی، میر، غالب، فراق یا پھر آج کے دور میں شہر یار، ندا فاضلی تک اسی سفر میں غزل ہندوستان کے شہر ناگپور میں 1 مئی 1932 کو شاہد کبیر کے لب و لہجے میں داخل ہوتی ہے۔ ناگپور کا یہ قد آور شاعر ودربھ میں جدید شاعری کا بانی ہے جس کا خاندان 1857 کے انقلاب کے بعد مشرقی یوپی سے ناگپور آیا اور یہیں آباد ہو گیا۔ شاہد کبیر کی شادی 1961 میں کامٹی میں اردو شاعری کے روح رواں منشی محمد سعید کامٹوی کی پوتی اختر النسا خورشید سے ہوئی۔ شاہد کبیر کی ابتدائی تعلیم مومن پورہ اردو پرائمری اسکول میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم انجمن ہائی اسکول میں ہوئی۔ امتحان پاس کرنے کے بعد دہلی میں فوڈ اینڈ مارکیٹنگ کے محکمے میں 1956 میں انھیں سرکاری ملازمت مل گئی۔ تین سال دہلی میں قیام رہا پھر ان کا تبادلہ ناگپور ہو گیا۔ یہاں سے 1990 میں رٹائر ہوئے۔ دہلی قیام کے دوران ان کے مراسم نریش کمار شاد، سلام مچھلی شہری، مخمور سعیدی، زبیر رضوی وغیرہ سے ہوئے۔

اپنے اسکول کے زمانے کے بارے میں وہ یوں لکھتے ہیں:

''شاعری سے مجھے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا البتہ نثر نگاری کی طرف ضرور جھکاؤ تھا بارہ تیرہ سال کی عمر تک میں نے اتنی ہی شاعری پڑھی تھی جو کورس کی کتابوں میں شامل تھی اور صرف اتنا جانتا تھا کہ غزل میں دو مصرع مل کر ایک شعر بنتا ہے جو اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے اور دو سے زیادہ مصرعوں میں ہونے والی بات نظم کہلاتی ہے۔

چھٹیں یا ساتویں جماعت میں غالب کی ایک غزل پڑھنے میں آئی اور مجھ پر اچانک انکشاف ہوا کہ شاعری بڑی عظیم چیز ہے۔ میں نے دو ڈھائی روپے جمع کیے (جو ان دنوں ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی) اور دیوانِ غالب خرید لایا (جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے) اس کتاب کو میں اتنی طبیعت سے پڑھا کہ تین چوتھائی حفظ ہو گیا۔ ان دنوں حافظے کا یہ عالم تھا کہ جو شعر پسند آجاتا ذہن میں محفوظ ہو جاتا۔ نصف دیوانِ غالب تو آج بھی یاد ہوگا۔ اسی دوران نصاب میں ہی میر کی غزل پڑھنے میں آئی:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

یہ غزل سمند شوق پر تازیانہ ثابت ہوئی۔ میں لائبریری سے میر کا دیوان لایا اور اسے چاٹ گیا۔ 1947 کا افراتفری کا عالم تھا۔ کلاسس برابر نہیں لگتی تھیں۔ فرصت ہی فرصت تھی اب میں نثر نگاری کے علاوہ شاعری کی طرف بھی مائل ہونے لگا اور مولانا آزاد، نیاز فتح پوری، خلیل جبران، مجنوں گورکھپوری، پریم چند، شرد چندر، بنکم چندر، ستیہ دیوی چڑ جی، ٹیگور، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی کے علاوہ داغ، جگر، احسان دانش اور فراق وغیرہ کو پڑھنے لگا۔ اس سے شاعری کا چسکا تو نہیں لگا مگر شاعروں میں اٹھنے بیٹھنے لگا جو یقیناً عمر میں مجھ سے زیادہ ہوا کرتے تھے۔ ادب سے ان کا کلام سنتا اور بڑے احترام سے رائے زنی بھی کرتا۔ پھر رفتہ رفتہ مشورے دینے کی بھی ہمت ہو گئی۔

آٹھویں جماعت میں ٹیچر نے کلاس میں ہی تاج محل پر ایک مضمون لکھنے کے لیے کہا میں نے فوراً مضمون لکھا اور دکھا دیا۔ ٹیچر نے سمجھا کہ میں نے کسی کتاب سے نقل کیا۔ یہ میرے بستے کی تلاشی لینے کے بعد بھی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے باقاعدہ کہانیاں لکھنی شروع کردی جو ماہ نامہ 'شاعر' میں چھپتی بھی تھی۔''

شاہد کبیر اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے ہی ہندوستان اور پاکستان کے گلوکاروں کی پسند بن گئے تھے جو ان کی اسٹیج پر مقبولیت اور ہندوستان اور پاکستان کے مختلف جرائد اور رسائل میں ان کے کلام کی اشاعت کی وجہ سے تھی اس لیے دونوں ملکوں کے نامور گلوکاروں نے ان کے کلام کو آواز دی جن میں Lata Mungesh Kar, چترا سنگھ، جگجیت سنگھ، ہری ہرن، چندن داس، پنکج ادھاس، عزیز نازاں وغیرہ اور پاکستان میں استاد رئیس خان، منی بیگم، سلمان علوی، صابری بردرس وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

اس کے علاوہ شاہد کبیر کی غزلوں کو ناگپور یونیورسٹی کے

جی اے کورس میں اور مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ نے 12ویں جماعت میں شامل کیا۔ اردو دنیا میں جدید غزلوں کا انتخاب ’چاروں اور‘ کے نام سے شاہد کبیر نے 1968 میں ڈاکٹر مدحت الاختر کے ساتھ مل کر مرتب کیا اس کی مقبولیت کے پیش نظر مراٹھواڑہ یونیورسٹی نے اسے بی۔ اے کے کورس میں شامل کیا۔ ادب کی دنیا میں ناول نگاری سے شروعات کرنے والا یہ شاعر ایک ناول ’کچی دیواریں‘ کا بھی مصنف ہے جو کہ 1958 میں دہلی سے شائع ہوئی۔

شاہد کبیر کا پہلا مجموعہ کلام ’مٹی کا مکان‘ 1979 میں منظرِ عام پر آیا جس پر انھیں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا اول انعام حاصل ہوا۔ اُس کے 20 سال بعد شاہد کبیر کا دوسرا مجموعہ کلام 1999 میں ’پہچان‘ نام سے منظرِ عام پر آیا اس پر بھی انھیں مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کا اول انعام حاصل ہوا بعد میں اس کتاب کو ثمیر کبیر نے دیوناگری میں بھی شائع کروایا۔

غزل نے میر و غالب کے دور سے لے کر جدید دور کی ترجمانی کی ہے۔ جدید شاعری دراصل دل کو بہلانے کا سامان نہیں ہے بلکہ انسانوں کو انسانوں سے جوڑتی اور ان کو بنیادی اصولوں سے آشنا کرواتی ہے۔ اِس جدید شاعری کے قافلے میں بہت سے شاعر آئے اور اپنے اپنے انداز سے اُسے سنوارتے رہے اور پھر اس قافلے کو چھوڑ کر چلے گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اب بھی اپنے انداز و بیان کی وجہ سے ہر خاص و عام میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اس قافلے میں ایک نام جناب شاہد کبیر کا تھا۔ اردو غزل میں اس قدر طبع آزمائی ہو چکی ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر کوئی شعر نہ کہا گیا ہو۔ اس کے باوجود غزل اس لیے مقبول و محبوب ہے کہ اس میں ہر موضوع کو نئے ڈھنگ سے برتنے یا اس میں اضافہ کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

اکثر باتیں وہی ہیں مگر سوچنے کا نظریہ اور اندازِ بیان بدلتا رہتا ہے جو شاعر کے فکر کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال مومن خان مومن کے اس شعر سے دی جاسکتی ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے اس شعر کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہد کبیر کہتے ہیں:

تم بھی پاس نہیں گویا
آج میں اتنا تنہا ہوں

یا پھر غالب کا یہ شعر:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہی سوچ جب شاہد کبیر کے ذہن میں داخل ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے:

کیے ہیں اتنے جہاں اور اک کرم کردے
مرے خدا تو میری خواہشوں کو کم کردے

شعر کے ایک ایک لفظ کو چن کر دھاگے میں موتی کی طرح پرونا اور اس کے معنی کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنا شاہد کبیر کی شاعری کی خاصیت رہی ہے۔ اس لیے یہ بات بہت عام تھی کہ ان کی پوری غزلیں لوگوں کو زبانی یاد ہوجاتی تھیں جس کا اندازہ ہم درج ذیل شعروں سے لگا سکتے ہیں:

یقیں مجھے بھی تو اس بات کا دلانے آ
تو مجھ کو بھول چکا ہے یہی بتانے آ
حقیقتوں کا سبھی کو پتہ نہیں ہوتا
کوئی کسی سے بچھڑ کر جدا نہیں ہوتا

شاہد کبیر کی سوچ سماج میں پھیل رہی سفید پوش بیماری کو بخوبی جانتی تھی مگر وہ اس سے مایوس بالکل نہیں تھی ان کی شاعری حوصلہ مندی کی مثبت شاعری ہے جو برائی سے لڑنے کا ہنر سکھاتی ہے اور جس کی مثال ہم ان شعروں سے دے سکتے ہیں:

آپ کتنا ہی سنور جائیں کمی رہتی ہے
دل میں جو میل ہے چہرے پہ جمی رہتی ہے
دل سے ملنے کی تمنا ہی نہیں جب دل میں
ہاتھ سے ہاتھ ملانے کی ضرورت کیا ہے
ہر اک ہنسی میں چھپی خوف کی اداسی ہے
سمندروں کے لیے بھی زمین پیاسی ہے
کبھی کبھی تو کوئی شرط رکھ کے ملتا ہے
کہیں کہیں سے ترا پیار بھی سیاسی ہے

کسی بھی سچے فنکار کے اندر ایک ایسا دل پایا جاتا ہے جو دوسروں کے غم و تکلیف کو برداشت نہیں کر پاتا اور اپنے قلم و برش کے ذریعے اپنے اندر کے جوش کو بیان کرتا ہے۔ یہی سوچ ہمیں شاہد کبیر کے یہاں ملتی ہے:

خود اپنے سے سہمے ہوئے انسان بہت ہیں
اِس شہر میں تفریح کے سامان بہت ہیں
کیا ان سے نکل جائے گی کمرے کی اداسی
فٹ پاتھ پہ بکتے ہوئے گلدان بہت ہیں
یہ سچ ہے کہ ہم دھوپ میں گھبرائے ہوئے تھے
سائے میں پہنچ کر بھی پریشان بہت ہیں
جب ہم ہی گزرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں دشوار
ورنہ یہ سبھی راستے آسان بہت ہیں

اردو غزل کا مزاج عاشقانہ نہ ہو تو شاید غزل کی تعریف مکمل نہیں ہے:

آج ہم بچھڑے ہیں تو کتنے رنگیلے ہوگئے
مری آنکھیں سرخ تیرے ہاتھ پیلے ہوگئے
زندگی ہم سے یوں کرتا کہ یہ گزری جیسی
کھینچ کر رخ پہ گزر جاتا ہے گھونگھٹ کوئی

شاہد کبیر کی شاعری میں عشق کا دخل کمزور نہیں بلکہ زیادہ طاقت ور ہے:

اک ضد ہے کہ دیکھوں ترے قدموں کی سکت بھی
تو دور نہیں ورنہ مرے دستِ رسا سے
کچھ تو اپنی بھی طبیعت کا پتہ دینا تھا
اُس نے جب ہاتھ ملایا تھا دبا دینا تھا
اگتے سورج کی کرن سرخ دوپٹے سے نہ چھان
صبح کی دھوپ سے یوں شام کا منظر نہ بنا
یہ بات الگ ہے کہ کانٹوں پہ میں سویا ہوں
ورنہ میرے آنکھوں کا ہر خواب سنہرا ہے
صرف رنگت نہیں خوشبو بھی جدا ہو جن کی
خود کو وہ کیسے چھپائے گا جہاں بھی ہوگا

شاہد کبیر 1/اپریل 2001 کو حج بیت اللہ سے لوٹے تھے طبیعت کی خرابی کے باعث اسپتال میں داخل کیے گئے۔ ڈاکٹروں نے دماغ کا کینسر قرار دیا آپریشن ہوا پندرہ دن بعد صحت یاب ہوکر لوٹے لیکن 11 مئی نماز جمعہ کے وقت ان کی طبیعت اچانک بگڑی اور وہ آناً فاناً اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آب زمزم سے دھل کر سِلے ہوئے کفن میں ان کا مسکراتا چہرہ بہت بھلا لگ رہا تھا:

وہ ہنس رہا تھا دور کھڑا اور چند لوگ
لے جا رہے تھے اس کو کفن میں لپیٹ کے

■

Sameer Kabir, B/12, Faraz Apartment, Jafarnagar, Nagpur- 440013 (MS)

سمیع الدین خاں 'شاداب'

2015

نئے سال کا فائدہ اٹھائیں

ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ نیا سال اس کی زندگی میں کچھ نیا لے کر آئے اور اسی لیے ہر شخص کچھ نئے ارادے کرتا ہے۔ ان ارادوں کو اگر سنجیدگی سے عملی جامہ پہنایا جائے تو یقینا شخصیت میں نکھار آئے گا۔ اس سال کے لیے ہم کچھ مشورے، کچھ ارادے لکھ رہے ہیں، خصوصاً اپنے نوجوان ساتھیوں اور طلبا کے لیے تاکہ وہ ان ان پر غور کریں اور ان کو اپنی زندگی میں اپنائیں اور پھر دیکھیں یہ سال آپ کے لیے کتنی خوشیاں لے کر آئے گا۔

سب سے اوّل صحت: کہا جاتا ہے 'تندرستی ہزار نعمت ہے' اور تندرستی وصحت کا راز پوشیدہ ہے ہماری روزمرہ کی عادتوں، غذا اور صحت کے بارے میں آپ کے نظریے میں۔

مضبوط ارادہ کریں کہ اپنی روزمرہ کی عادتوں میں صبح سویرے کی چہل قدمی، ورزش اور یوگا وغیرہ کو ضرور شامل کریں گے۔ اس کی شروعات پہلے چھوٹے پیمانے پر کریں اور رفتہ رفتہ بڑھاتے جائیں اور ہاں! یہ بات خاص طور سے یاد رکھیں کہ اس کام میں مستقل مزاجی نہایت ضروری ہے۔ یہ عادت نہ صرف آپ کو تر وتازہ رکھے گی بلکہ بہت سی بیماریوں سے بھی بچائے گی۔ آپ یقین کریں کہ جسمانی طور پر چاق و چوبند رہنے (Fitness) کا تعلق براہِ راست آپ کے کریئر سے ہے کیونکہ اگر آپ تندرست نہیں ہوں گے تو آپ کسی بھی مقابلے (Competition) کی تیاری صدفی صد صحیح طور پر نہیں کر پائیں گے۔ اپنے کیے ہوئے ارادوں کی تکمیل کے لیے بھی آپ کو اچھی صحت چاہیے۔ اس لیے اس سال اپنی عادتوں میں ان کاموں کو نہایت مستقل مزاجی سے شامل کریں جو آپ کی صحت وتندرستی میں مزید سدھار لائیں یا اضافہ کریں۔

اپنی خامیوں کو تسلیم کرنا سیکھیں: اپنی غلطیوں اور کمیوں کو تسلیم نہ کرنا کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ نئے سال کے لیے ارادہ کریں کہ اپنی کمیوں کو پہچانیں گے اور نہ صرف پہچانیں گے بلکہ ان کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔ یہ ارادہ آپ کے کریئر کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اپنی خامیوں کو پہچاننا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان کو تسلیم کر لینا ایک مضبوط قوت ارادی کی دلیل ہے۔ اگر آپ نے اپنی خامیوں کو پہچان لیا اور ان کو دور کر لیا تو یقینا ہر مشکل آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی اور پھر کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

مثبت سوچ ضروری: ہمارے بہت سے نوجوان خصوصاً طالب علم علمی طور پر کافی بہتر ہوتے ہیں لیکن ان میں خوداعتمادی کی کمی ہوتی ہے اور اسی لیے وہ عین مقابلے کے وقت ہی ڈگمگا جاتے ہیں اور کامیابی ان سے دور چلی جاتی ہے۔ اس سال آپ ارادہ کریں کہ مثبت سوچ میں آپ آگے بڑھیں گے مثبت سوچ کسی بھی شخص کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے نظریات کو یکسر بدل سکتی ہے۔ مثبت سوچ کا کامیابی سے سیدھا تعلق ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کو کامیابی حاصل کرنے میں ذرا سا بھی شک ہے تو اب اس کی ناکامی کے مواقع زیادہ بڑھ گئے۔

ہمیشہ سیدھے اور صاف طریقے سے سوچیں۔ اپنی سوچ کو بیمار اور بوڑھا نہ ہونے دیں۔ سوچ کو ہمیشہ جوان اور صحت مند رکھیں۔

مطالعہ کی عادت ڈالیں: مطالعے کی عادت بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی نے ایک پھل دار درخت لگایا اور اس کو روزانہ پانی دیتا ہو، وقتاً فوقتاً اس کی جڑوں میں کھاد ڈالتا ہے او ر ہر طرح سے اس کی دیکھ بھال کرتا ہو تو یہ پیڑ ایک دن ضرور پھل اور سایہ دے گا۔

نئے سال میں آپ روزانہ کوئی اخبار پڑھنے کے ساتھ ہی ہر ماہ کوئی ایک اچھی کتاب، کوئی ترغیب عمل دینے والی کتاب، کوئی تعمیر شخصیت کرنے والی کتاب ضرور پڑھیں۔

ہر ماہ کی پہلی تاریخ یا کوئی بھی تاریخ جو آپ نے طے کر لی ہو، اس دن آپ ایک عمدہ کتاب پڑھنا شروع کریں اور پورے مہینے اس کو سمجھ سمجھ کر تھوڑا تھوڑا اس طرح پڑھیں کہ وہ ایک ماہ میں پوری ہو جائے۔ اچھا ہوگا کہ آپ ایک ڈائری پاس رکھیں اور اس کتاب میں آنے والی عمدہ باتیں، اقوال، معلومات وغیرہ کو نوٹ کرتے جائیں۔

مختلف کتب سے جو معلومات آپ کو حاصل ہوں گی، وہ یقینا آپ کی لیاقت اور صلاحیت کو بڑھائیں گی اور ساتھ ہی سماج میں آپ کو ایک اچھا اور باعزت مقام دلانے میں معاون ہوں گی۔

اپنی 'اُس' عادت کو بدلیں: آپ خوب اچھی طرح

جانتے ہیں کہ ایک عادت آپ میں ایسی ہے جو آپ کو کامیابی دلانے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ آج ہی بلکہ ابھی ارادہ کریں کہ ہر حال میں آپ 'اُس' عادت کو بدل ڈالیں گے۔ آپ کو ایسی عادت کو بدلنے میں کچھ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے اور بار بار ناامیدی بھی ہوسکتی ہے لیکن آپ میدان میں ڈٹے رہیں، اس سوچ کے ساتھ کہ بالآخر فتح آپ کی ہی ہونی ہے اور جس وقت آپ کو یہ فتح نصیب ہوگی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت آپ کو ایک بہت بڑی اور یادگار خوشی حاصل ہوگی۔ ہوسکتا ہے آپ تا عمر 'اُس' بری عادت کو چھوڑنے کا ذکر دوسرے لوگوں سے کریں اور دوسرے لوگ بھی آپ سے ترغیب حاصل کریں۔

ڈائری میں لکھے ارادوں کا آپ تجزیہ بھی کرسکتے ہیں کہ آپ ان ارادوں پر عمل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہیں اور وہ کیا رکاوٹیں ہیں جو آپ کی کامیابی کی راہ میں آجاتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا حل تلاش کریں اور ان کو بھی اپنی ڈائری کے صفحات پر نقش کردیں۔
نئے سال میں ان چند تدابیر اور باتوں کو اپنی زندگی میں اپنائیں اور پھر دیکھیں یہ سال آپ کے لیے کتنی خوشیاں لے کر آئے گا۔

ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس کی ناکامی کے پیچھے اس کی کسی عادت کا ہاتھ ہے۔ بس ضرورت ہے محنت کی۔ محنت 'اُس' عادت کو بدلنے کی۔

رہبر: ہم جس میدان (Field) میں بھی جانا چاہتے ہوں اور اپنے کریئر کا چناؤ کسی شعبے میں کرنا چاہتے ہوں تو ہمیں ایک رہبر کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کامیابی کی راہ دکھانے والا ایک پرخلوص رہبر یا ایک ترغیب از حد ضروری ہے۔ یہ رہبر ہمارے فیلڈ کی باریکیاں سمجھاتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ ہماری ان کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو ہماری ترقی اور کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس کے لیے ہمارے رہبر کو کافی باریک بین اور صاف گو بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے اس سال آپ ایک اچھا سا راہ نما ضرور تلاش کرلیں کیونکہ آپ کا رہبر آپ کو وہ شارٹ کٹ بھی بتائے گا جو آگے بڑھنے میں آسانی پیدا کریں گے۔

معمے ضرور حل کریں: ہمارا یہ دور مقابلہ جاتی امتحانات کا دور ہے اور ان مقابلہ جاتی امتحانات میں ایک بڑی تعداد میں وہ سوالات ہوتے ہیں جن کے ذریعے ہمارے دماغ کی تیزی کو پرکھا جاتا ہے۔ دماغ کی تیزی پرکھنے کے لیے ایک کسوٹی ہے 'معماتی' (Reasoning) سوالات۔ ان سوالات کو حل کرنے کے لیے کوئی خاص ترکیب نہیں ہوتی بلکہ ان کو حل کرنے کا طریقہ آپ کو عین وقت پر نکالنا ہوتا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب کہ آپ کا دماغ تیز ہو یعنی معمہ حل کرنے کی تیز صلاحیت رکھتا ہو۔ اس صلاحیت کو حاصل کرنے کے لیے ضروری یہ ہے کہ بلا ناغہ اس ورڈ معمے، پزلس (Puzzles) سوڈوکو وغیرہ حل کیے جائیں۔ اس سے 'معماتی' سوالات کو حل کرنے میں آپ کے دماغ کی مشق ہوتی رہے گی۔ یہی نہیں بلکہ دماغ کی قوتِ فیصلہ بڑھے گی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں حالات کو جلد اور زیادہ سہی سمجھنے کی قوت بھی حاصل ہوگی۔

اپنے لیے ایک 'آئیڈیل' چنیں: اپنے کریئر میں آگے بڑھنے اور مسلسل ترقی حاصل کرنے کے لیے ایک آئیڈیل چن لینا بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے فیلڈ سے متعلق ہی کسی کامیاب شخصیت کو اپنا آئیڈیل چنیں تو زیادہ بہتر ہوگا وہ شخص جس نے اپنی محنت اور لگن سے کوئی خاص مقام حاصل کیا ہو اس کی شخصیت آپ کے لیے بطورِ نمونہ سامنے رہنا چاہیے اور ہر وقت آپ کو خود کو بھی اسی طرح آگے بڑھنا کو اُکسانا ہے جس طرح آپ کا آئیڈیل آگے بڑھا۔ آپ اس کو ہر وقت رشک کی نظر سے دیکھیں حسد کی نگاہ سے نہیں ورنہ آپ کے لیے یہی آئیڈیل منفی سوچ پیدا کرنے والا ہوجائے گا۔

ترغیب: کامیابی حاصل کرنے کے لیے ترغیب کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ جو لوگ ناامید کردینے والے حالات میں بھی کسی مثبت چیز سے ترغیب لے کر آگے بڑھتے رہتے ہیں وہی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے بچپن میں وہ کہانی ضرور پڑھی ہوگی جس میں ایک بادشاہ اپنے دشمنوں سے ہار کر ایک غار میں جا چھپا تھا۔ وہ بہت مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہوچکا تھا۔ وہ بہت افسردہ بیٹھا ہوا تھا کہ اسی درمیان اس نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنے سے بڑے شکار کو دبوچے غار کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہی ہے۔ وہ کئی بار دیوار سے گری لیکن اس چھوٹی سی چیونٹی نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار ایک بار کوشش کرکے وہ دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس واقعے نے اُس بادشاہ کو کچھ ایسی ترغیب دی کہ وہ غار سے باہر آیا اس نے دوبارہ فوجیں جمع کرکے دشمن پر دھاوا بول دیا اور اپنی ہمت اور حوصلے کے بل بوتے اپنے دشمن کو پسپا کردیا۔

ترغیب کے عوامل ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے تو ان کو چننے کی اور ان سے ترغیب حاصل کرنے کی۔ اس سال ارادہ کریں کہ ایک ایسا شخص، ایک ایسی بات ضرور حاصل کریں گے جو ہر قدم پر آپ کے لیے ترغیب ور ہنما ثابت ہوگی۔

آخری بات: آپ یقیناً ان تمام ارادوں سے بہت متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن مجھ کو یہ بھی یقین ہے کہ آپ ان کو چند دن میں ہی بھول جائیں گے۔ اس لیے ان کو ایک خاص ڈائری میں لکھ لیں اور ہفتے میں کم سے کم ایک بار ان کو ضرور پڑھ لیں اور ہاں! ان کو محض پڑھ لینے سے ہی کام نہیں بنے گا بلکہ ان کے مطابق آپ اپنا ٹائم چارٹ تیار کریں۔ اس سے آپ ان ارادوں کو بروئے کار لانے میں اپنی طرح سے اپنی سہولیات کے مطابق ایک لائحہ عمل تیار کرسکیں گے اس طرح ٹائم ٹیبل کی منصوبہ بندی کے فوائد آپ کو حاصل ہوسکیں گے اور ساتھ ہی آپ ارادوں کو جانے کے بہت بڑے نقصان سے بچ جائیں گے۔

ڈائری میں لکھے ارادوں کا آپ تجزیہ بھی کرسکتے ہیں کہ آپ ان ارادوں پر عمل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہیں اور وہ کیا رکاوٹیں ہیں جو آپ کی کامیابی کی راہ میں آجاتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا حل تلاش کریں اور ان کو بھی اپنی ڈائری کے صفحات پر نقش کردیں۔

نئے سال میں ان چند تدابیر اور باتوں کو اپنی زندگی میں اپنائیں اور پھر دیکھیں یہ سال آپ کے لیے کتنی خوشیاں لے کر آئے گا۔

Dr. Sameeuddin Khan 'Shadab', Masjid Zuhooruddin, Gojar Tola, Rampur- 244901 (UP)

تبصرہ وتعارف

کلیات کمارپاشی، جلد اوّل وجلد دوم

مرتب: چندر بھان خیال، سنہ اشاعت: 2014
صفحات: دونوں جلدیں: 942
قیمت جلد اوّل: 166، جلد دوم: 157 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، بیت الرضیہ، G-5/A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

کمار پاشی اردو کے جدید شعرا میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تقسیم وطن کے موقع پر وہ پاکستان سے ہجرت کر کے اپنے خاندان کے ساتھ دہلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ کمار پاشی کی شاعری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کی قدیم تہذیب کی زلف کے اسیر رہے۔ انہوں نے پرانے موسموں کی آواز کو نئے رنگ و آہنگ کی آواز میں پیش کر کے ایک منفرد شناخت قائم کی۔ ان کی اسی شناخت کی بدولت انھیں قدیم وجدید رنگ کا شہنشاہ کہا جانا چاہیے۔ وہ عصر حاضر کے انسانی مسائل کو سمجھنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ چندر بھان خیال نے بالکل درست لکھا ہے کہ کمار پاشی کی شاعری سلگتے اندھیروں میں ایک جگنو کی مانند چمکتی نظر آتی ہے۔ جب اندھیرا مطلق العنان حکمراں کی طرح تمام ماحول پر قابض اور غالب ہوتو ایک جگنو بھی روشن ستارہ بن جاتا ہے۔ یہاں پر پروفیسر عتیق اللہ کا بیان بھی پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے کہا کہ نئے نئے اسطور خلق کرنے والا شاعر جو ہمیشہ نامعلوم حقائق کی جستجو میں سرگرم رہتا تھا، اپنے سرّی کروں کو تج کر پہچان میں آنے والی دنیا کو لمحہ لمحہ رقم کرنے لگا ہے۔ کمار پاشی نے حقیقت سے نیا رشتہ قائم کیا ہے۔

پیش نظر کتاب اسی شاعر کی کلیات ہے، جس کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے دو جلدوں میں پورے اہتمام کے ساتھ خوب صورت طباعت اور معیاری کاغذ پر طبع کیا ہے۔ حالانکہ ان کی طویل نظم 'ولاس یاترا' یا پھر 'پرانے موسموں کی آواز'، 'خواب تماشا' اور 'انتظار کی رات' جیسی بیشتر تخلیقات پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ لیکن میں یہاں ایک مختصر نظم 'بدن سے باہر' پیش کر رہا ہوں، جس میں کمار پاشی نے موسم، سکھ، چین اور ڈوبتے ابھرتے مناظر کی بڑے دلنشیں انداز میں عکاسی کی ہے:

سکوں کا موسم ہے/ سکھ کے بے چین سر د جھونکے
نہ دکھ کے سایوں کی گرم لذت/ فقط نگاہوں کے سامنے ڈوبتے ابھرتے
عجب مناظر/ اور ان مناظر کی وسعتوں میں/ تر اہی جادو ہے/ اور تو ہے
انھی مناظر کی وسعتوں میں/ سکوں کا موسم ہے/ اور میں ہوں

نظموں کی طرح کمار پاشی نے غزل میں بھی انفرادیت قائم کی ہے۔ ان کی غزلیں نئے تیور اور نرم لہجے کے ساتھ معنویت کے لحاظ سے اپنی تہذیبی جڑوں سے ایسی وابستگی رکھتی ہیں کہ جس کی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ ان کے سینے میں حساس اور دردمند دل بھی دھڑکتا تھا۔ وہ انسانیت کے درد کو خوب سمجھتے تھے اور پھر اسے شعری جامہ پہناتے تھے۔ بقول گوپی چند نارنگ شاعری کی قدر وقیمت کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔ وقت یعنی اس کے قارئین کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہاں یہی جسم کا ملبوس کہ ہے وجہ زوال
ہاں یہی روح کا آزار لیے پھرتے ہیں

دیکھے کوئی جا کر مرے مٹنے کا تماشا
تنہا میں کھڑا ہوں کسی جلتے ہوئے گھر میں

گئی رتوں کے حوالے سے یاد کر مجھ کو
جسے تو بھول گیا ہے، وہی تو قصہ ہوں

دوسری جلد کے حصہ شاعری میں 'اک موسم مرے دل کے اندر'، 'اردھانگی کے نام' اور 'چاند چراغ' کو شامل کیا گیا ہے۔ اس جلد کی شاعری پر گفتگو میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ کمار پاشی نے اپنی شاعری کی جملہ خصوصیات میں اضافہ ہی کیا ہے۔ اس حصے کا آغاز ایک مناجات سے ہوتا ہے:

اپنی پہچان کھو چکا ہوں/ میری بے چہرگی کو چہرہ دے
میری رسوائیوں پہ پردہ رکھ/ میری عریانیوں کو کپڑا دے

....

اس کے بعد غزل کا یہ شعر بھی پڑھیے:

دے گا وہ عائیں بھی کہ سایہ رہے مجھ پر
راہوں میں مگر پیڑ اگانے بھی نہ دے گا

حصہ نثر جو شامل کتاب ہے، اس میں پہلے آسمان کا زوال (کہانیاں) ہیں اور جملوں کی بنیاد یک بابی ڈرامے ہیں۔

مخمور سعیدی نے کمار پاشی سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''کمار پاشی ایک ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کا نام تھا۔ اس نے شعر گوئی کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے اور یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ جن لوگوں نے اس کے افسانوں کا مجموعہ 'پہلے آسمان کا زوال' اور ڈراموں کا مجموعہ 'جملوں کی بنیاد' پڑھا ہے، وہ میرے خیال سے اتفاق کریں گے۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کمار پاشی نے ایک رسالہ سہ ماہی 'سطور' بھی جاری کیا تھا۔ اس رسالے میں کمار پاشی نے مختلف ادبی مسائل پر جو اظہار خیال کیا اس کا وزن ووقار اس وقت بھی محسوس کیا گیا تھا، اب بھی محسوس کیا جا رہا ہے اور آئندہ بھی اس کے چرچے ہوتے رہیں گے۔

یقین ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ پیشکش اس کی دوسری کتابوں کی طرح پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی اور قبول عام کی سند حاصل کرے گی۔

ہندوستان کے مشہور اَطبّا

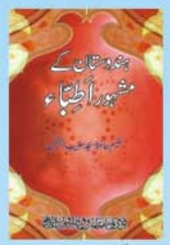

مصنف: حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن
صفحات: 273، قیمت: 109، روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: حکیم سید احمد خاں
اعزازی قومی سکریٹری جنرل، آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس، D-49، نیوسیلم پور، دہلی 53

زیر تبصرہ کتاب حکیم حافظ سیّد حبیب الرحمٰن کی تصنیف کردہ ہندوستان کے مشہور اطبا 19 حکما کی حیات و خدمات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے ہندوستان میں اردو زبان وادب کے فروغ وترقی کے لیے قائم مرکزی حکومت کے سب سے بڑے ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 2014 میں شائع کیا ہے۔

حکیم حافظ سیّد حبیب الرحمٰن ایک تحریکی شخص ہیں جو سرگرمی کے ساتھ ہندوستان میں قومی سطح پر کام کرنے والی تاریخی طبی تحریک آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس سے وابستہ رہے ہیں اور دوسری تنظیم آل انڈیا یونانی طبی کانگریس (یوپی) شاخ سے بھی اُن کی وابستگی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ حبیب الرحمٰن وسیع النظر اور طب یونانی کے بہی خواہ ہیں۔ ان کے نزدیک طب یونانی کی ترویج وترقی مقدم ہے اور طب یونانی کے مسائل اور یونانی اطباء کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور مشکلات کے ازالے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

تاریخ طب بڑا وسیع میدان ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اپنا دائرہ محدود کرتے ہوئے کتاب کا عنوان ہندوستان کے مشہور اطباء رکھا۔ حالانکہ اس دائرے میں ایک بہت مشہور حکیم الیاس خاں شامل کیے جاسکتے تھے کیونکہ موجودہ جامعہ ہمدرد کے اصل بانی وہی تھے۔ انھوں نے جامعہ طبیہ دہلی 1935 میں قائم کیا تھا جسے حکیم الیاس خاں نے اپنے انتقال سے پہلے ایک وصیت کے ذریعے جامعہ طبیہ دہلی کو حکیم عبدالحمید کی تولیت میں دے دیا تھا جسے حکیم عبدالحمید نے مزید پروان چڑھایا اور آج وہ جامعہ ہمدرد میں ایک فیکلٹی کے طور پر موجود ہے۔ یہاں پر یہ تذکرہ برمحل ہوگا کہ ایک ایسے حکیم کا تذکرہ اس کتاب میں ندارد ہے جس نے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی ہے جو یونانی طب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف کو اس پر غور کرنا چاہیے یا کم از کم حکیم الیاس کے عدم شمولیت کی وجہ کا تذکرہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال حافظ حکیم سیّد حبیب الرحمٰن نے جن 19 حکما کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی ہے اُس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کے نام سے پہلے اُن کے کارناموں کی مناسبت سے تحریر کیا ہے مثلاً حکیم عبدالحمیدؒ کو انھوں نے بھارت میں کاروان طب کا سپہ سالار و پدم شری حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی تحریر کیا ہے۔ اس سے حکیم عبدالحمید کے اوصاف، کارنامے، یونانی طب سے متعلق سرگرمیاں فوراً نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اسی طرح شہنشاہ تصنیفات نازش طب علامہ حکیم کبیرالدین، حکیم کبیرالدین صاحب کے لیے القاب وخطاب سے موسوم کیا ہے۔ مصنف کی یہ کتاب تاریخی حوالے کے ساتھ آسان اردو زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب علمی وطبّی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور جو لوگ متعلقہ طب پر کام کر رہے ہیں ان کے لیے مزید کارگر ثابت ہوگی۔ خاص طور سے آج کی نسلوں کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کتاب کو شائع کرکے اطبائے کرام پر احسان کیا ہے۔ ہم اس کے لیے ادارے کے ممنون ہیں۔

بے زبان ساتھی

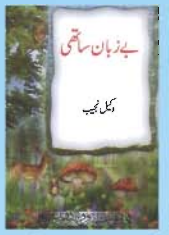

مصنف: وکیل نجیب
صفحات: 64، قیمت: 19 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: رضی شہاب، روم نمبر 016، نرمدا ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی

تعلیم ایک ایسا زیور ہے جو بچے کو صحیح غلط کے درمیان تفریق کرنے کا مادہ عطا کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ذہنی شعور وسطح کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تخلیقات پیش کی جائیں اور یہ کام اردو میں کچھ لوگ نہایت بہتر انداز میں کررہے ہیں۔ وکیل نجیب کا نام ایسے تخلیق کاروں میں سرفہرست ہے جو ایک لمبے عرصے سے بچوں کے لیے بیش بہا تخلیقات پیش کررہے ہیں۔ ان کے درجنوں ناول اور دیگر کتابیں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ کچھ دنوں قبل ان کا ایک ناول 'مسیحا' سامنے آیا تھا اور اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 'بے زبان ساتھی' کے نام سے ان کی ایک کتاب شائع کی ہے جو بچوں کے لیے ایک ناول یا ایک طویل کہانی ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت 1985 میں ہوئی تھی۔

وکیل نجیب کو بچوں کے لیے لکھنے کا ایک لمبا تجربہ ہے اس لیے ان کی تحریر اور ان کے اسلوب میں وہ شعوری کوشش نظر آتی ہے جو بچوں کو اپنی طرف راغب کرسکے۔ انھوں نے اپنے اس ناول میں بھی وہی زبان استعمال کی ہے جو بچوں کے ذہنی معیار سے بلند نہ ہو۔ اسلوب عام فہم اور نہایت ہی سادہ ہے۔

'بے زبان ساتھی' جنید نامی ایک بچے کی کہانی ہے جو ایک غریب ماں کا بیٹا ہے۔ اس کی ماں زمیندار کے یہاں کام کرتی ہے اور ایک ڈاکو گاؤں کو لوٹنے کے بعد زمیندار کا گھر لوٹنے کے بعد اس کے گھر کو آگ لگا دیتا ہے جس میں اس کی ماں فوت ہوگئی۔ اس کے بعد اس کی زندگی تبدیل ہوگئی اور اس نے اپنی زندگی میں ایمانداری، محبت اور محنت سے ایسے ایسے کام کیے جس سے بہت سے لوگوں کو خوشیاں ملی۔ اس نے یہ کام اپنے دو بے زبان ساتھیوں 'بندر' اور 'باز' کے ساتھ مل کر کیے اور آخرکار ایک معمولی عورت کے بیٹے سے شادان سلطنت کے شہزادے کے طور پر پہچانا گیا۔ کہانی دلچسپ ہے جو کسی بھی مطالعہ کرنے والے کے لیے بوجھل نہیں بنے گی۔

اس ناول میں بچوں کے لیے سبق آموز باتیں، نصیحتیں اور زندگی سے متعلق کئی پرلطف اور ضروری معلومات درج ہیں۔ دلچسپ انداز بیان میں لپٹی صاف ستھری کہانی جو بچوں کو ہی نہیں، بڑوں کو بھی اپنی گرفت میں لے کر آخری حرف تک پڑھنے پر مجبور کردے۔

گلستاں کی کہانیاں

مصنف: امیر حسن نورانی
صفحات: 68، قیمت: 20 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: رضی شہاب، روم نمبر 016، نرمدا ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی

شیخ سعدی کی کتاب 'گلستان' ایک ایسی کتاب ہے جس میں چھوٹوں، بڑوں، بوڑھوں اور بلا لحاظ مسلک وملت وجنس سبھی کو بہتر زندگی گزارنے کی ہزاروں تعلیمات مل جائیں گی۔ اس کتاب میں حکایتیں بیان کرنے کا منفرد انداز ہے۔ یہ حکایتیں جہاں پختہ شعور رکھنے والے ذہنوں کو متاثر کرتی ہیں وہیں ان کا واقعاتی پہلو اخلاقیات، تعلیمات اور مختلف قسم کی بہترین ضروریات کی طرف چھوٹے ذہنوں کو راغب کرتا ہے۔ شاید اسی لیے

ان حکایتوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔

امیر حسن نورانی سے قبل اردو میں گلستاں کی حکایتوں کے ترجمے ہوئے ہیں اور اب امیر حسن نورانی نے ان کی کچھ کہانیوں کا ترجمہ کرکے اسے کتابی شکل دیا ہے جس میں کل 58 کہانیاں یا نصیحتیں شامل ہیں۔ اس کی پہلی اشاعت 1981 میں ہوئی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بچوں کے لیے اس کتاب کو اس سال پھر شائع کرکے ایک بہتر کام کیا ہے۔ یہ پانچویں طباعت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کہانیاں ان عام کہانیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہیں جن سے بچے صرف اور صرف زبان سیکھتے ہیں، کیونکہ یہ کہانیاں، حکایتیں یا نصیحتیں بچوں کو زبان کے ساتھ ساتھ آداب زندگی اور بہتر طور طریقے بھی سکھاتی ہیں۔

امیر حسن نورانی نے آسان اور عام فہم اردو میں بامحاورہ ترجمہ کرنے کی بہتر کوشش کی ہے۔ اس ترجمے میں کہیں ترجمہ نگار کی موجودگی محسوس نہیں ہوتی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ حکایتیں مترجم کی ہی تخلیق کردہ ہیں۔

مترجم اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس کتاب کو شائع کرنے کے لیے قابل مبارکباد ہیں۔

ایک نائی اور رنگساز کا قصہ

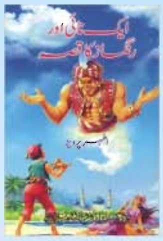

مصنف: اطہر پرویز

صفحات: 79، قیمت: 21 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: رضی شہاب، روم نمبر 016، نرمدا ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اطہر پرویز ایک عرصے سے بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔ دراصل بچوں کے لیے لکھنا اس قدر مشکل ہے کہ بآسانی ہر کوئی قلم اٹھانے کی ہمت نہیں کرسکتا ہے۔ بچوں کے لیے ان کی سطح پر اتر کر سوچنے اور اظہار کے طریقے تلاش کرنے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس سمت میں توجہ دینے والوں کی تعداد ہمیشہ ہی کم رہی ہے۔

اطہر پرویز کی اس کتاب کی پہلی اشاعت 1977 میں ہوئی تھی اور یہ اس کا چوتھا ایڈیشن ہے۔ اس کتاب میں اطہر پرویز نے بچوں اور نوجوانوں کو اخلاقی درس دینے کی کوشش کی ہے۔ جو کہانیاں انھوں نے اس کتاب میں شامل کی ہیں ان میں جھوٹ سے دور رہنے، مکروفریب اور دھوکہ دینے سے باز آنے کی تعلیم دی گئی۔ بڑوں کی عزت کرنے اور کسی بھی کام کو چھوٹا نہ سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دراصل یہ وہ کہانیاں ہیں جو بچے کو زبان سکھانے کے ساتھ ساتھ اس کو اخلاقیات کی بھی تعلیم دیتی ہیں۔

’ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ‘ نامی اس کتاب میں کل تین کہانیاں ہیں، جن میں سرورق کہانی کے علاوہ ’الہ دین کا چراغ‘ اور ’قصہ ٔ ہارون رشید‘ شامل ہیں۔ سبھی کہانیاں بہت ہی دلچسپ ہیں۔ اطہر پرویز کی زبان عمدہ اور رواں ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب پڑھتے ہوئے کسی طرح کی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے ایک بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کا فونٹ سائز تھوڑا سا اور بڑا ہونا چاہیے۔ گرچہ یہ کہانیاں بڑوں چھوٹوں کے لیے یکساں طور پر دلچسپی کا سامان ہیں تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کہانیوں کی تخلیق اور اشاعت کا مقصد نوجوان اور کم عمر نسل کی تربیت کرنا اور انہیں اردو زبان و ادب سے مانوس کرنا بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں انھیں اس جانب متوجہ کرنے کے لیے بہت چھوٹے فانٹ سائز سے مطلوبہ مقاصد کا حصول مشکل ہوگا۔ قومی اردو کونسل اس کے لیے قابل مبارکباد ہے۔

شیشہ ٹوٹ جائے گا

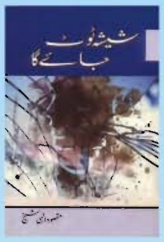

مصنف: مقصود الٰہی شیخ

صفحات: 104، قیمت: 150 روپے

اشاعت سوم: 2014

ناشر: نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ

مبصر: عبدالحی

’شیشہ ٹوٹ جائے گا‘ مقصود الٰہی شیخ کا ناولٹ ہے جس کی اشاعت سوم ہندوستان کے شہر لکھنؤ سے حال ہی میں ہوئی ہے۔ یہ ناولٹ پہلی دفعہ جولائی 2009 میں شائع ہوا تھا۔ ناولٹ ایک ایسے موضوع سے بحث کرتا ہے جس پر اردو فکشن میں کم ہی لکھا گیا ہے۔ برصغیر سے نقل مکانی کرکے مغرب میں جا بسے مسلمانوں کی زندگی اور ان کے معاشرے کو موضوع بنا کر لکھے گئے اس ناولٹ میں ایک عجیب سی کشمکش ہے۔ ناولٹ کے کردار اپنے وجود و شناخت کو قائم رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اپنے رسم و رواج اور اسلامی و اخلاقی اقدار کو بچانے کی سعی ناتمام کرتے نظر آتے ہیں لیکن مکافات عمل انھیں ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں سے ایک ہی راستہ نکلتا ہے جو انھیں مغربیت کی اندھی اور تاریک زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔

ناولٹ کا سب سے اہم کردار خالد ہے جو حقیقتاً تیمور اور الماس کا بیٹا ہے لیکن ناولٹ میں الیاس مرزا کو اس کے باپ کا کردار دیا گیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ خالد تیمور اور الماس کی محبت اور جنسی ملاپ کا نتیجہ ہے جس سے تیمور، الماس اور ان کے والدین واقف ہیں لیکن الیاس کو یہ معلوم نہیں۔ وہ خالد کو اپنی اور اپنی بیوی الماس کی اولاد سمجھتا ہے۔ ناولٹ کا آغاز خالد کی دستک سے ہوتا ہے۔ خالد جب افضال اور سعیدہ مغل کے گھر لندن پہنچتا ہے۔ خالد کے والد نے اُسے نیویارک سے چلتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا چچا تیمور کی بیٹی سے ضرور ملنا... تیمور کی بیٹی رخسار ہے۔ الیاس مرزا کیوں کہ اس بات سے ناواقف تھے کہ خالد کی پیدائش کس طرح ہوئی ہے۔ وہ خالد اور رخسار کی شادی کرنا چاہتے تھے جو کہ اسلامی اقدار اور شریعت کے منافی ہے۔ کیونکہ وہ دونوں ماں کی طرف سے سوتیلے اور باپ کی طرف سے حقیقی بہن بھائی ہوئے لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ خالد کے دادا، دادی نے خالد کو جب تک یہ سب بتایا ہوتا تب تک بہت دیر ہوچکی تھی اور دونوں نے ملاقات کرکے شادی بھی کرلی اور ہنی مون پر روانہ ہوگئے۔ خالد کے لندن آنے سے پہلے کے واقعات کو فلیش بیک میں پیش کیا گیا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ طویل عرصے سے لندن میں قیام پذیر ہیں۔ انھیں ایشیائی باشندوں کے رہن سہن، طور طریقوں اور سماجی و معاشرتی اقدار کا بہتر اندازہ ہے۔ ان کا اسلوب رواں ہے اور کہیں کوئی ابہام یا جھول نظر نہیں آتا۔ انھوں نے موضوع سے پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور تلخ حقیقت کا ایسا آئینہ دکھایا ہے جسے دیکھتے ہی ہم خود بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور ہماری اقدار اور مشرقی روایات کا شیشہ بھی کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اس ناولٹ کو پڑھنے کے بعد میں دیر تک سوچ کے سمندر میں غلطاں و پیچاں رہا، ذہن ناولٹ کے واقعے پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن حقیقت سے آنکھ چرانا ناممکن ہے۔ ہم خونی رشتوں کے تقدس کی پامالی کی خبریں پڑھتے رہے ہیں اور اب برصغیر کا معاشرہ بھی مغرب کی تقلید کرتے کرتے اپنی رسموں کو اپنے شرعی اصولوں کو بھولتا جارہا ہے اور یہی سب کچھ اس ناولٹ میں پیش کیا گیا ہے۔

ناولٹ کے کچھ جملے تو اپنی مثال آپ ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کو الفاظ کی شعبدہ بازی

خوب آتی ہے۔ وہ لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ انھوں نے لاکھ روپے کی بات بڑے عام فہم انداز میں کہہ دی ہے۔ ملاحظہ ہو:

دراصل افضال مغربی طرز پر مشرقی گھرانوں کے لڑکے، لڑکیوں کا فلرٹ کرنا سخت ناپسند کرتے تھے۔ برملا کہتے یہ بے حیائی کے زمرے میں آتا ہے۔ وہ مغرب، مغرب اور مشرق مشرق ہے کا مطلب یہ نکالتے تھے کہ جب نسلوں بعد بھی ہمارا رنگ نہیں بدلنے کا پھر ہم اپنا رہن سہن، رکھ رکھاؤ اور اخلاق یا کلچر کیوں چھوڑیں؟ بلند اخلاق، عصمت و عفت کا معیار اٹھا کر طاق میں کیوں رکھیں؟ پاکیزگی کی روش کیوں بدلیں۔'' (ص 52)

مقصود الٰہی شیخ نے ناولٹ میں ایک عجیب تحیر اور سسپنس کی فضا آغاز سے انجام تک قائم رکھی ہے۔ ناولٹ کے کردار اور واقعات آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں گے اور یہ ناولٹ کئی دنوں تک آپ کے ذہن سے محو نہیں ہوگا۔ یہ ناولٹ مقصود الٰہی شیخ کی کامیاب تحریروں میں شمار کیا جائے گا لیکن کچھ توجہ طلب نکات یہاں واضح کرنا ضروری ہیں۔ ناولٹ کہیں کہیں بالکل سپاٹ ہوگیا ہے اور واقعات و حالات پوری طرح مربوط نہیں ہو پائے ہیں۔ تیمور الیاس اور الماس کی شادی میں جاتا ہے اور الماس پر فریفتہ ہوجاتا ہے جب کہ اسے پتہ ہے کہ الماس دلہن بنی بیٹھی ہے۔ کوئی بھی نوجوان کتنا بھی عاشق مزاج کیوں نہ ہو۔ شادی میں دلہن کے علاوہ دوسری لڑکیوں پر ہی توجہ دیتا ہے۔ تیمور اور الماس کے جھگڑے اور قاتلانہ حملے کو ایک چھوٹے سے حادثے کا روپ دینا حقیقت سے پرے لگتا ہے۔ حسنیٰ کی شادی کی تیاری چل رہی ہے۔ شادی سے پہلے الیاس کا UN سے بلاوا آجاتا ہے جہاں وہ ملازمت کرتا ہے۔ انھیں چھوڑنے حسنیٰ تیمور اور الماس ایئرپورٹ جاتے ہیں۔ واپسی میں زہرہ جمال راستے میں ملتی ہے جو تیمور کی محبوبہ ہے۔ تیمور ایئرپورٹ سے پہلے ہی زہرہ سے ملنے کے لیے گاڑی سے اتر جاتا ہے اور یہ طے ہوتا ہے کہ واپسی میں وہ لوگ اسے لے لیں گے۔ واپسی میں کافی برف باری ہوتا ہے۔ زہرہ جمال راستے میں ملتی ہے۔ تینوں خواتین گاڑی میں خوش خوش بیٹھی ہیں اور باتیں کررہی ہیں۔ اچانک گاڑی کا بریک فیل ہوجاتا ہے اور بھیانک حادثہ رونما ہوتا ہے جس میں حسنیٰ اور الماس کی موت ہوجاتی ہے اور زہرہ بھی کوما میں چلی جاتی ہے۔ تین ماہ بعد اس کی بھی موت ہوجاتی ہے اور اس کے پیٹ سے بچی رخسار کو زندہ بچالیا جاتا ہے۔ حسنیٰ اپنی شادی کا خواب آنکھوں میں سجائے اللہ کو پیاری ہوجاتی ہے جو کہ ناولٹ میں ایک آئیڈیل بیٹی بہن اور آئیڈیل مشرقی خاتون کے روپ میں ہے، ورنہ زہرہ جمال اور الماس دونوں غیر شرعی جنسی فعل سے گزر چکی ہیں۔ آخر حسنیٰ کے بھی تو ارمان رہے ہوں گی۔ اُسے اتنی جلدی کیوں ناولٹ سے ہٹا دیا گیا؟ ظاہر ہے کہ اس حادثے نے ناولٹ کو منطقی انجام تک پہنچانے میں مدد کی ہے۔ اگر حسنیٰ اور زہرہ نہ مرتیں تو مصنف ناولٹ کو وہ انجام نہیں دے سکتے تھے جو وہ دینا چاہتے تھے۔ اس حادثے کے بعد ناولٹ کے اگلے ہی صفحے پر ایک اور حادثہ آپ کا انتظار کررہا ہوتا ہے۔ میڈیٹرین میں کروسنگ کے دوران ایک دوسرے حادثے میں تیمور بھی چل بسا۔ یہ بات تو درست ہے کہ ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے اور یہ واقعات ممکنات میں شامل ہیں لیکن ناولٹ کے پلاٹ میں ایک کے بعد ایک حادثہ اور سارے اہم کرداروں کا اختتام اچھے اور کامیاب ناولٹ کے لیے نقصان دہ ہے۔ چونکہ مقصود الٰہی شیخ کو اس ناولٹ کو ایک عبرتناک اور خوفناک انجام تک پہنچانا تھا اور ایسے منطقی انجام کے لیے کرداروں کو ہٹانا ضروری تھا تبھی ایسی صورت حال بنتی جو آخر میں خالد اور رخسار کی شادی کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

افسانہ اور ناول کے مقابلے میں ناولٹ ایک مشکل صنف ہے اور اس میں نہ تو افسانے کی طرح صرف ایک پہلو دکھانا مقصود ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں ناول کی طرح زندگی کا بیانیہ ہوتا ہے اور ڈھیر سارے کردار چننے کی آزادی، اس لیے اس مشکل صنف میں طبع آزمائی کرنا بھی فنکاری سے کم نہیں ہے۔ ناولٹ میں کردار جس طرح سے اسلامی روایات اور تشخص کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مقصود صاحب نے مغرب میں جا بسے مسلمانوں کے حوالے سے مشرق کے مسلمانوں میں پھیلے غلط تصور کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں کے مسلمان مذہب کو لے کر جس قدر سنجیدہ ہیں شاید اتنے یہاں کے مسلمان بھی نہیں۔ وہ نوجوانوں کی آزادی کے خلاف نہیں لیکن انھیں اتنا آزاد بھی نہیں چھوڑا کہ وہ اپنی حدود بھول جائیں، ناولٹ میں حسنیٰ اس کی بہترین مثال ہے۔ مقصود شیخ کی زبان رواں ہے اور عام فہم انداز میں انہوں نے تین نسلوں (Three generations) کے کرداروں پر مشتمل یہ داستان تحریر کی ہے اور جس خوبصورتی کے ساتھ مقصود الٰہی شیخ نے 'شیشہ ٹوٹ جائے گا' لکھا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے اور اس ناولٹ کو ادبی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

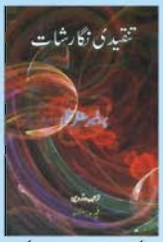

تنقیدی نگارشات

مصنف: پروفیسر مظفر حنفی
صفحات: 432، قیمت: 225 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: محبوب راہی، بارسی تاکلی، ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

کثیر التصانیف شاعر، ادیب، نقاد، محقق، مرتب اور مترجم کی شعر و ادب کی مختلف الجہات تقریباً زائد از یک صد کتابوں کے مصنف پروفیسر مظفر حنفی کے مختلف اور متنوع 39 تنقیدی مضامین کا ضخیم مجموعہ تنقیدی نگارشات اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی مالی اعانت سے حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے جس کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی محنت طلب، اور بنیادی ذمے داریاں درجنوں مفید اور اہم کتابوں کے مرتب صاحب کتاب کے لائق و فائق اور ذمے دار فرض شناس فرزند انجینئر فیروز مظفر نے اپنی خوش سلیقگی کی سابقہ روایات کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے احسن طور پر ادا کی ہے۔ کتاب کا بابرکت آغاز:

خدائے عز و جل تو جاودان کرتا ہے لفظوں کو
مظفر اپنی ہر تحریر تیرے نام کرتا ہے

اپنے جذبۂ عبودیت سے لبریز اس ایمان افروز اور معنی خیز مقطعے سے کرتے ہوئے چار حصوں میں منقسم اور کتاب میں کسی طول طویل پیش لفظ یا مقدمے کی بجائے قدآور نقاد اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کے حنفی صاحب کے تنقیدی مضامین کے سابقہ مجموعے 'جہات و جستجو' میں شامل پیش لفظ سے چند سطری اقتباس شامل کیا گیا ہے جس کے تحت مظفر حنفی کی اردو ادب کی مختلف جہتوں میں دلچسپیوں کا حوالہ دیتے ہوئے نیز ادیبوں اور ادبی مسائل کو تخلیق کار کی نظر سے دیکھنے کی بنا پر ان کی تنقید کو پیشہ ور نقادوں کی تنقید سے مختلف قرار دیا اور اسی کو ان کی انفرادیت سے تعبیر کیا ہے۔

کتاب میں مشمولہ مضامین کے چار حصوں میں حصہ اول کے چودہ مضامین چند شعرائے متقدمین، متوسطین اور متاخرین مثلاً کبیر داس، میر حسن، واجد علی شاہ اختر، غالب، فراق، جوش، شاد عارفی، جمیل مظہری وغیرہ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جن کے عنوانات ہی سے ان کے تنوع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مثلاً کلام غالب میں طنز و مزاح، فراق و جوش تضادات و مماثلتیں، شاد عارفی کے معاشقے اور ان کا تخلیقی ردعمل، آواز کا متلاشی خورشید احمد جامی، منور رانا مغربی بنگال کے شعری مزاج کا ترجمان وغیرہ۔

حصہ دوم دس ارباب قلم کی نثری نگارشات اور دیگر ادبی موضوعات پر مبنی ہے جن میں چند کے عنوانات اس طرح ہیں: وحشت مکاتیب کے آئینے میں، مجتبیٰ حسین بحیثیت خاکہ نگار، موجودہ ہندوستان میں بچوں کے ادب کے موضوعات، اردو کہانی میں انشائیہ نگار وغیرہ۔

حصہ سوم بھی دس مختلف ادبی مضامین پر مشتمل ہے۔ میر کے چند فکر انگیز عنوانات ہیں: نئی اور پرانی تنقید تجریدی شاعری اور ترسیل کا مسئلہ، کھنڈوا میں اردو شعر و ادب کے پچاس سال، ظریفانہ شاعری آزاد ہندوستان میں اردو میں دوہے وغیرہ۔

اور آخری حصہ چہارم میں اردو ادب کی پانچ مختلف شخصیات پر تعزیتی اور تاثراتی مضامین ہیں جن میں ایک گوپی چند نارنگ بفضلہٖ زندہ و تابندہ ہیں۔ مابقیہ چار مرحوم و مغفور ہو چکے ہیں جن میں عبدالقوی دسنوی، فرمان فتح پوری، رحمٰن نیر اور زیب غوری جیسی یکتائے روزگار شخصیات شامل ہیں جن سے مظفر صاحب کے قریبی روابط ہونے کی بنا پر متعلقہ مضامین بے پناہ تاثر انگیزی کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ شعر و ادب کی تقریباً سبھی کلاسیکی یا روایتی، جدید اور تجرباتی اصناف کے مختلف پہلوؤں پر اور مختلف زاویوں پر روشنی ڈالنے والے کسی ایک کتاب میں بیک وقت ان سارے 39 مضامین اردو کی کسی ایک کتاب میں کم از کم میری نگاہ سے تو آج تک نہیں گزرے ہیں۔ مظفر حنفی کی تنقیدی بصیرت اور تبحر علمی کے ثبوت میں نیز رسم تبصرہ کی ادائیگی کے لیے ان کی تنقیدی نگارشات سے چند مختصر اقتباس پیش کرنے ضروری ہیں، سو پیش ہیں:

'میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو' بھی اردو تنقید کے ابتدائی نقوش میں اہم حیثیت کا حامل ہے جو اپنی میانہ روی، اعتدال پسندی اور منصفانہ تنقید کے لیے شہرت رکھتی ہے۔ مختلف شعرا کے کلام اور ان کی سیرت پر بندھے ٹکے الفاظ میں جیسی جامع اور اساسی باتیں میر حسن نے اس تذکرے میں کہی ہیں وہ ان کے ادبی شعور کی بالیدگی کی مظہر ہیں۔'' (میر حسن کی غزلیں)

''انشائیہ دراصل افکار کی تاثراتی رنگینی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس میں ذاتی تاثرات کی گنجائش بھی ہے اور فلسفیانہ خیال آرائی کے لیے بھی اس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ انشا پردازی اور اسلوب نوازی کا کمال بھی دکھاتا ہے اور معنی خیز اظہارِ خیال کے لیے بھی زمین ہموار کرتا ہے۔'' (انشائیہ اردو میں)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مالی اعانت کا بنیادی مقصد بے حد کم قیمت میں اردو قارئین کے لیے کتابیں فراہم کرنا ہے۔ اس اعتبار سے علم و ادب کے اتنے کثیر گنج ہائے گراں مایہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے بھاری بھرکم ضخامت کی اس کتاب کی قیمت محض 225 روپے لاگت کے اعتبار سے محض نصف ہے جسے موڈرن پبلشنگ ہاؤس کے درج بالا پتے سے حاصل کر کے اپنے کتب خانے کے معیار و وقار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم و عمل)

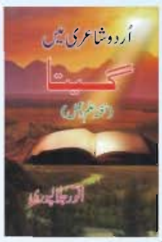

شاعر: انور جلال پوری

صفحات: 328 قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ

مبصر: منتظر قائمی، روم نمبر 15 اے، مہاندی ہوسٹل جے این یو، نئی دہلی

ترجمہ ایک نہایت ہی مشکل عمل اور فن ہے۔ یہ کسی تخلیق کو فقط ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل نہیں ہے بلکہ اس عمل کے ذریعے منتقل شدہ شے ایک تخلیقی کارنامے کا منصب حاصل کر جاتی ہے لہٰذا ترجمہ نگار کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کو دونوں ہی زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہونا چاہیے۔ فقط اتنے ہی سے بات نہیں بنتی بلکہ ترجمہ نگار کو دونوں زبانوں کی تہذیبی اور ثقافتی روایت سے خاطر خواہ شناسائی لازمی ہے تب کہیں جا کر خونِ جگر صرف کرنے کے بعد کوئی تخلیق ترجمہ بن کر دوسری زبان میں بھی وہی مرتبہ اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ منظوم ترجمہ کا فن تو اس سے بھی زیادہ مشکل امر ہے کیونکہ اس عمل میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ شاعرانہ پختگی اور کمالِ فن کی بھی آزمائش ہو جاتی ہے۔ یہ انور جلال پوری کی کی شعری صلاحیت کا ظرف ہے کہ انھوں نے اس عمل کو بخوبی اور بڑے ہی فنکارانہ انداز میں نبھایا ہے۔ زیرِ نظر کتاب 'اردو شاعری میں گیتا' ان کے شاعرانہ کمال کی مظہر ہے۔ انھوں نے شریمد بھگوت گیتا کے 701 اشلوکوں کو 1761 ثلث اور رواں اشعار میں منتقل کر دیا ہے جس کی زبان اس قدر سادہ اور دلچسپ ہے کہ اس سے فقط اردو داں حلقہ ہی محظوظ نہیں ہو سکتا بلکہ غیر اردو داں طبقہ بھی ان اشلوکوں کے منظوم مفاہیم تک بڑی آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔

جس طرح قرآن کریم کے انگنت تراجم موجود ہیں اسی طرح مقدس گیتا کے بھی لاتعداد تراجم موجود ہیں۔ کتاب کے مقدمے ہی میں عاجز ماتوی صاحب نے چودہ ایسی ذی علم شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے گیتا کا منظوم ترجمہ کیا ہے ان میں منشی رام سہائے تمنا سے لے کر ڈاکٹر شان الحق حقی تک کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ جن مسلمانوں نے شریمد بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ کیا ہے ان میں محمد اجمل خاں، عماد الحسن آزاد فاروقی، حسن الدین احمد، غیاث الدین، محمد عبدالقادر ندوی اور خواجہ حسن نظامی کے اسمائے گرامی خصوصاً لیے جاتے ہیں۔ اس فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا ہے جسے دنیائے ادب انور جلال پوری کے نام سے جانتی ہے۔ کتاب میں اس امر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ انور جلال پوری نے بھگوت گیتا کے اشلوک کے منظوم ترجمہ کے لیے جس بحر کا انتخاب کیا ہے وہ ثقیل، دقیق اور بھاری بھرکم الفاظ اور تراکیب کی متحمل نہیں ہے۔ یہ بحر بحرِ متقارب ہے جس کے اوزان 'فعولن فعولن فعولن فعل' ہیں۔ مصنف نے کتاب میں اس بات کا بھی بڑے فخریہ انداز میں اعتراف کیا ہے کہ بچپن سے ہی انھیں بھگوت گیتا کی باتوں اور واقعات سے ذہنی لگاؤ تھا یہی نہیں بلکہ انھوں نے اسی عنوان پر اودھ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن بھی کرا لیا تھا مگر کچھ وجوہات کی بنا پر وہ اپنا تحقیق مقالہ مکمل نہیں کر پائے۔

گیتا کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں تمام ویدوں کا نچوڑ، زندگی، دنیا، پیدائش، موت وغیرہ کے متعلق لاتعداد حکایتیں موجود ہیں جو کہ آفاقیت کا درجہ رکھتی ہیں اور یہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے جس کا مطالعہ کسی بھی مذہب کا پیروکار کر سکتا ہے۔ انور جلال پوری نے گیتا کے کرم یوگ کے فلسفہ کو نہایت ہی عام فہم اور سادگی سے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس پر نثر کا گمان ہونے لگتا ہے۔ عمدہ اور معیاری شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس کی با آسانی نثر کی جا سکے۔ گیتا کا منظوم ترجمہ پڑھتے وقت ہمیں میر حسن دہلوی کی مثنوی کی یاد آ جاتی ہے۔ اس طرح اردو زبان کا عام قاری گیتا کے کرم یوگ کے فلسفے تک بڑی ہی آسانی سے رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ گیتا کے اس اشلوک کا انھوں نے بڑے ہی سادے اور پر تکلف انداز میں منظوم ترجمہ پیش کیا ہے:

عمل ہی کے اوپر تیرا اختیار نہیں تیرا جگ میں کوئی کاروبار
عمل جس میں کوئی نمائش نہ ہو عمل جس میں پھل کی بھی خواہش نہ ہو

یہاں انھوں نے ہندی اور اردو زبان کے مشترکہ الفاظ کو بڑے ہی مناسب طریقے سے شعر میں پرو دیا ہے جس سے زبان کی شعری لطافت بھی برقرار ہے اور لفظ بھی نہایت ہی مانوس اور بھلے معلوم ہو رہے ہیں۔ اسی طرح گیتا کے ایک اور فلسفے کو انھوں نے اپنے شعری پیکر میں کچھ اس طرح باندھا ہے:

برہما سے بھی تو عظیم آپ ہیں　　قدامت سے بھی تو قدیم آپ ہیں
اجل آپ ہیں مرد کامل ہیں آپ　　جہاں علم ہے، اس میں شامل ہیں آپ
جگت آپ میں ہے، جگت آپ ہیں　　برہمانڈ کی سلطنت آپ ہیں

انور جلال پوری نے اس کتاب کے ہر ایک باب میں گیتا کے موضوعات کا مختصراً تعارف پیش کر کے قاری کو گیتا کو سمجھنے کی ایک بہت آسان راہ فراہم کردی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بھگوت گیتا کی داستان کو چند صفحات میں اختصار کے ساتھ بیان بھی کیا ہے تاکہ قاری کو کہیں بھی کوئی دشواری پیش نہ آئے نیز گیتا کے مخصوص پہلوؤں پر کتاب کے آغاز میں ایک باب لکھ کر اس کے فلسفے اور عمل کو سمجھنے میں قاری کی مدد کی ہے مزید شریمد بھگوت گیتا کے کرداروں کا بھی انھوں نے کتاب کے آغاز میں قاری سے تعارف کرایا ہے تاکہ قاری کو منظوم ترجمہ پڑھنے اور سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ اس طرح یہ ترجمہ اردو زبان میں ہندو مذہب کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ اس مقدس کتاب سے اردوداں حلقے کو روبرو ہونے کا ایک حسین موقعہ عطا کرتا ہے۔ اس طرح گیتا کے احکامات اور پیغامات اردو کے قاری پر بڑے ہی بہتر ڈھنگ سے عیاں ہوں گے اور اس کتاب کے پرستاروں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔ توقع ہے کہ یہ کتاب اردوداں حلقے میں بڑی مقبول ہوگی۔ یہ کتاب دیوناگری رسم خط میں بھی دستیاب ہے۔

انگیکا زبان: پس منظر، پیش منظر

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات: 120، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: پروفیسر محمد انصاراللہ، 4/1172، سرسید روڈ، سرسید نگر، علی گڑھ

میں زندگی کے آخری مرحلوں سے گزر رہا ہوں۔ اس دور میں ہر نوع کی اونچی اونچی عمارتیں ہر طرف سر اٹھاتی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایسے میں آج کی ڈاک سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا وقیع تحفہ 'انگیکا زبان: پس منظر، پیش منظر' موصول ہوا جسے ان کا کارنامہ اور اردو میں اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ میں نے انگیکا زبان کا آج سے پہلے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ ڈاکٹر ہرگانوی نے اس زبان کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سے پہلے لسانیات کے سبھی ماہرین نے اپنی اپنی زبان کا اپنی استعداد کے مطابق تعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کے تعارف میں نہ تو ان کی زبان کے مروجہ نام کے اسباب کے لیے کافی وجوہ بیان کیے گئے ہیں نہ ان کے مولد کے لیے ضروری قرائن پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ بحثیں غالباً اردو زبان سے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی بات نتیجہ خیز سامنے نہیں آسکی ہے۔ مثلاً یہ نہیں معلوم کہ وہ مقام جسے اردو کا مولد کہا ہے، کوئی دہلی کہتا ہے، تو کوئی پنجاب اور دکن کو بتاتا ہے۔ راقم سطور نے اپنی کتاب 'تاریخ زبان وادب اردو- پہلا حصہ' میں علاقہ اودھ کو اردو کا مولد ثابت کیا ہے۔ پورب کے علاقے میں سب سے زیادہ اور سب سے وقیع تصانیف پورب دیس میں ہی دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں چند کے نام اس طرح ہیں:

- چندائن از مولانا داؤد
- متفرق کلام از کبیر
- مینا ست از میاں سادھن
- میر گاوت: از قطبن
- پدماوت از جائسی
- رام چرت مانس از تلسی داس

ان کے تحریر کردہ تعارف میں ایک کمی یہ بھی ہے کہ مقامی باشندوں کی بول چال کی خصوصیات سے بھی بحث نہیں کی گئی ہے۔ صرف فارسی اور سنسکرت کو ضمناً زیر بحث لائے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک گمنام زبان کو اپنی کتاب میں موضوع بحث بنایا ہے اور اس سے متعلق ضروری دستیاب ہر قسم کی معلومات کو کاغذ کے حوالے کردیا ہے، ان کی کتاب کے مشمولات اس طرح ہیں:

- انگیکا علاقے کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر
- انگیکا زبان کے قلمکار (تصویریں)
- انگیکا زبان: ابتدا اور ارتقا

ڈاکٹر ہرگانوی نے اس زبان کا بہت سلیقے سے (بہترین انداز سے) تعارف کرایا ہے۔ ان کے اس کارنامے کی روشنی میں دوسری چھوٹی بڑی زبانوں کا بھی تعارف کرایا جانا چاہیے۔

میں ڈاکٹر ہرگانوی کو ان کے اس راہنما کارنامے کی اشاعت کے لیے پورے خلوص کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عکس در عکس (ٹیلی پلیز)

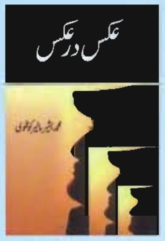

مصنف: محمد بشیر مالیرکوٹلوی

صفحات: 240، قیمت: 135 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: سالک جمیل براڑ، W-14/594، حضرت شیخ روڈ، مالیرکوٹلہ

محمد بشیر مالیرکوٹلوی افسانوی ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ موصوف اُردو دنیا میں اپنی شناخت قائم کیے ہوئے ہیں۔ افسانوں کے حوالے سے سرزمین پنجاب سے آپ ایک فعال افسانہ نگار رہیں اور عصری ادب میں سرگرداں ہیں۔ نثری ادب میں ڈرامہ نگاری کا تصور اسٹیج ہی رہا ہے یا پھر ریڈیائی ڈرامہ۔ اس دور جدید میں جہاں زندگی کے ہر شعبے میں تغیر نظر آیا ہے، وہاں ڈرامے نے بھی اب اسٹیج سے ٹیلی وژن کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ مقبول ہوچکا ہے۔ ماضی بعید میں ہم سینما شو دیکھنے کی طرح ایک خاص جگہ جاکر ٹکٹ خرید کر ڈرامے سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ لائیو اداکاری ہم پر اثر انداز ہوا کرتی تھی۔ دور حاضر میں ڈرامہ ٹیلی پلیز کی شکل میں ہماری ضرورت ہی نہیں ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم اسٹیج ڈرامے سے جڑے رہے کیوں؟... خاص طور پر مستورات اپنے گھریلو کام انجام دیتی ہوئیں اپنے ٹی وی سیریلز سے لطف اندوز ہوتی رہتی ہیں۔ عورتیں اور کوئی کام بھول جائیں تو بھول جائیں اپنا من پسند ٹی وی سیریل دیکھنا نہیں بھولتیں۔ کیونکہ ٹی وی پلے جو زندگی کے نشیب وفراز گھریلو رشتوں کے بننے بگڑنے پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہمارا ادب بھی بہرحال زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ اب جب ٹیلی پلیز کے سیریلز جو شیطان کی آنت کی طرح لمبے ہوتے ہیں، ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں ہم کیوں ان سے نظریں چرائیں۔ ہم صرف اسٹیج ڈراموں سے ہی کیوں جڑے ہیں......؟ جو آؤٹ آف فیشن ہوتے جارہے ہیں اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹیلی پلیز کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے بشیر مالیرکوٹلوی نے اپنے چار مقبول افسانوں کو ٹیلی پلے کی شکل دی ہے۔ وہ اپنے مکالمے (دیباچہ) میں رقم طراز ہیں کہ "پلے کے کرداروں کا تعارف اور لوکیشن کی تفصیل انھوں نے اپنے انداز میں کی ہے۔ منظر، منظر در منظر اور خاموش

منظرتمام اسلوب انھوں نے اپنے طور پر تخلیق کیے جوان کے اپنے ذہن کی اپج ہے۔''

زیرتبصرہ کتاب کا پہلا ٹیلی پلے 'وچن' ہے جو ایک بہت ہی کربناک موضوع پر منحصر ہے۔ ایک لڑکی کو ایک جاگیردار سے اپنی عزت بچانے کی قیمت اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ اُس سماج پر گہری چوٹ ہے جس میں پنچائتیں آج بھی اپنی مرضی سے خلاف قانون فیصلے دیتی ہیں۔ اس پلے میں ایک لڑکی کو چڑیل واضح کر کے پتھر مار مار کر مار دیا جاتا ہے۔ دوسرا ٹیلی پلے 'تلاش' ہے جس میں ایک پڑھا لکھا نوجوان فنکار ہے جو بہترین رقاص ہے، بہترین اداکار اور گلوکار بھی ہے۔ حالات اُسے اور اس کے بچوں کو بھوکا مرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسے اپنا فن ایک نقلی خواجہ سرا بن کر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان کی بے روزگاری سے لڑنے کی یہ بہترین کہانی ہے جو پلے کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ تیسرا ڈرامہ 'انتقام' ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک نابالغ اور مظلوم لڑکی سماج میں اپنا مقام بنا کر اس کو برباد کرنے والے سرمایہ دار سے بدلہ لیتی ہے۔ انتقام کا یہ انوکھا طریقہ آپ کو متاثر کرے گا۔ آخری پلے 'نیلی بارش' ہے جو عشق کی رنگینی میں بھٹکے ہوئے ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جس کی زندگی عورت کی بے وفائی سے یکسر بدل جاتی ہے۔ دوسری بات اس پلے میں یہ ہے کہ انسان کو محنت سے کمائے ہوئے پیسے کی اہمیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ بشیر مالیرکوٹلوی نے اس پلے میں پنجاب کے دیہات کی جھلک بہت خوبصورت طریقے سے پیش کی ہے۔

عکس در عکس کے ٹیلی پلیز ریسرچ اسکالروں، اسکرپٹ لکھنے والوں کے لیے بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ادیب جب ادب کی کوئی صنف تخلیق کرتا ہے تو ادب کی چاشنی کا در آنا قدرتی بات ہے۔ ان چاروں ٹیلی پلیز میں آپ کو افسانوی ادب کی خوبصورتی محسوس ہوگی۔ یہ چار ٹیلی پلیز کی یہ ایک مکمل دستاویزی کتاب ہے جو اپنی جگہ مکمل اسکرپٹ ہے جن کو بنیاد بنا کر آپ ٹیلی فلم بنا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے وارننگ بھی دی ہے کہ مصنف کی اجازت کے بغیر اسے فلمانے والے پر قانونی کارروائی کی جائے گی۔ عکس در عکس قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے جس کی طباعت انتہائی دیدہ زیب اور قیمت نہایت مناسب ہے۔

احساس کا سفر

مصنف: خالد رحیم

صفحات: 160، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد تنویر، روم نمبر 212، کاویری ہاسٹل

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

شعری مجموعہ 'احساس کا سفر' کا مطالعہ کرنے سے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس پر تبصرہ لکھ ڈالوں اور شروع کر دیا۔ خالد رحیم کے شعری مجموعہ 'احساس کا سفر' میں مختلف شعری ہیئت کو جگہ دی گئی ہے۔ آج اس جدید دور میں اردو شاعری کا دائرہ محدود نہیں رہا۔ تقریباً شاعری کی سبھی اصناف میں مختلف موضوعات جگہ پانے لگے ہیں۔ شعرا کے اس انفرادی رجحانات نے شاعری کے محدود دائرے کو اور وسیع کر دیا۔ خالد رحیم کو شعرا کی اسی انفرادیت کی ایک کڑی شمار کیا جا سکتا ہے۔ مجموعہ 'احساس کا سفر' میں سب سے پہلے خالد رحیم کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے تقریظی مضامین کو جگہ دی گئی ہے اس کے بعد شعری ہیئت میں لکھی گئی شاعری جیسے حمد ونعت، نظم، آزاد نظم، دوہے اور ماہیے وغیرہ کو ترتیب سے سنوارا گیا ہے۔ مختلف موضوعات پر لکھی گئی شاعری سے خالد رحیم کی تخیل پردازی کا پتہ چلتا ہے۔ مجموعے میں شامل تمام نظمیں، دوہے وغیرہ بہت ہی سہل اور نصیحت آموز ہیں۔ دوہے اور ماہیے جیسی ہیئت میں طبع آزمائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالد رحیم اردو زبان کے علاوہ ہندی زبان پر بھی گہری پکڑ رکھتے ہیں۔ خالد رحیم کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے کیونکہ انھوں نے ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ جیسی جگہ میں رہ کر جہاں اردو زبان کو کم اہمیت دی جاتی ہے کی خدمت کی اور لوہا منوایا۔ مجموعہ 'احساس کا سفر' خالد رحیم کی اسی کوشش اور خدمت کا نتیجہ ہے۔

خالد رحیم کی ادبی خدمات اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ انھیں بعض اہم انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔ خالد رحیم کے شعری مجموعے 'احساس کا سفر' میں ان شعری اصناف کو بھی جگہ دی گئی ہے جو دوسری زبانوں کی صنف مانی جاتی ہیں۔ مجموعے کے اوائل میں شامل بعض تعارفی مضامین خود خالد رحیم کی ادبی خدمات اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ مضامین بہت ہی جامع اور معلوماتی ہیں۔ اس کے بعد حمد و نعت، نظم، دوہے اور ماہیے کو مرتب کیا گیا ہے۔ دوہے اور ماہیے پر طبع آزمائی سے خالد رحیم کی شناخت اپنے ہم عصروں سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ مجموعہ 'احساس کا سفر' میں شامل مضامین اور نظمیں وغیرہ ادبی، علمی، شخصی اور قومی اعتبار سے بہت ہی اہم ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ مجموعہ شعری ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ اس اضافے کو مرتب نے بڑی ہی خود اعتمادی کے ساتھ دانشوروں کے درمیان لانے کی جرأت کی۔

اس مجموعہ کے علاوہ خالد رحیم کے چھ اور مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سب سے پہلا مجموعہ 'عکس در عکس' جو 1984 میں شائع ہوا، اس کے بعد بالترتیب 'میرا وطن مہان ہے' 1988 میں، جانوروں کا مشاعرہ اور بچوں کی نظمیں 1994 میں، غبارِ راہ گزر 2007 میں، جمال ہم نشیں 2009 میں اور اندر دھنش 2012 میں ایک کے بعد ایک منظر عام پر آتے رہے۔ مجموعہ 'احساس کا سفر' جو 2013 میں شائع ہوا ان کا ساتواں مجموعہ ہے۔

خالد رحیم کے خیالات و رجحانات میں ہندوستانی تہذیب رچی بسی ہے۔ اس کا اثر ان کی تحریروں سے بھی بخوبی نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بہترین مثال ہے۔ مجموعہ 'احساس کا سفر' موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے منفرد ہوتے ہوئے بھی پیوست ہے۔ مجموعے میں شامل بعض نظمیں بہت طویل تو ہیں مگر اس میں روانی اتنی ہے کہ قاری کو اس کی طوالت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بعض نظمیں وطنیت اور قومیت کے جذبات سے سرشار نظر آتی ہیں جس سے خالد رحیم کی ملک سے قربت کا پتہ چلتا ہے۔

مجموعے کو ترتیب دینے میں مرتب نے بہت ہی ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ اس میں شامل تمام نظمیں، دوہے اور ماہیے وغیرہ اپنی جگہ درست نظر آتے ہیں۔ کہیں پر جوڑ ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ آج اس جدید دور کی شاعری میں ایک نایاب اضافہ ہے۔

غضنفر کا فکشن

مصنف: سلمان عبدالصمد

صفحات: 128، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد زبیر خان، ایف 39/13، تھرڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

زیرتبصرہ کتاب 'غضنفر کا فکشن' 128 صفحات پر مشتمل ہے، سلمان عبدالصمد اردو کے طالب علم ہیں اور صحافت کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ طالب علمی اور پیشہ ورانہ صحافت دونوں وقت طلب مشغلے ہیں۔ اس قدر مشغول ہونے کے باوجود ایک طالب علم کی اس مبصرانہ سعی کو دیکھنے اور پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک مہارتھی کی ناقدانہ کامیاب کوشش ہے۔ اس کے مطالعے سے مصنف کے ذوق کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں

خشک مضامین پر لکھنے کی جسارت کرنا فرہاد کی کوہ کنی سے زیادہ تکلیف دہ کام ہے پھر بھی مصنف نے ادب کے دشت کی سیاحی کی جسارت کر ہی لی ہے۔ یہ قابل تحسین عمل ہے۔

مصنف نے غضنفر کے نو ناولوں مانجھی، شوراب، وش منتھن، کینچلی، کہانی انکل، دویہ بانی، پانی، فسوں، اور مم ایک افسانوی مجموعے 'حیرت فروش' جس میں کل 33 افسانے ہیں اور ایک خاکے کے مجموعے 'سرخ رو' کے مطالعے کو غضنفر کا فکشن نامی اپنی تصنیف کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ مجموعی طور سے ایک طالب کی جانب سے پیش کردہ ایک عمدہ تصنیف ہے۔

مصنف نے ابتدا میں 'باتیں دل کی' لکھتے ہی اس بات کا جرأت مندانہ اعتراف کیا ہے کہ یہ کوشش بالارادہ نہیں بلکہ بلاارادہ دوستوں کی ایما پر کتابی شکل قرار پا سکی ہے اور ساتھ ہی وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اس کی نوک پلک درست کرنے میں حتی الامکان دھیان دیا گیا ہے۔

لیکن نوک پلک درست کرنے میں غالباً تھوڑی سی خامی رہ گئی ہے جس کے نتیجے میں تحریر کا اعادہ بھی ہو گیا ہے۔ ایک تحریر صفحہ نمبر 60 کے سطر نمبر 18 سے ''وہ اس طرح کہ معاشرہ سے اچھے برے کی تمیز ختم ہو گئی ہے، بڑے سے بڑا گناہ بھی اب تعجب کی بات نہیں رہ گئی ہے... '' سے شروع ہو کر صفحہ نمبر 62 سطر نمبر 12 ''تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔'' پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ پھر ہو بہو اسی تحریر کا اعادہ صفحہ نمبر 108 سطر نمبر 9 سے شروع ہو کر صفحہ نمبر 110 تک جاری ہے۔ پتہ نہیں یہ سہو ہے یا کچھ اور۔

صفحہ 109 پر جہاں 'افسانے' کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے وہاں قابل مصنف کا یہ تحریر کرنا کہ 'ناول نگار نے انشائیہ کا اسلوب اپنایا ہے قطعاً جائز نہیں لگتا۔

'وش منتھن' پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف نے اس ذہنیت کو گجرات فسادات سے مشابہ یا مترادف قرار دیا ہے۔ میری سمجھ سے یہ مشابہت بالکل نامناسب ہے، یہ تو ایک ایسا مرض ہے جو ہندوستانی سماج کو برسوں سے کھوکھلا کر رکھا ہے۔ تقسیم وطن کے حوالے سے لکھے گئے سیکڑوں ناولوں میں اس ذہنیت کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ موجودہ دور تک آتے آتے اس مرض نے ناسور کی شکل اختیار کر لی ہے۔

شوراب، کینچلی اور مانجھی پر تبصرہ لاجواب ہے، تصنیف کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ناولوں کی ایک عمدہ ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے اور ہر ایک ناول کو ایک مبصرانہ نام بھی دیا گیا ہے۔ جیسے 'شوراب' کو 'شوراب کی ٹپکتی بوندیں'، 'مانجھی' کو 'مانجھی کی پتوار'، 'وش منتھن' کو 'ہندوستانی سماج میں تحلیل وش کا منتھن'، 'کینچلی' کو 'تانے بانے کینچلی کے'، 'کہانی انکل' کو 'کہانیوں کا سمندر'، 'دویہ بانی' کو 'دویہ بانی کا زہر'، 'پانی' کو 'پانی کی خشکی'، 'فسوں' کو 'فسوں کا فسانہ' اور 'مم' کو 'مم کا استعارہ'۔

اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ناولوں کے مطالعے کا مصنف کو کس قدر شوق ہے اور اس تصنیف میں کم از کم مطالعے کے حق کو بخوبی نبھایا ہے۔ واضح رہے کہ معاصر فکشن میں غضنفر کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور مصنف نے غضنفر کے فکشن کا پوری دلچسپی اور دلجمعی سے مطالعہ کیا ہے بلکہ بہ حیثیت ایک سنجیدہ مبصر اور تجزیہ نگار اپنی فہم کو بروئے کار لانے کی بہتر سعی کی ہے۔

حیرت فروش کی کہانیاں لکھتے لکھتے مصنف نے غضنفر کی فن کاری پر اظہارِ حیرت کیا ہے۔ میں نے غضنفر کے سارے افسانے تو نہیں پڑھے ہیں لیکن پھر بھی مصنف کے اس قول سے سو فیصد اتفاق نہیں رکھتا، ایک طرف تو سلمان عبدالصمد حیرانی کا اظہار کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کو عہد حاضر کے ممتاز افسانہ نگار ہونے کا اقرار بھی کرتے ہیں۔

تحریر میں اس قدر تضاد کہ تطبیق کی گنجائش ہی نہ رہے چہ معنی دارد؟

اختتامیہ لکھتے وقت مصنف نے اجمالاً غضنفر کی فکشن نگاری پر جو تجزیہ کیا ہے وہ جامعیت سے پر ہے۔ اختصار کے ساتھ مربوط انداز بیان سے مرصع مصنف نے اپنی تصنیف کا جو اختتامیہ تحریر کیا ہے اس سے مصنف کی خوش اسلوبی صاف صاف جھلکتی ہے اور مصنف کی انتقادی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

دو ماهی 'سهیل' کولکاته (علی سردار جعفری نمبر)

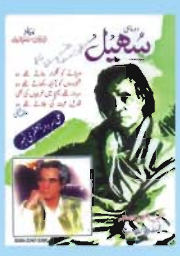

مدیر: مسعود منظر، مدیر اعزازی: ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی
جلد: 2، شمارہ: 10-9، ستمبر، اکتوبر 2014
صفحات: 212، قیمت: پچاس روپے
ناشر: 3/21 اورنیٹ رو، چھایا گھیرا، کولکاتہ 17
مبصر: راشد جمال فاروقی، سی 1452، آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ، وربھدرا (رشی کیش)، دہرادون (یو کے)

ادب میں ایک سے زیادہ نظریاتی رنگوں کی آمیزش اچھی علامت مانی جاتی ہے۔ آج جبکہ بیشتر اردو ادبی رسائل جدید یا مابعد جدید ادب کی ترجمانی کرتے نظر آرہے ہیں ایسے میں غنیمت ہے کہ ایک رسالہ 'دوماہی سہیل' کولکاتہ ترقی پسند ادب کے نظریات کا حامل بھی ہے۔

ستمبر اکتوبر 2014 کا شمارہ ترقی پسند تحریک کے سالار کارواں علی سردار جعفری پر خصوصی اشاعت ہے۔ خوبصورت گیٹ اپ اور تقریباً 14 صفحات پر اشتہارات دیکھ کر اس کے مالی استحکام کا اطمینان ہوتا ہے۔ جمیل منظر نے اپنے اداریے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں (ماہ نومبر میں علی گڑھ میں) زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی اپیل اپنے قارئین سے کی ہے جوان کے Commetment کا مظہر ہے۔ عاصم شہنواز شبلی کا اداریہ خاصا طویل ہے اور دعوت فکر دیتا ہے۔ علی سردار جعفری جیسی عدیم المثال ہستی کے بارے میں جس قسم کی عالمانہ تحریروں کی توقع کی جاسکتی ہے وہ سب آپ کو اس خاص اشاعت میں مل جائیں گی۔ بے حد معیاری مقالات لکھوانا، منگانا اور انھیں ایک خاص شمارے میں شامل کرنے کے لیے میں ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

لیکن مجھے ذہنی جھٹکا اس وقت لگا جب عاصم شہنواز شبلی کے انتہائی ذمے دارانہ اداریے کے فوراً بعد بزرگ اور انتہائی اہم تخلیق کار حضرت علقمہ شبلی کا اسم گرامی 'عقلمہ' لکھا دیکھا۔ تقریباً نصف درجن عالموں پر مشتمل ادارتی بورڈ آخر اتنا لاپرواہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ خاص نمبر علی سردار جعفری کی زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہیں کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا لیکن مضامین کی ترتیب میں کوتاہی برتی گئی ہے۔ پورا شمارہ ایک ایسا متمول گھر معلوم ہوتا ہے جہاں ضرورت کی ہر چیز اور صفائی ستھرائی سب کچھ ہے لیکن کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ غسل خانے میں تکیہ، لحاف اور دسترخوان تو شبستان میں بالٹی مگ، صابن دانی اور تولیہ جیسا منظر ہو تو کام تو چل جائے گی لیکن الجھن سے بچنا محال ہوگا۔ بہتر ہوتا کہ ذرا سی محنت اور کر لی جاتی اور مضامین کو کچھ یوں ترتیب دیا جاتا کہ ایک قبیل کے مضامین ایک ساتھ آپاتے۔ ذیل میں میں نے مضامین کی درجہ بندی کی کوشش کی ہے:

(1) شاہد ساز کا تحریر کردہ بایوڈاٹا مکمل ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل، افتخار امام صدیقی، سیفی سرونجی اور مناظر عاشق ہرگانوی کے مقالات علی سردار جعفری کی شخصی اور ذاتی زندگی سے تعارف کرانے میں کامیاب ہیں۔

(2) علی جاوید، علی احمد فاطمی، شافع قدوائی، فخر الکریم، کوثر مظہری، رشید اشرف، عذرا مناظ، اطہر مسعود خاں، جاوید رحمانی، سراج اجملی اور افضال عاقل کے مضامین علی سردار جعفری کی شاعری اور تنقید کی گرہیں کھولتے ہیں اور قارئین کے لیے سردار فہمی مزید سہل تر ہوتی جاتی ہے۔

(3) جلیل بازید پوری اور سید احمد قادری سے علی سردار جعفری محو گفتگو ہیں۔ قارئین کا ایک طبقہ اس قسم کی تحریروں کو پسند کرتا ہے۔ ان کی تشفی کے لیے انتہا بہتر ہے۔

(4) علی سردار جعفری کی غزلوں کے حوالے سے ف س اعجاز، آفاق عالم صدیقی اور امام اعظم کے مضامین اہم بھی ہیں اور محنت سے تیار کیے گئے ہیں۔ وہیں سردار کی نظموں کی

پڑتال افصح ظفر اور راشد انور راشد نے کی ہے۔

(5) علی سردار جعفری کی صحافت کے بغیر بات نامکمل رہ جانے کا خدشہ تھا لہٰذا رفیعہ شبنم عابدی اور لئیق رضوی نے اپنی ذمے داریاں بحسن وخوبی انجام دی ہیں۔

(6) علی سردار جعفری کی افسانہ نگاری پر لیلیٰ طوبینا اور نفیس عبدالحکیم نے روشنی ڈالی ہے۔

(7) (الف): 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' کا تفصیلی جائزہ دو مضامین میں ہے ایک صغیر افراہیم اور دوسرے حمیرا محمود نے اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔

(7) (ب): ہمایوں اشرف نے 'پیراہن شرر' کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

ج: تسلیم عارف نے 'ایک خواب اور' کا تجزیہ کر کے قارئین کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

(8) شمیم عالم نے 'مشاہیر کی نظر میں' کے تحت اقتباسات درج فرمائے جن سے علی سردار جعفری کے مقام کا تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

(9) میر تقی میر پر علی سردار جعفری کا اہم مضمون بھی شامل اشاعت کر کے مستحسن کام کیا گیا ہے۔ یہ مضمون تبرک جیسا ثابت ہوگا۔

پانچ کتابوں پر تبصرے اور پھر قارئین کے خطوط کے ساتھ یہ شمارہ علی سردار جعفری کو بھر پور خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ جب کبھی کسی کو علی سردار جعفری پر کسی بھی قسم کے مواد کی ضرورت آن پڑے گی تو یہ شمارہ اس کے کام ضرور آئے گا۔

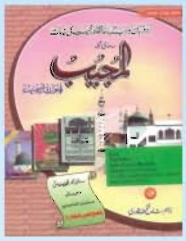

سہ ماہی مجلہ 'المجیب'

اردو زبان وادب میں خانقاہ مجیبیہ کی خدمات (خصوصی شمارہ)
مدیر: ڈاکٹر شاہ فتح اللہ قادری
جلد: 53، شمارہ نمبر: 1-4، جنوری تا دسمبر 2013
صفحات: 656، قیمت: 300 روپے
طباعت: ایڈیٹر، المجیب دارالاشاعت، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف پٹنہ
مبصر: شاہ نواز حیدر شمسی، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خانقاہ مجیبیہ عرصہ دراز سے صوبہ بہار میں دینی، روحانی، علمی، ادبی وثقافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ زبان وادب اور تہذیب وثقافت کا فروغ خانقاہ مجیبیہ کے نصب العین میں روز اول سے ہی شامل ہے۔ خانقاہ کے متعلقات بالخصوص سجادگان، صوفیائے کرام، علمائے عظام اور اساتذہ محترم کی جماعت بہت سارے علوم وفنون کے ماہر اور زبان و افکار پر کامل قدرت سے متصف تھی۔

'المجیب' خانقاہ کا رسالہ ہے۔ 1960 میں ماہ نامہ 'المجیب' کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس رسالے نے 1979 میں اپنا مسلسل انیسواں سال مکمل کیا جو اس کا آخری سال بھی تھا۔ 2003 میں 'المجیب' کی نشاۃ الثانیہ ہوئی۔ اب یہ رسالہ ماہ نامہ کے بجائے سہ ماہی ہو گیا اور تب سے بلاناغہ اور تسلسل کے ساتھ اپنی موجودگی سے ہمارے وجود کو مستحکم کر رہا ہے۔ بلاتفریق تعصب مسلم قوم وملت کے افراد واشخاص اس کی زیب وزینت کی تحسین میں حصہ لے رہے ہیں اور اس کے قاری کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کے علوم وافکار کو اس سے روشنی حاصل ہو رہی ہے۔ اس کے مزاج اور میلان ومعیار نے صوبائی وقومی سطح پر ایک بڑے طبقے کو اپنا گرویدہ بنا دیا ہے۔ سہ ماہی المجیب اپنی زندگی کے گیارہویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ ایک دہائی مکمل کر لینے پر مجلس ادارت نے بطور یادگار یہ خاص گوشہ نکالا ہے۔ المجیب کا یہ خصوصی شمارہ موضوع کی نوعیت، معیار اور رسالے کی ضخامت کے باعث چار شماروں جنوری تا دسمبر 2013 پر مشتمل ہے۔ اس خاص شمارے کے پیش نظر مدیر کے ذہن میں کچھ اس قسم کے سوالات تھے:

''ماہ نامہ المجیب کے گزشتہ بیس سال اور پھر سہ ماہی المجیب کے دس سال کی دینی، علمی اور ادبی، خدمات کے توسط سے ادبی دنیا اور دینی حلقے کو کیا کچھ دیا۔ خود المجیب نے کیا کھویا کیا پایا؟ ادبی دنیا میں المجیب کا کیا مقام ہے اور یہ دینی وعلمی حلقے اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟''

لہٰذا اس خصوصی شمارے کا عنوان 'اردو زبان وادب میں خانقاہ مجیبیہ کی خدمات' مختص ہے۔ سہ ماہی المجیب کا یہ تیسرا خصوصی شمارہ ہے اس سے قبل دو خصوصی شمارے مولانا شاہ رضوان اللہ قادری اور حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی کی حیات وخدمات کے نام منسوب کیے جا چکے ہیں۔

زیر نظر خصوصی شمارہ خاصا ضخامت لیے ہوئے دستاویزی حیثیت کا حامل ہے جس میں خانقاہ مجیبیہ کی دینی، روحانی، علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ مجلّہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ظفر حسین نے لمعات کے عنوان سے اداریہ قلم بند کیا ہے اس کے بعد پہلا باب شعر وسخن کی ترویج اور بزرگانِ خانقاہ مجیبیہ سے متعلق ہے۔ دوسرا باب زبان وادب کی اشاعت میں خانقاہ مجیبیہ کی خدمات ہے۔ تیسرا باب 'خانقاہ مجیبیہ کا اولین ماہنامہ معارف تاریخ وتعارف' ہے۔

چوتھا باب 'اردو ادب وصحافت میں المجیب کی خدمات' پانچواں باب سہ ماہی 'المجیب کی دس سالہ خدمات' ہے۔ علاوہ ازیں اواخر چار ابواب 'متفرق مضامین'، تاثرات'، نقد وتبصرہ' اور ادبیات کے عنوانات پر محیط ہیں۔ مولانا شاہ ہلال احمد قادری، مولانا سید محمد خورشید جمال قادری اور ڈاکٹر سید محمد اظہار الحسن کے مضامین سے خانقاہ مجیبیہ میں شعر وسخن کی ترویج وترقی پر روشنی پڑتی ہے۔ اول الذکر مقالہ نگار کا مضمون کتاب کا طویل ترین مضمون ہے جو 71 اوراق پر مشتمل ہے۔ سہ ماہی المجیب کے اس خاص نمبر کا امتیاز یہ بھی ہے کہ خانقاہ مجیبیہ کے اسلاف واکابرین کی اجتماعی، دینی، علمی و ادبی خدمات کے علاوہ خانقاہ کے شعرا، ادبا اور صوفیا کی خدمات کا انفرادی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ باب سوم تا پنجم معارف اور المجیب کی ادبی وصحافتی خدمات پر مشتمل ہے۔ مضمون المجیب زبان ومضامین مقالہ نگار مفتی اختر امام عادل قاسمی نے مختلف جہتوں کو یکجا کر کے المجیب کی خدمات کا جو عکس پیش کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ یہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہے۔ انھوں نے المجیب کے صوفیانہ ادب، خانقاہ مجیبیہ کا علمی وادبی مقام ومعیار کے علاوہ متعدد مضامین ومقالات کے حوالے سے مختصر مدلل اور بامعنی تاثرات قلم بند کیا ہے۔ مذکورہ مضامین کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ اس میں المجیب کے اداریہ لمعات کے تجزیے اور چند تراشے بھی پیش کیے گئے ہیں جو نہایت اہم اور لائق مطالعہ ہیں۔

المجیب کے خصوصی شمارے کو بیش قیمتی بنانے اور زیب وزینت عطا کرنے والوں میں خانقاہ کے علما، فضلا وصوفیا کے علاوہ جامعات کے اساتذہ، پروفیسران حضرات اور علم وادب کی ماہر شخصیت شامل ہیں۔ کتاب کے اواخر چند صفحات میں رسالہ، ادارے اور متعلقہ اکابرین کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر المجیب کا پیش نظر خصوصی شمارہ ایک اہم سوغات ہے۔ اس شمارے میں علم دین سے رغبت پیدا کرنے کے ساتھ عصری علوم اور دنیاوی فن پر کامل دسترس کے ذرائع بھی بتائے گئے ہیں۔ زبان وادب اور تاریخ وتہذیب سے انسیت و واقفیت کی راہیں بھی تلاش کی گئی ہیں۔ یہ سب بزرگانِ دین، خانقاہ مجیبیہ اور المجیب کے فیوض و برکات ہیں۔ کتاب کی طباعت دیدہ زیب، عنوان کی موزونیت اور سرورق کی جاذبیت نے داخل محرکات کی تصویر کشی کے ساتھ مطالعے کی سبیل پیدا کر دی ہے۔ 656 صفحات کی ضخامت اور دستاویزی حیثیت کے بموجب قیمت بھی مناسب ہے۔ آخر میں ڈاکٹر سید ریحان غنی کے ان الفاظ پر اپنی بات مکمل کرتا ہوں۔

''اگر کوئی مجھ سے کہے کہ المجیب کی صحافتی خدمات ایک جملہ میں بیان کیجیے تو میں کہوں گا کہ المجیب نے اردو صحافت کو صراط مستقیم پر چلنا سکھایا۔'' ■

عالمی اردونامہ

'بزمِ اردو قطر کا سالانہ مشاعرہ'

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے قطر میں 1959 سے سرگرمِ عمل قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزمِ اردو قطر کے زیرِ اہتمام 12 دسمبر 2014 کی شب

علامہ ابن حجر لائبریری فریق بن عمران کے وسیع ہال میں بڑے اہتمام سے سالانہ مشاعرہ 2014 کا انعقاد ہوا۔ کینیڈا سے تشریف لائے عالمی شہرت کے حامل ممتاز دانشور، محقق، ادیب اور شاعر جناب ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے مسندِ صدارت کو وقار بخشا۔ ہندوستان سے تشریف لائے خوش فکر شاعر وادیب جناب ملک العزیز کرسیِ مہمانِ خصوصی پر جلوہ افروز ہوئے جبکہ بزمِ اردو قطر کے سرپرست اور بزمِ علیگ سے وابستہ معروف شخصیت جناب ظفر صدیقی نے مہمانِ اعزازی کی نشست کو رونق بخشی۔ نظامت کے فرائض انڈیا اردو سوسائٹی کے نائب صدر اور قطر کے معروف صاحبِ طرز شاعر جناب عتیق انظر نے انتہائی عمدگی کے ساتھ انجام دیے۔ تلاوتِ کلام اللہ کی سعادت خوش آواز طالب علم عزیزم عبداللہ نے حاصل کی۔

بزمِ اردو قطر کے صدر اور قطر کے معروف شاعر و ادیب محمد رفیق شاداکولوی نے بزمِ اردو قطر کا مختصر تعارف اور خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ سالانہ مشاعرے سے قبل بزمِ اردو قطر کا بارھواں عالمی سیمینار بعنوان 'فیض سیمینار' منعقد ہوا۔ اس یادگار سیمینار کے بعد ناظمِ مشاعرہ جناب عتیق انظر نے اردو شاعری کے ارتقا پر مختصر گفتگو کرتے ہوئے مشاعرے کا آغاز کیا۔ مقامی شعرا میں چند منتخب و معیاری شعرائے کرام ہی شامل کیے گئے تھے۔

کثیر تعداد میں موجود سامعین مشاعرے میں پیش کیے گئے عمدہ کلام سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ صدر مشاعرہ ڈاکٹر سید تقی عابدی، مہمانِ خصوصی جناب ملک العزیز اور مہمانِ اعزازی جناب ظفر صدیقی نے اس کامیاب مشاعرے کے انعقاد پر بزمِ اردو قطر کے ذمہ داران واراکین کو مبارک باد پیش کی اور شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر بزمِ اردو قطر نے صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر تقی عابدی، مہمانِ خصوصی جناب ملک العزیز کو اردو ادب کی گراں قدر خدمات پر سپاس نامہ پیش کیا۔

رپورٹ: افتخار راغب، جنرل سکریٹری، بزمِ اردو قطر 6 جنوری 2015

کلیم عاجز کے اعزاز میں شعری نشست کا انعقاد

ڈیلس: ڈیلس کی ادبی انجمنوں کے تعاون سے ہندوستان کے معروف شاعر اور پدم شری پروفیسر کلیم عاجز کے ساتھ شام منائی گئی جس میں اردو گھر ڈیلس کے بانی ڈاکٹر عامر سلیمان، النور انٹرنیشنل کے بانی و چیئرمین نور امروہوی، ڈیلس کے معروف شاعر سید یونس اعجاز، سعید قریشی، شاہ عالم صدیقی، ڈاکٹر شمسہ قریشی، مائیک غوث سمیت مقامی شعرا، سیاسی وسماجی، ادبی تنظیموں کے رہنماؤں اور مقتدر شخصیات نے شرکت کی۔ مشاعرے کا اہتمام امریکہ میں مسلم ڈیموکریٹک کاکس کے شریک چیئرمین سید فیاض حسن نے کیا تھا۔ مشاعرے کی صدارت امریکہ کے معروف شاعر کرامت گردیزی نے کی جبکہ مشاعرے کی نظامت معروف شاعر نور امروہوی نے کی۔ مقامی شعرا نے مہمان خصوصی پروفیسر کلیم عاجز کو زیادہ سے زیادہ سننے کی وجہ سے ایک غزل پر ہی اکتفا کیا تاہم مقامی شعرا نے بھی اپنا کلام بھرپور طریقے سے پیش کیا اور حاضرین سے ڈھیروں داد وصول کی۔ پروگرام کے منتظم سید فیاض حسن نے پروفیسر کلیم عاجز کا مشاعرے میں خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ کلیم عاجز جیسی شخصیات برسوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ مشاعرے کے صدارتی خطاب میں معروف شاعر کرامت گردیزی نے کہا کہ شاعری مسائل حیات کے اظہار اور اس کی ترجمانی کا نام ہے اور کلیم عاجز کی شاعری قدیم وجدید دونوں کا امتزاج ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 دسمبر 2014

کلیم عاجز صاحب کے اعزاز میں منعقدہ پروگرام کا منظر

کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم کینیڈا کا سالانہ سیمینار اور عالمی مشاعرے کا منظر

کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم کینیڈا کا سالانہ سیمینار اور عالمی مشاعرہ

ٹورونٹو: جامعہ کراچی فارغ التحصیل المنائی فورم کینیڈا کے سالانہ اجتماع 27 دسمبر 2014 کا آغاز فورم کے ڈائریکٹر انفارمیشن نصیر الدین کی تلاوتِ کلام پاک اور استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ فورم کی ممبر فاطمہ زہرہ جبیں نے غالب اکادمی کینیڈا کے بانی اطہر رضوی کے سانحۂ ارتحال پر قراردادِ تعزیت پیش کی جس کے بعد فورم کے سربراہ تسلیم الٰہی زلفی نے پاکستان کی مہمان پروفیسر زیب النسا زیبی، انگلینڈ ایڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محبوب الدین، دبئی کے ممتاز شاعر جمیل قمر اور NED یونیورسٹی کراچی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر منیر محمد حسن کو خوش آمدید اور ان کا تعارف کرواتے ہوئے ان کی علمی، تعلیمی، ادبی اور تخلیقی خدمات کا تفصیلی احاطہ کیا۔

عالمی سیمینار کے پہلے حصہ میں شمالی امریکہ کے معروف شاعر، ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف صالح اچھا کی دونئی کتب 'دیدۂ خوباں' اور 'چاندنی کا دھواں' کی تقریبِ اجرا منعقد کی گئی جس میں سیمینار کے ماڈریٹر تسلیم الٰہی زلفی کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر محبوب الدین، انجینئر قمر جمیل اور پروفیسر زیب النسا زیبی نے صاحبِ کتاب کے فن و شخصیت کا جائزہ لیا اور منظوم خراجِ تحسین بھی پیش کیا۔

مغرب کی نماز کے وقفہ کے بعد پروفیسر ڈاکٹر محبوب الدین نے 'جامعہ کراچی کے سائنس داں اور انجینئر نامور شاعر' کے موضوع پر ایک سیر حاصل خطاب فرمایا جس میں سنہ پچاس سے لے کر سنہ ساٹھ کی دھائی تک کے سلیم الزماں صدیقی سے لے کر محسن بھوپالی تک اور پیرزادہ قاسم سے لے کر تسلیم الٰہی زلفی تک کے تمام مشہور سائنسداں اور انجینئر شعرا کا ذکر اور ان کے زبان زدعام شعر سنا کر محفل کو گرما دیا۔ لذّتِ کام دہن کے وقفہ کے بعد پروفیسر زیب النسا زیبی کی صدارت میں عالمی مشاعرہ منعقد کیا گیا، جس کی خوبصورت نظامت ٹورونٹو کی معروف صاحبِ دیوان شاعرہ نسرین سیّد نے کی جس میں شعرائے کرام نے اپنے خوبصورت کلام سنائے۔

رپورٹ: نصیر الدین ڈائریکٹر انفارمیشن، کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم کینیڈا

سید حامد کی وفات پر تعزیتی جلسے کا انعقاد

ریاض: معروف تعلیم دان سید حامد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، سعودی عرب کی جانب سے ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا، جس میں بڑی تعداد میں معززین شہر، علما اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی کمیونٹی کے سرکردہ افراد نے شرکت کی۔ سید حامد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے معروف سماجی کارکن اور سعودی عرب میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹرل کے کنوینر مرشد کمال نے کہا کہ سید حامد کی وفات قوم کے لیے کسی سانحۂ عظیم سے کم نہیں، حامد صاحب جیسی بے لوث اور نابغہ روزگار شخصیات تاریخ میں بار بار جنم نہیں لیتیں۔ آپ نے مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے کے لیے جو راہ دکھائی ہے اس پر چل کر مسلمان اپنے کھوئے ہوئے وقار اور تشخص کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مشہور ہندوستانی تاجر اور دہلی پبلک اسکول، ریاض اور ڈیونس پبلک اسکول دمام کے ڈائرکٹر انجینئر ندیم ترین نے سید حامد سے اپنے دیرینہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سید حامد ایک شفیق استاد اور ایک سچے معمار قوم تھے۔

معروف تعلیم داں اور ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر حسین 'ذوالقرنین نے سید حامد سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حامد صاحب روشن خیال اسلام پسند اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک ایک عملی انسان تھے۔ حسین ذوالقرنین نے کہا کہ سرسید کی طرح سید حامد بھی عصری علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی ذہن و فکر کی آبیاری پر زور دیتے تھے۔ سینئر علیگ اور سعودی عرب میں مقیم ہندوستانی تاجر انجینئر طارق مسعود نے کہا کہ سید حامد سرسید کی فکر کے حقیقی وارث تھے۔ تنظیم بسواس کے چیئرمین اختر الاسلام صدیقی نے کہا کہ سید حامد ایک مردِ قلندر تھے اور ایسی شخصیات تاریخ میں کثرت سے نہیں پیدا ہوتیں۔ جلسے کے اختتام پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور مرحوم کی مغفرت کے لیے اجتماعی دعا کا اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 جنوری 2014

لاہور میں طارق عزیز کے افسانوی مجموعہ ’کرامت‘ کی تقریب رونمائی

دنیا کے باون سے زیادہ ممالک میں معروف ومقبول اردو کی ویب سائٹ ’اردو نیٹ جاپان‘ کی مدیرہ سیدہ زہرہ کو عمران کراچی و لاہور کی بے شمار ادبی وسماجی تقریبات میں شرکت کا موقعہ ملا۔ لیکن لاہور کے باصلاحیت نوجوان افسانہ نگار طارق عزیز کے افسانوں کے مجموعہ ’کرامت‘ میں اردو نیٹ جاپان کے مدیر اعزازی برائے ہندستان جناب کامران غنی کا تبصرہ بعنوان ’معتدل بحروں کا شناور‘ بھی شامل تھا۔ طارق عزیز نے اپنی کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کرنے کے لیے انڈیا سے کامران غنی کو بھی مدعو کیا تھا۔ لیکن کچھ نامساعد حالات کے سبب وہ شامل نہیں ہوئے۔ لہٰذا سیدہ زہرہ عمران اس تقریب میں شامل ہوئیں۔

’کرامت‘ کی رونمائی کی تقریب لاہور میں الحمراء کی ’ادبی بیٹھک‘ میں کی گئی مہمانوں میں ملک کے نامور دانشور، تجزیہ نگار اور صحافی سجاد میر، نامور سفرنامہ نگار سلمٰی اعوان، معروف ادیبہ و شاعرہ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق، معروف صحافی و کالم نگار ایثار رانا، نامور صحافی کالم نگار سجاد النبی کے علاوہ دیگر معروف صحافی شہزاد فراموش، نازاوکاڑوی اور میمم سین بٹ شامل تھے۔

اس تقریب کی صدارت معروف تجزیہ نگار و کالم نگار جناب سجاد میر نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب

میں کہا کہ چونکہ طارق عزیز ذرا ٹیڑھا آدمی ہے اسی لیے اس کے موضوعات بھی ٹیڑھے ہوتے ہیں، اس کے یہاں پھوٹتی ہوئی کلیوں کی تازگی ہے۔ سلمٰی اعوان نے ’کرامت‘ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ طارق عزیز سچا کہانی کار اور فن کار ہے اس نے اپنی تحریروں کو غیر ضروری افسانوی ٹچ نہیں دیا اس نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ سجاد النبی نے بھی کرامت اور صاحب کرامت پر بڑے ہی شگفتہ انداز میں تبصرہ کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

تقریب کے اختتام پر طارق عزیز نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ افسانے نہیں لکھے بلکہ میرے اندر جو کچھ بھی تھا وہ میں نے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا۔

پریس ریلیز ناصر ناکاگاوا، اردو نیٹ جاپان، 10 جنوری 2015

شعیب بن عزیز کے اعزاز میں نشست کا انعقاد

قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزمِ اردو قطر (قائم شدہ 1959) کے ذمے داران نے پاکستان کے معروف شاعر شعیب بن عزیز کے اعزاز میں حال ہی میں

انڈیا اردو سوسائٹی قطر کے بانی صدر اور شاعرِ خلیج جناب جلیل نظامی کے دولت کدہ یعنی ’جلیل منزل‘ پر ایک پُر وقار ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ بزمِ اردو قطر کے چیئرمین اور گزرگاہِ خیال فورم کے بانی صدر ڈاکٹر فیصل حنیف خیال اور صاحبِ خانہ جناب جلیل نظامی کے یہاں ادبی گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا جس میں وہاں موجود منتخب الانتخاب شعرا و ادبا اور باذوق سامعین نے شرکت کی۔ برِصغیر ہندو پاک اور خلیجی ممالک میں اردو ادب کی موجودہ صورتِ حال پر گفتگو ہوئی۔ اُس کے بعد شعیب بن عزیز کی صدارت میں ایک شعری نشست منعقد ہوئی۔ خوش اسلوب اور منفرد لب و لہجے کے شاعر جناب فرتاش سید بحیثیتِ مہمانِ خصوصی شریک ہوئے جبکہ معتبر شاعر جناب محمد رفیق شاد اکولوی نے نظامت کی۔ جناب شعیب بن عزیز پاکستان کے ایک نامور شاعر ہیں۔ اپنے منفرد لب لہجے اور دل کش شاعری کے سبب پوری اردو دنیا میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔

ناظمِ نشست اور قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزمِ اردو قطر کے صدر و خوش خیال شاعر جناب محمد رفیق شاد اکولوی نے اپنے کئی قطعات اور ایک مرصّع غزل کے اشعار پیش کیے جنھیں حاضرین نے خوب سراہا اور داد و تحسین سے نوازا۔ محمد رفیق شاد اکولوی:

پاسبانِ امنِ عالم کس قدر ہشیار ہیں
جب بڑھا ناخن ہمارا کہہ دیا نشتر کھلا

آخر میں جناب جلیل نظامی نے جناب شعیب بن عزیز اور بزمِ اردو قطر کے چیئرمین جناب ڈاکٹر فیصل حنیف خیال کے ساتھ ساتھ تمام حاضرین و شعرائے کرام کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر بزمِ اردو قطر کے جنرل سکریٹری جناب افتخار راغب نے مہمانِ محترم جناب شعیب بن عزیز کی خدمت میں اپنے تینوں مجموعۂ غزلیات ’لفظوں میں احساس‘، ’خیال چہرہ‘ اور ’غزل درخت‘ پیش کیے۔ جناب جلیل نظامی نے بھی انڈیا اردو سوسائٹی کا مجلّہ جناب شعیب بن عزیز کو پیش کیا۔

رپورٹ: افتخار راغب، جنرل سکریٹری، بزمِ اردو قطر 10 جنوری 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل کی مالی تعاون اسکیم (گرانٹ ان ایڈ) کے تحت میٹنگ کا انعقاد

خیالات اور جذبات کی ترجمانی کے لیے اردو سے بہتر کوئی زبان نہیں: مظفر حسین

نئی دھلی: فروغ اردو بھون میں کونسل کی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی سال 2014 کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت سیمینار، کانفرنس، ورکشاپ اور مشاعروں کے انعقاد کے لیے متعلقہ کمیٹی کی سفارشات اور غور وخوض کے بعد ہی مالی تعاون فراہم کیا جاتا ہے۔

گرانٹ ان ایڈ میٹنگ کا منظر

اس میٹنگ میں گرانٹ ان ایڈ کمیٹی نے سیمیناروں، کانفرنس، مشاعروں، اردو مسودات اور عربی کے مسودات کی اشاعت اور ریسرچ پروجیکٹ سے متعلق درخواستوں پر غور وخوض کیا اور ملک کے مختلف حصوں سے موصول شدہ تجاویز کو منظوری دی گئی۔

میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے نو منتخب وائس چیئرمین جناب مظفر حسین نے شرکت کی اور پروفیسر شہاب عنایت ملک نے صدارت کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کی فروغ اردو سے متعلق مختلف اسکیموں اور پروگراموں کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کی مالی تعاون کی اسکیموں میں شفافیت کو ہمیشہ سے اہمیت دی جاتی رہی ہے اور ہم اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ قومی اور ریاستی سطح تک کی وہ تمام سرگرمیاں جو اردو کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہیں، کونسل سے مالی تعاون کی حقدار ہیں اس موقع پر کونسل کے وائس چیئرمین نے کہا کے گرانٹ دیتے ہوئے ہمیں متعلقہ ادارے یا سماجی تنظیم کی شفافیت کو بھی نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اردو نہ صرف ہندوستانیت کی زبان ہے بلکہ خیالات اور جذبات کی ترجمانی کے لیے اردو سے بہتر کوئی زبان نہیں ہے۔

دیگر ممبران میں جناب اصغر ویلوری (چنئی)، محترمہ فوزیہ چودھری (کرناٹک)، محترمہ قدسیہ انجم (سہارنپور)، جناب سردار پنچھی (پنجاب)، جناب خان شمیم (اورنگ آباد، مراٹھواڑہ)، ڈاکٹر نصرت مہدی (بھوپال)، جناب روپ کرشن بھٹ (سابق پی پی او قومی اردو کونسل)۔ اس میٹنگ میں اسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، گرانٹ ان ایڈ کے انچارج فیروز عالم، عبدالحی (اسسٹنٹ ایڈیٹر)، توقیر عالم راہی (ریسرچ اسسٹنٹ)، سید مجیب احمد (ٹیکنیکل اسسٹنٹ)، محترمہ مسرت جہاں اور شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 دسمبر 2014

قومی اردو کونسل نے تقریباً پانچ سو اردو قلمکاروں کی کتابوں کی تھوک خریداری کی

کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین اور ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اسے اردو کے مستقبل کے لیے خوش آئند قرار دیا

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اپنی بلک پرچیز اسکیم کے تحت ہر سال اردو کی معیاری کتابوں کی تھوک خریداری کرتی آئی ہے جس کا مقصد اردو کے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بلک پرچیز Bulk Purchase کمیٹی کی اہم ترین میٹنگ فروغ اردو بھون میں منعقد ہوئی، جس میں کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے شرکت کی۔ پروفیسر صغیر افراہیم کی صدارت میں منعقد ہوئی اس میٹنگ میں تقریباً پانچ سو اردو قلمکاروں کی کتابیں خریدی گئیں۔ تعداد کے اعتبار سے امسال سب سے زیادہ کتابیں خریدی گئیں، جن میں سوانح، ادب اطفال، تخلیقی ادب، شاعری، لغات، سائنسی و سماجی علوم، جنرل نالیج، ادب، تنقید، مذہب اور صحافت کے علاوہ ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد کی تھوک خریداری شامل ہے۔ اردو کے علاوہ عربی و فارسی کی بھی معیاری کتابیں خریدی گئیں، کونسل کی کارکردگی اور کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے کہا کہ کتابیں سماج کا ہی نہیں بلکہ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا بھی آئینہ ہے اس لیے عہد حاضر میں کتابوں کی اہمیت مسلم ہے۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل ملک کا سب سے بڑا حکومتی ادارہ ہے جو نو پروفسٹ اور نو لاس پر کتابوں کی تھوک خریداری کرتا ہے اور اسے ملک کے مختلف کتب خانوں میں بطور ہدیہ بھیجتا ہے تاکہ محبان اردو ان کتابوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ بلک پرچیز کمیٹی کے اراکین کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ گزشتہ سال 47,13,813 روپے کی تھوک کتابیں خریدی گئی تھیں، جس میں کتابوں، رسائل و جرائد کی تعداد 253 تھی۔ لیکن اس میٹنگ میں یہ تعداد دوگنی ہوگئی جو اردو کتابوں کے مستقبل کے لیے ایک خوش آئند بات ہے اور اس کے لیے ہم تہ دل سے مرکزی حکومت کے شکر گزار ہیں، جن کے مالی تعاون سے کونسل اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ بلک پرچیز کمیٹی کے صدر پروفیسر صغیر افراہیم و دیگر اراکین نے بھی اس تاریخی قدم کے لیے کونسل کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ اردو کے قلمکار اسی طرح اردو کی معیاری کتابیں تخلیق کرتے رہیں گے اور اردو کے دامن کو وسیع کرتے رہیں گے۔ میٹنگ میں پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر نعمان خان، حاجی محمد اقبال خان، پروفیسر شفیق اشرفی، محترمہ ثروت خان کے علاوہ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، مسرت جہاں، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری، محترمہ فرحہ ادیبہ اور محمد اقبال نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 دسمبر 2014

بلک پرچیز میٹنگ کا منظر

قومی اردو کونسل میں سید حامد کے انتقال پر تعزیتی نشست

نئی دہلی: معروف ماہر تعلیم ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں کونسل کے ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر سمیت کونسل کے عہدیداران نے شرکت کی۔ اس نشست میں کونسل کے وائس چیئرمین مظفر حسین نے ٹیلی فون پر اپنا تعزیتی پیغام دیتے ہوئے کہا کہ سید حامد حسین جیسی شخصیت برسوں میں پیدا ہوتی ہے، وہ انسان کی شکل میں فرشتہ تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو اقدامات کیے ہیں اس کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے سید حامد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سید حامد کے جانے سے مجھے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ اتنی عظیم اور سادہ شخصیت جس نے قوم اور ملت کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، کی وفات پر میرا دل رنجیدہ ہے اور میں ان کے اہل خانہ کے ساتھ اس غم میں برابر کا شریک ہوں۔ انھوں نے پوری زندگی ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے لیے وقف کردی۔ اس موقعے پر کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 31 دسمبر 2015

قومی اردو کونسل فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت نئے اردو عربی فارسی مراکز قائم کرے گی

کونسل کی میٹنگ میں کیا گیا فیصلہ

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17دسمبر 2014

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند اردو زبان کی تعلیم اور اسے روزگار سے جوڑنے کے مقصد سے ملکی سطح پر اردو، عربی و فارسی زبانوں کے 1300 سے زائد مراکز پورے ملک میں چلا رہی ہے۔ تقریباً 80 ہزار سے زائد طلبہ ان مراکز سے ایک سالہ ڈپلومہ کورس ان اردو لنگویج، ایک سالہ عربی سرٹیفکیٹ کورس، دو سالہ عربی ڈپلومہ کورس اور فارسی ڈپلومہ جیسے کورسیز کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان مراکز کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور مزید نئے مراکز ملک کی مختلف ریاستوں میں قائم کرنے کے مقصد سے فروغ اردو بھون میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں مختلف نئے مراکز قائم کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ ان مراکز کے قیام کے لیے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جن علاقوں میں مراکز نہیں ہیں انھیں ترجیح دی جائے۔

میٹنگ کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے کی۔ اپنے افتتاحی کلمات میں انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ میں فارسی و عربی زبانوں کا اہم ترین رول رہا ہے اور تینوں زبانوں کا رسم الخط بھی ایک ہے۔ اسی لیے کونسل اردو کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی زبانوں کے فروغ میں بھی اہم ترین کردار ادا کر رہی ہے۔

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ کونسل غیر اردو علاقوں پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرتی آئی ہے۔ اسی لیے نئے مراکز کے قیام کے سلسلے میں ایسے علاقوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان مراکز سے کونسل کو اب تک خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں اور آج کونسل سے ڈپلومہ حاصل کرنے والے طلبہ افریقی/خلیجی اور عرب ممالک کے علاوہ ملک کے مختلف اداروں میں ملازمتیں حاصل کر رہے ہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ کونسل نے اپنے تمام مراکز کی نگرانی کے لیے حال ہی میں ایک سافٹ ویئر بھی لانچ کیا ہے جس کے توسط سے مراکز کی نگرانی اب بآسانی کی جا سکے گی۔

میٹنگ کا منظر

کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے مراکز کی کارکردگی کی روداد پیش کی اور اجلاس کو ان مراکز کے اغراض و مقاصد سے واقف کرایا۔ میٹنگ میں فاصلاتی نظام تعلیم سے وابستہ سرکردہ شخصیات نے بھی شرکت کی اور اپنی تجاویز میٹنگ میں پیش کی ان میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ فاصلاتی نظام تعلیم کے ڈائرکٹر پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال، جموں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فاصلاتی نظام تعلیم کے ڈائرکٹر جناب وجے دیو سنگھ، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے ایکزیکیٹو وائس چیئرمین محمد خورشید صدیقی، ڈاکٹر اسرائیل رضا، پروفیسر محمود صدیقی اور کونسل کی رکن محترمہ شمع خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

قومی اردو کونسل میں گڈ گورننس ڈے کا انعقاد

نئی دھلی: ہندوستان کے سابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کے یوم پیدائش 25 دسمبر کے موقعے پر گڈ گورننس ڈے کا انعقاد کیا گیا، جس کے لیے وزارتِ تعلیم نے حکومتی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو 22 دسمبر کو گڈ گورننس ڈے منانے کی بابت ایک سرکولر کے ذریعے مشورہ دیا تھا۔ قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں بھی اس موقعے پر ایک سیمینار اور تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا جس کے لیے جج کے فرائض پروفیسر ڈی کے لوبیال، پروفیسر اختر حسین اور ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور اٹل بہاری واجپئی کو یوم پیدائش کی مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ دن یقیناً اہم دن ہے کہ ہم اپنے سابق وزیر اعظم کا یوم

پروگرام کا منظر

پیدائش منا رہے ہیں اور بہتر انتظامیہ و نئے نظریات کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ ہم نے بے حد اچھے اور پر مغز مقالے اور تقاریر سنی ہیں اور یقیناً یہ پروگرام بے حد کامیاب رہا، وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے اٹل بہاری واجپئی کو ان کے یوم پیدائش پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں یہاں آپ لوگوں کے درمیان موجود ہوں اور ہمیں اس مبارک موقعے پر گڈ گورننس ڈے منانے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ زبانیں کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں مثبت رول ادا کرتی ہیں اور ہماری زبان اردو بھی ہندوستان کی ترقی میں مؤثر کردار ادا کر رہی ہے۔ ہم سب اردو کے خدمت گزار اس دن کو بہتر ڈھنگ سے منا کر حکومت کو ایک خوش آئند پیغام دے سکتے ہیں۔ سیمینار اور تقریری مقابلوں کے لیے تین تین انعامات رکھے گئے تھے جن کے تحت چھ امیدواروں کو انعامات دیے گئے۔ سیمینار مقابلے کے تحت پہلا دوسرا اور تیسرا انعام بالترتیب ڈاکٹر کلیم اللہ، محمد قاسم اور ڈاکٹر عبدالحی کو دیا گیا، جب کہ تقریری مقابلے کے زمرے میں پہلے دوسرے اور تیسرے انعامات کے لیے بالترتیب ڈاکٹر قاسم انصاری، آبگینہ عارف اور محمد طاہر کو منتخب کیا گیا۔ اس موقعے پر کونسل کے بھی عہدیداران اور اسٹاف موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22دسمبر 2014

قومی اردو کونسل اور ایران کلچرل ہاؤس کے اشتراک سے کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن ورکشاپ کا انعقاد

کیلی گرافی نمائش اور تربیتی پروگرام اب ملکی سطح پر منعقد کیے جائیں گے: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دھلی: فن خطاطی ایک اہم ترین تہذیبی ورثہ ہے، اس ورثے کے تحفظ اور اسے فروغ دینے کے مقصد سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند ملکی سطح پر 53 مراکز چلا رہی ہے، جہاں بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات دو سالہ ڈپلومہ کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

کونسل اس حوالے سے بیرون ممالک کے ماہرین کی بھی مدد لیتی رہتی ہے تاکہ اس فن کو نت نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کر کے اردو والوں کے لیے روزگار کی مزید راہیں کھولی جا سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر کونسل اور ایران کلچرل ہاؤس کے اشتراک سے ایک ورکشاپ کا انعقاد دہلی کے ایران کلچرل ہاؤس میں کیا گیا، جہاں بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات کے علاوہ اساتذہ نے بھی شرکت کی۔ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ فن خطاطی کے دو سالہ ڈپلومہ کورس میں ترمیم و اضافہ کر کے ایک جامع نصاب تیار کیا ہے اور داخلے و امتحانات کی شرائط میں بھی ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل اب اس قسم کے ورکشاپ ہر سال ملک کے مختلف علاقوں میں منعقد کرے گی۔ کونسل نے اس حوالے سے ژونل لیول نمائش اور تربیتی پروگرام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ فن خطاطی کے تحفظ اور اسے فروغ دینے کے تئیں مزید بیداری لائی جا سکے۔ اس موقعے پر انھوں نے ایران کلچرل ہاؤس کے تعاون کا بھی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ دونوں اداروں کے اشتراک سے فن خطاطی کی نئی جہتیں کھلی ہیں، یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

اس موقعے پر ایران کلچرل ہاؤس کے کونسلر ڈاکٹر علی فولادی نے بھی طلبہ سے خطاب کیا اور یہ یقین دلایا کہ ایران کلچرل ہاؤس فن خطاطی کو فروغ دینے کے لیے کونسل کی ہر ممکن مدد کرتا رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا فارسی سے گہرا رشتہ ہے اس رشتے کو فن خطاطی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ورکشاپ کے دوران ایرانی ماہرین خطاط جناب علی مہری، محمد ہادی ستائش، جناب ناصر تجہیزادہ اور ہندوستان کے معروف خطاط جناب انیس صدیقی نے بھی طلبہ و طالبات کو فن خطاطی کی باریکیوں سے واقف کرایا اور ان کی رہنمائی کی۔ انھوں نے فن خطاطی کے تئیں کونسل کی کاوشوں کی بھی ستائش کی۔ کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب انتخاب احمد نے فن خطاطی کے سلسلے میں کونسل کی کاوشوں کی روداد پیش کی، شرکا میں ایران کلچرل ہاؤس کے جناب مجید احمدی، جناب علی رفعت، کونسل کے ریسرچ اسسٹنٹ جناب قاسم انصاری، منیت کمار اور جیتندر کمار کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 جنوری 2015

کیلی گرافی ورکشاپ کے مناظر

کونسل کے مالی تعاون سے

’عصر حاضر میں منٹو کی تخلیقات کی معنویت‘

نئی دھلی: انجمن ترقی پسند مصنّفین اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے غالب انسٹی ٹیوٹ میں ’عصر حاضر میں منٹو کی تخلیقات کی معنویت‘ پر

مائک پر پروفیسر علی احمد فاطمی، جبکہ ڈائز پر ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی، ڈاکٹر علی جاوید، انتظار حسین، ڈاکٹر اصغر ندیم سید اور ڈاکٹر ایلین ڈسولیہ

منعقد سہ روزہ انٹرنیشنل سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے اصغر ندیم نے کہا کہ منٹو کے دور میں جس طرح کے تشدد آمیز رویوں کا آغاز ہو رہا تھا ان کے افسانوں میں انھیں کو پیش کیا گیا ہے۔ پاکستان کے معروف افسانہ نگار انتظار حسین نے سیمینار کا افتتاحی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح کی انفرادیت منٹو کے یہاں پائی جاتی ہے کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں نہیں ہے۔ صدرِ شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ آج کے قلمکار مصلحت پسندی سے کام لیتے ہیں، وہ فائدہ اور نقصان دیکھ کر قلم اٹھاتے ہیں لیکن منٹو پوری زندگی بے باکی سے لکھتے رہے۔ پی ڈبلیو اے کے جنرل سکریٹری اور سیمینار کے روح رواں ڈاکٹر علی جاوید نے موضوع پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مذہب کے نام پر جو ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اس میں ضروری تھا کہ منٹو جیسے افسانہ نگار کو یاد کیا جائے اور اس کی تخلیقات کی معنویت تلاش کی جائے۔ پیرس کے اردو اسکالر ڈاکٹر ایلین ڈسولیہ نے بھی منٹو کے افسانوں پر روشنی ڈالی۔

سیمینار کے دوسرے دن منٹو کی تخلیقات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت کے حوالے سے کئی مقالے پیش کیے گئے۔ پہلے سیشن میں منٹو کی تخلیقات کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد علوی نے منٹو کی کئی جہتوں سے سامعین کو روشناس کرایا۔ منٹو کے 46 افسانوں کو فرانسیسی کا جامہ پہنانے والے پروفیسر ایلین ڈیسولیہ نے فرانسیسی میں اپنے ترجمے کے تجربات پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح منٹو کو اس دور میں یہ افسانے لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں پریشانی پیش آئی تھی، آج فرانسیسی قارئین کے سامنے پیش کرتے وقت بھی ہمیں انھی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ شعبۂ ہندی دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر اپوروانند نے کہا کہ جنگ آزادی اور تقسیم ہند کے حوالے سے اردو میں لکھے گئے افسانے اردو والوں سے زیادہ ہندی میں مقبول ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ منٹو کی اہمیت اس زمانے سے زیادہ آج ہے، منٹو نے آج سے ساٹھ سال پہلے جو کچھ لکھا تھا آج ہم روزانہ ان مسائل سے نبرد آزما ہیں۔

سیمینار کے تیسرے دن پروفیسر زماں آزردہ نے کہا کہ منٹو زندہ جاوید تخلیق کار ہیں اور ان کی تخلیقات کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے منٹو کی تخلیقات کی عصری اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے یہاں بے پناہ تخلیقی صلاحیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر سراج اجملی نے اپنے مقالہ ’منٹو خاکے‘ میں کہا کہ منٹو نے بحیثیت شخص ایک عہد کو متاثر کیا ہے۔ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر مشتاق قادری نے اپنے مقالے ’اردو منٹو شناسی: ایک جائزہ‘ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ منٹو اور اس کی تخلیقات کو آج کے سیاسی، ثقافتی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر شہناز انجم نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ منٹو نے سماج کی برائیوں کو کرید کر سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر اصغر وجاہت نے کہا کہ کوئی تخلیق جب اپنی زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتی ہے وہ عالمی ادب میں شامل ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ منٹو کی تخلیقات کو ہر ادب کے قاری نے اپنی زبان کا ادب سمجھ لیا ہے۔ ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر ندیم احمد اور سفینہ نے بھی مقالات پیش کیے۔ اخیر میں کل ہند ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی جاوید نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 23، 24 و 25 دسمبر 2014

اردو گھر میں کلام غالب پر ادبی گفتگو

نئی دھلی: مرزا اسداللہ خان غالب کے مسترد کلام کے حوالے سے تحقیقی کام انجام دینے والی معروف اسکالر اور یونیورسٹی آف ورجینیا امریکہ کی پروفیسر مہر افشاں فاروقی نے دوران گفتگو کہا کہ غالب کے ان متروک کلام کو ہم اسی وقت

مائک پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین جبکہ ڈائس پر پروفیسر مہر افشاں فاروقی، ڈاکٹر اطہر فاروقی اور اکٹر سید رضا حیدر

سمجھ سکتے ہیں جب ہم ان کی تمام تحریروں کا مطالعہ کریں۔ غالب اپنے کلام میں تحسین پیدا کرنے کے تئیں حساس تھے اور اپنی زندگی میں ہی اسے مقبول بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کا نصف حصہ ترک کر دیا۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اشتراک سے انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک ادبی شام کے تحت وہ یہاں محو گفتگو تھیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے مہمان کا تعارف کرایا۔ نظامت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے پروفیسر مہر افشاں فاروقی کی اس گفتگو اور تحقیقی کاموں کو اردو دنیا کی ایک نئی دریافت بتایا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ غالب ایسا نابغہ روزگار رہے ان پر جتنی بھی باتیں کی جائیں کم ہیں۔ غالب کے حوالے سے ہونے والی اس تحقیقی کارنامے کے ہم شدت سے منتظر ہیں۔ اس موقعے پر جاوید رحمانی، گریش جویال، فاروق انجینئر، ثاقب صدیقی، انیس احمد وارثی، باراں فاروقی، شاہد خان اور انجم عثمانی وغیرہ شریک تھے۔ روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 11 دسمبر 2014

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

روز نامہ سالار کی گولڈن جوبلی تقریب

بنگلورو: نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے کہا کہ کسی بھی اخبار کی مقبولیت اس کی خبروں کے معیار پر منحصر کرتی ہے نہ کہ خبروں کی تعداد پر۔ نائب صدر جمہوریہ نے اردو روز نامہ سالار کی گولڈن جوبلی تقریب کے افتتاح کے بعد کہا کہ اخبارات کو خبروں کی تعداد تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ ملک کے اہم موضوعات و مسائل پر بھی اپنا موقف ظاہر کرنا چاہیے تاکہ قارئین کو کسی بھی واقعہ کی تفصیلی معلومات حاصل ہو سکے۔ مسٹر انصاری نے کہا کہ اردو کی خبریں ملک و بیرون ملک میں اپنے بے باک انداز اور انسان دوستی کے لیے مقبول ہیں۔ امریکہ، کناڈا، جرمنی اور کئی ملکوں میں اردو زبان یونیورسٹیوں میں پڑھائی

بنگلور میں آر وی انجینئرنگ کالج کی گولڈن جوبلی تقریبات میں نائب صدر حامد انصاری اور گورنر وجو بھائی والا، وزیر اعلیٰ سدارمیا

جاتی ہے اور یہ کافی مقبول ہے۔ اس دوران کرناٹک کے وزیر اعلیٰ سدھارمیا نے اپنے خطاب میں کہا کہ ریاست میں کنڑ کے بعد اردو دوسری سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ہندوؤں نے بھی اپنی گراں قدر خدمات سے اردو ادب و زبان کی آبیاری کی ہے۔ اس موقعے پر کرناٹک کے گورنر ورجو بھائی والا نے کہا کہ ہندوستان میں اخبار منافع کمانے کے لیے نہیں بلکہ سماج کی آواز لوگوں تک پہنچانے کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کسی ایک خطہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی رسائی عالمی سطح پر ہے۔ روز نامہ 'جدید خبر' دہلی، 7 جنوری 2015

قومی:

عالمی صوفی کانفرنس

پٹیالہ: بابا فرید سینٹر فار صوفی اسٹڈیز، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور ICHR کے اشتراک سے یونیورسٹی کے کیمپس میں چوتھی عالمی صوفی کانفرنس کا انعقاد بعنوان 'صوفی مت اور گورمت' موضوع پر 9 اور 10 دسمبر کو کیا گیا۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں بطور مہمان خصوصی جناب ایم اشرف حیدری، ڈپٹی ہائی کمشنر آف افغانسان نے شرکت کی۔ دوسرے اہم مہمانوں میں سردار ورندر والیہ، مدیر روز نامہ پنجابی ٹریبون، معروف پنجابی شاعر ڈاکٹر سرجیت پاتر، ڈاکٹر ورندر سنگھ، رجسٹرار پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے شرکت کی۔ کلیدی خطبہ مشہور ادیب ڈاکٹر نریش، پروفیسر پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ نے پیش کیا۔ پنجابی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسپال سنگھ نے افتتاحی تقریب کی صدارت فرمائی۔

ڈاکٹر سرجیت پاتر نے افتتاحی کلمات میں تصوف اور گورمت کی مشترکہ اقدار کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مہمانِ ذی وقار جناب ایم اشرف حیدری ڈپٹی ہائی کمشنر آف افغانستان نے اپنی تقریر 'ہندوستان اور افغانستان کے صوفیانہ تعلقات' پر کی۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر نریش نے کانفرنس کے تھیم 'صوفی مت اور گورمت' پر تبصرہ کرتے ہوئے صوفیوں اور گوروؤں کے تعلقات کا ذکر کیا۔ اس کے بعد پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی جانب سے شائع ہوئی دو کتابیں اور صوفی سینٹر کی ششماہی میگزین 'گنج شکر' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ مہمانِ خصوصی سردار ورندسنگھ والیہ

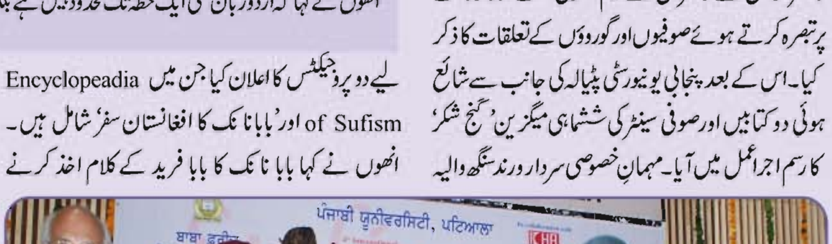

نے گوربانی میں صوفی اور صوفی مت میں سالک وصادق کی پہچان پر اظہارِ خیال کیا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر جسپال سنگھ نے اپنے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے بابا فرید سینٹر کے لیے دو پروجیکٹس کا اعلان کیا جن میں Encyclopeadia of Sufism اور 'بابا نانک کا افغانستان سفر' شامل ہیں۔ انھوں نے کہا بابا نانک کا بابا فرید کے کلام اخذ کرنے والے سفر کے ذریعے ہمیں آپسی سانجھ نمودار ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بھی مہمانان کے شکریہ ادا کرنے کا فریضہ رجسٹرار ڈاکٹر ورندر سنگھ نے ادا کیا۔ جبکہ نظامت کی ذمے داری سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر ڈاکٹر ناشر نقوی نے انجام دی۔

پہلے اکادمک سیشن کی صدارت صوفی ناظم نظامی درگاہ حضرت نظام الدین نئی دہلی، صوفی مظفر علی حیدرآباد اور خانم ناہید مرشدلو، ایران نے کی۔ ناظم نظامی، دھرم سنگھ نے، پروفیسر لکھویر سنگھ نے مقالے پیش کیے۔ صدارتی کلمات میں صوفی مظفر علی نے مقالہ نگاروں کو پر مغز مقالے کے لیے مبارکباد دی۔ عالمی کانفرنس کے دوسرے دن پہلے اکادمک سیشن کی صدارت ڈاکٹر عبدالرحمٰن کلچرل کونسلر مصر، ڈاکٹر گرنام سنگھ ڈین الومنی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے کی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے اور ڈاکٹر شمشاد علی نے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر گورنام سنگھ نے اپنے صدارتی کلمات میں صوفی سنگیت کے رشتے پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اپنی طرف سے ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔ ناہید مرشدلو نے 'تصوف کا پیغام اور ظفر نامہ' پر گفتگو کی۔ 'شاہ شرف اور

گورمت' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر گورنائب سنگھ نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ کانفرنس کا الوداعی مقالہ ممتاز صوفی دانشور اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شمسی تہرانی نے پیش کیا۔

پریس ریلیز، پروفیسر ناشر نقوی، ڈائریکٹر بابا فرید سینٹر فار صوفی اسٹڈیز، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، 11 دسمبر 2014

کرشن چندر، خواجہ احمد عباس صدی سیمینار

نئی دھلی: اب وہ سانچہ ٹوٹ چکا جس میں خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر جیسے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس صدی سیمینار کے افتتاحی جلسے میں صدارتی خطبے کے دوران نامور نقاد و دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم کے اسٹیج پر ان کے ساتھ سیدہ سیدین، جرمنی سے تشریف لائے معروف افسانہ نگار عارف نقوی،

(تصویر: نریندر کمار)

سید فیصل علی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر خالد محمود، سیمینار کمیٹی کے کنوینر پروفیسر شہپر رسول اور پروفیسر شہزاد انجم موجود تھے۔ اس سے قبل دو ادیبوں پر منعقد ہونے والے سیمینار میں دو کلیدی خطبے پڑھے گئے۔ پہلا خطبہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کرشن چندر پر پیش کیا جبکہ دوسرا خطبہ خواجہ احمد عباس پر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے پیش کیا۔ سیدہ سیدین نے اپنے خطبے سے قبل کہا کہ خواجہ احمد عباس پر ایک تاریخی ڈاکومینٹری کی ضرورت ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے کلیدی خطبے میں کرشن چندر کی تخلیقات کے در پردہ موجود فکری سرمائے اور اس سرمائے کو سیراب کرنے والے محرکات کے حوالے سے مدلل گفتگو کی۔ پروگرام کے آغاز میں سکریٹری انیس اعظمی نے 2014 میں منعقد ہونے والے سیمینار کا ذکر کیا اور اکادمی کی روایت کے مطابق تمام مہمانوں کی گلپوشی کی گئی۔ پروگرام میں اردو اکادمی کی تازہ ترین مطبوعات مونوگراف کرشن چندر، از نند کشور وکرم، ابن صفی: فن و شخصیت، مرتبہ: خالد محمود، خالد جاوید، مونوگراف ظہیر دہلوی، از ڈاکٹر مختار شمیم اور ایوانِ اردو کا مولانا ابوالکلام آزاد نمبر (کتابی شکل میں) کا اجرا عمل میں آیا۔ وائس چیئر مین اکادمی پروفیسر خالد محمود نے افتتاحی تقریر کے دوران مہمانوں کا تعارف اور بطورِ خاص مہمانِ خصوصی سید فیصل علی اور سیدہ سیدین کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب سے براہِ راست تعلق نہ ہونے کے باوجود یہ لوگ اردو کے فروغ میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ کنوینر سیمینار کمیٹی پروفیسر شہپر رسول نے سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ بطور مہمان اعزازی جرمنی سے آئے معروف ادیب عارف نقوی نے برلن کی اردو انجمن اور جرمنی کے اردو حلقے کی طرف سے اردو اکادمی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس مستحسن اقدام کے لیے ستائش کی۔ افتتاحی جلسے کی نقابت کرتے ہوئے پروفیسر شہزاد انجم نے کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس نیز ترقی پسند تحریک کے حوالے سے نہایت معلوماتی گفتگو کی اور سیمینار کی اہمیت و افادیت پر بھی روشنی ڈالی۔

سیمینار کے دوسرے دن پہلے سیشن میں چھ مقالے پڑھے گئے۔ صدارت نند کشور وکرم اور پیغام آفاقی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر رحمٰن مصور نے کی۔ دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور ریوتی سرن شرما نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی۔ اس اجلاس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔ سیمینار کے تیسرے دن ظہرانے سے قبل سات مقالے پڑھے گئے۔ صدارت پروفیسر صادق اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر مشتاق احمد قادری نے کی۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ بیسویں صدی میں بہت ساری نابغۂ روزگار شخصیات منصۂ شہود پر آئیں۔ خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر ان میں نمایاں ہیں۔ پروفیسر صادق نے خواجہ احمد عباس کے فکر و فن پر گفتگو کی۔

سیمینار کے چوتھے سیشن کی صدارت پروفیسر حسین الحق اور نریش ندیم نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر احمد امتیاز نے بحسن وخوبی انجام دی۔ صدارتی خطبہ میں نریش ندیم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہایت بے باکی سے اعتراف کیا کہ ہندوستانی فلموں میں ترقی پسندوں کی آخری کھیپ کی سربراہی خواجہ احمد عباس کر رہے تھے۔ پروفیسر حسین الحق نے مقالات پر اظہارِ خیال کیا۔

چوتھے سیشن کے بعد اختتامی اجلاس کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف فکشن رائٹر رتن سنگھ نے کی جبکہ پروفیسر اختر الواسع، کمشنر برائے لسانی اقلیات، حکومت ہند بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میرا رشتہ کرشن چندر سے چڑیوں کی الف لیلہ سے شروع ہوا تھا۔ رتن سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کرشن چندر کے یہاں موضوعات کی جو وسعت ہے وہ بعد کی نسل کے پاس نہیں ہے۔ اس موقعے پر وائس چیئر مین اکادمی پروفیسر خالد محمود نے سہ روزہ صدی سیمینار کو نہایت کامیاب قرار دیتے ہوئے تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں سیمینار کمیٹی کے کنوینر پروفیسر شہپر رسول نے اکادمی کے تمام ذمے داران سمیت مقامی و بیرونی مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 13، 14 اور 15 دسمبر 2014

ساہتیہ اکادمی کا حالی اور شبلی قومی صدی سیمینار

نئی دھلی: سرسید، حالی، آزاد اور شبلی نئے عہد کے نقیب تھے اور ان سے سماجی بیداری اور شعر و ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ان خیالات اظہار اردو کے ممتاز نقاد اور پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام سہ روزہ قومی صدی سیمینار 'حالی اور شبلی' کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے حالی اور شبلی کی قومی اور ملی خدمت کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا سب سے اہم سرمایہ قرار دیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر طلعت احمد نے کہا کہ شبلی اور حالی نے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی جمود کو توڑنے کے لیے ہمیشہ کام کیا اور ان دونوں شخصیات نے تعلیم کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی سابق چانسلر سیدہ سیدین حمید نے کہا کہ حالی نے سب سے پہلے عورتوں کی تعلیم کے حق کو شد و مد سے اجاگر کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اس موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سرینواس راؤ نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اردو مشاورتی بورڈ ساہتیہ اکادمی کے کنوینر چندر بھان خیال نے شکریے کی

دائیں سے: چندر بھان خیال، عتیق اللہ، سیدہ سیدین حمید، ضمیر الدین شاہ، طلعت احمد، گوپی چند نارنگ اور کے ایس راؤ

رسم ادا کی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی اور اس اجلاس میں نظام صدیقی، شافع قدوائی اور راشد انور راشد نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت شریف حسین قاسمی نے کی اور قدوس جاوید، شمس بدایونی اور وسیم بیگم نے مقالے پیش کیے۔

سیمینار کے دوسرے دن پروفیسر شافع قدوائی کی صدارت میں پروفیسر مولا بخش، سیفی سرونجی، وسیم راشد نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی جبکہ پروفیسر ارتضیٰ کریم، منظر اعجاز، ڈاکٹر ابوبکر عباد نے شبلی کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی جبکہ حسن رضا، ڈاکٹر سید رضا حیدر، نے گفتگو کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ حالی کے حوالے سے کافی اہم مقالات پیش کیے گئے۔ آخری اجلاس کی صدارت نظام صدیقی نے کی جبکہ علی احمد فاطمی، شہزاد انجم، اجے مالوی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ صدارتی تقریر پیش کرتے ہوئے نظام صدیقی نے کہا کہ حالی کی تنقیدی فکر کو نئے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام سہ روزہ قومی صدی سیمینار کے تیسرے اور آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد ذاکر نے کی۔ انھوں نے کہا کہ حالی اور شبلی دو ایسی بڑی شخصیتیں تھیں جن کے ذکر کے بغیر اردو زبان وادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

آخری دن چار سیشن میں 12 مقالے پیش کیے گئے۔ پہلے سیشن میں یحییٰ نشیط، جمیل اختر اور محمد ہادی رہبر نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ اس اجلاس میں اسیم کاویانی، شاہینہ تبسم اور دانش الہ آبادی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اجلاس میں انور پاشا اور اقبال مسعود نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت شین کاف نظام نے کی۔ آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول نے کی۔ اس اجلاس میں اشفاق احمد عارفی اور مشتاق احمد وانی نے مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کے موقعے پر چندر بھان خیال، کنوینر، اردو مشاورتی بورڈ نے حالی اور شبلی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس سیمینار کو خوش آئند قرار دیا۔ آخر میں اکادمی کے پروگرام آفیسر مشتاق صدف نے تمام صدور، مقالہ نگاروں، مہمانوں، سامعین اور صحافیوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8، 9 اور 10 دسمبر 2014

اردو اکادمی دہلی کا حالی وشبلی صدی سیمینار

نئی دہلی: حالی وشبلی روشن خیالی کی روایت کے روشن مینار ہیں اور ان کی روشن خیالی کو سرسید نے اپنی روشن خیالی سے صیقل کیا تھا۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام سہ روزہ کل ہند سیمینار بعنوان 'حالی وشبلی صدی سیمینار' کا افتتاح کرتے ہوئے معروف نقاد اور ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت پروفیسر اختر الواسع، کمشنر برائے لسانی اقلیات، حکومتِ ہند اور نظامت معین شاداب نے کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی خطاب میں حالی اور سرسید کو حقیقی ہمہ جہت شخصیت قرار دیا۔ بعد ازاں پروفیسر سید عزیز الدین ہمدانی، پاکستان سے تشریف لائے انتظار حسین اور پروفیسر اصغر ندیم سید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی نے حاضرین کا استقبال کیا۔ سیمینار کا پہلا اجلاس 'خواجہ الطاف حسین حالی: شخصیت وفکر وفن' پر منعقد ہوا جس میں پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر ناشر نقوی اور پروفیسر زماں آزردہ نے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد ذاکر اور پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام سہ روزہ کل ہند سیمینار کے دوران دائیں سے: پروفیسر خالد محمود، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، اصغر ندیم سید، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر گوپی چند نارنگ، انتظار حسین اور پروفیسر ایس ضیاء الدین

سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے۔ اس اجلاس میں نو مقالے پڑھے گئے۔ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے سابق صدر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے فارسی اور عربی زبان پر بھی عبور رکھنے والے حالی وشبلی کا ذکر کرتے ہوئے سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں میں اس حوالے سے گفتگو نہ ہونے کا شکوہ کیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں عہد حالی وشبلی میں ہندوستان تا ایران وعرب ہو رہی ادبی تحریکات پر سیر حاصل گفتگو کی۔

تیسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر محمد آدم نے کی۔ اس اجلاس میں کل 7 مقالے پڑھے گئے۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اردو کے اہل علم حضرات کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ہر طبقے اور ملک کے ہر حصے میں شبلی اور حالی کو خراج عقیدت پیش کرنے والے موجود ہیں۔ دوپہر بعد سیمینار کے آخری اجلاس کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے جبکہ نظامت ڈاکٹر مشتاق صدف نے کی۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ شبلی کو میں شبلی کے عہد میں رکھ کر دیکھنے اور سمجھنے کا قائل ہوں اور غالباً یہی طریقہ بہتر ہے۔ کنوینر سیمینار کمیٹی پروفیسر شہپر رسول نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23، 24 اور 25 دسمبر 2014

سرسید کی حویلی کو ثقافتی ورثے کا درجہ دلانے کی کوشش

نئی دہلی: ملک کے اندر تعلیمی بیداری پیدا کرنے والے عظیم ماہر تعلیم، دانشور اور رہنما سرسید احمد خاں کی حویلی کو بھی محفوظ نہیں رکھا جاسکا۔ سرسید کی حویلی دریا گنج میں گولچہ سینما کے پیچھے سرسید روڈ پر واقع ہے۔ اطلاع کے مطابق یہ حویلی تقسیم ہند کے بعد کئی ہاتھوں میں فروخت

ہوچکی ہے اور اس کے کئی حصوں پر کثیر منزلہ عمارتیں بن کر فروخت ہوچکی ہیں۔ سرسید کی حویلی کو محفوظ کرنے کے لیے اس سے قبل بھی کئی آوازیں اٹھ چکی ہیں اور خود علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی ایک زمانے میں اس سلسلے میں دلچسپی ظاہر کی تھی، لیکن اب مولانا حسرت موہانی فاؤنڈیشن نے اس سلسلے میں آگے آکر حکومت سے بات چیت کرنے اور قانونی طریقے سے سرسید کی حویلی کو محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فاؤنڈیشن کے صدر اور سپریم کورٹ کے سینئر ایڈوکیٹ ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی نے کہا کہ غالب کی حویلی جس طرح آثار قدیمہ کے اندر آئی ہے، اسی طرح سرسید احمد خان کی حویلی کو بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دیا جائے، تاکہ وہ اپنے بانی کے اس باقیات کو محفوظ رکھ سکے۔ انھوں نے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ سے بھی اپیل کی ہے کہ اس کو ایکوائر کرکے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام کیا جائے اور اس کو محکمۂ آثار قدیمہ کا حصہ بنا کر قومی ورثہ قرار دے اور اس کو ایک عظیم یادگار کے طور پر محفوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں صحافی اور دانشور م۔ افضل نے بھی معلومات فراہم کیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 دسمبر 2014

ایران کلچر ہاؤس میں مذاکرہ

نئی دہلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں چودھویں صدی کے مشہور صوفی بزرگ میر سید علی ہمدانی کی علمی و ادبی اور سماجی خدمات پر مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر و تاریخ داں پروفیسر عزیز الدین نے کی۔ ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں یوم عربی زبان کے انعقاد کا منظر

کاؤنسلر جناب آقائی علی فولادی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی نے علمی خدمات کے علاوہ کشمیر میں شال بافی، پارچہ بافی، قالین سازی، پیپر ماشی، دستکاری جیسے ہنر سے اہل کشمیر کو آگاہ کیا جس کے نتیجے میں مرکزی ایشیا اور ایران کی تہذیب و ثقافت کشمیر میں منتقل ہوئی جو آج تک زندہ ہے۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر محمد تعظیم نے 'میر سید علی ہمدانی کا تبلیغی مشن اور کشمیر' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا اور ڈاکٹر فیضان احمد نے میر سید علی ہمدانی کی مشہور کتاب 'مودت القربیٰ' پر اظہار خیال فرمایا نیز ڈاکٹر اختر حسین کاظمی اور ڈاکٹر اکبر علی شاہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر عزیز الدین نے اپنے صدارتی خطبے میں میر سید علی ہمدانی کی علمی و ادبی اور ان کی سماجی و دینی خدمات کا احاطہ کیا۔ فصل نامہ قند پارسی کا خصوصی شمارہ 'ادبیات فارسی در دکن' نیز دہلی یونیورسٹی شعبہ فارسی کے مجلّہ تحقیقات فارسی کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ مذاکرہ کی نظامت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر علیم اشرف نے کی۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 25 دسمبر 2014

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں یومِ عربی زبان کا انعقاد

نئی دہلی: عربک ڈے کی تقریبات کے سلسلے میں آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس اور البیت الثقافی العربی کے اشتراک سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دیار میر تقی میر ٹیگور ہال میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے اساتذہ اور اسکالرس کے علاوہ مصر، سوڈان، فلسطین اور دوسرے عربک ممالک کے سفارت کاروں نے شرکت کی۔ پروگرام کا افتتاح آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے قومی صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کیا۔ اس موقعے پر خصوصی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے کہا کہ ہندوستان میں دوسرے ممالک اپنی زبان اور ثقافت کی ترقی اور فروغ کے لیے بہت زیادہ کوشش کرتے ہیں ان کے ثقافتی ادارے یہاں سرگرم ہیں لیکن عربی زبان و ادب کی ترقی کے میدان میں عربی ممالک سرد مہری کے شکار ہیں۔ نظامت کے دوران پروفیسر حبیب اللہ خان نے یوم عربی زبان کے حوالے سے بات کی اور تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

عرب لیگ کے سفیر مسٹر احمد مازن نے کہا کہ تمام عرب ممالک کو ہندوستان میں عربی کے ٹوٹتے رشتے پر سوچنا چاہیے۔ جمہوریہ مصر کے کلچرل کونسلر پروفیسر محمد احمد محمد عبدالرحمٰن نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ عربی زبان و ادب کی حفاظت یقینی ہے کیونکہ اس میں قرآن و احادیث ہیں۔ انھوں نے تمام عرب ممالک کے سفرا سے گزارش کی کہ مشترکہ طور سے ایک ایسا لائحہ مرتب کیا جائے جس کی وجہ سے ہندوستان میں اس کا فروغ ہوسکے اور اس میں مصری سفارت خانہ ہرممکن کوشش کرے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 دسمبر 2014

جے این یو میں عالمی یومِ عربی زبان کا انعقاد

نئی دہلی: عالمی یومِ عربی زبان کی مناسبت سے آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے اشتراک سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) کے سینٹر آف عربک اینڈ افریکن اسٹڈیز کے زیر اہتمام ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب میں خطاب کرتے ہوئے عرب لیگ کے سفیر مازن المسعودی نے کہا کہ ہندوستانی جامعات کے اساتذہ و اسکالرس نے عربی زبان و ادب میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جے این یو کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے سپوری نے کہا کہ سینٹر کی اس قسم کی ادبی سرگرمیوں سے جے این یو کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عرب مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے عربی زبان وادب کی وسعت پر بھی اظہار خیال کیا۔ تقریب کی صدارت مصر کے سفیر حاتم تاج الدین

جے این یو میں عالمی یومِ عربی زبان کے انعقاد کا منظر

نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں سینٹر اور ایسوسی ایشن کی ستائش کی اور عربی زبان کے فروغ کے لیے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ اس موقعے پر یمن سفارت خانہ کے کلچرل کاؤنسلر مازن الجفری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ قبل ازیں آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے قومی صدر پروفیسر محمد نعمان خان سابق صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے ایسوسی ایشن کے قیام اور اس کے اغراض ومقاصد پر گفتگو کی۔ عصری سفارت خانہ کے کلچرل کاؤنسلر پروفیسر محمد احمد محمد عبدالرحمٰن نے اپنے خطاب میں کہا کہ عربی زبان وادب کی حفاظت یقینی ہے کیونکہ اس میں قرآن واحادیث ہیں۔ البیت الثقافی کے مدیر نوری الصبری نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی خدمات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ سینٹر آف عربک اینڈ افریکن اسٹڈیز کے چیئرپرسن پروفیسر مجیب الرحمٰن نے تمام عرب مہمانوں اور ایسوسی ایشن کے اراکین، ریسرچ اسکالرس وشرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 دسمبر 2014

دھلی :

غالب کا 217واں یومِ پیدائش

نئی دھلی: غالب جیسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ غالب کے کلام میں 200 سال پہلے جو روحانی اثر تھا وہ آج بھی موجود ہے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے غالب کے 217ویں یوم پیدائش کے موقعے پر غالب اکادمی حضرت نظام الدین میں خصوصی لیکچر کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر عقیل احمد، جاوید نسیم، پروفیسر ڈاکٹر صادق، انجم عثمانی، ڈاکٹر بی آر ورما نے مرزا غالب کے مزار پر پھولوں کی چادر پیش کی۔ اس کے بعد متین امروہوی نے غالب پر اپنا کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر سلیل مشرا نے کہا کہ غالب اور اردو دہلی کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ پروفیسر گنگا پرساد وِمل نے کہا کہ مرزا غالب سبھی ہندوستانی زبانوں کے شاعر لگتے ہیں۔ غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا غالب اکادمی مرزا غالب کی وجہ سے وجود میں آئی ہے جو غالب کے کلام کے علاوہ اردو زبان وادب کی ترویج کا فریضہ گزشتہ 45 برسوں سے بڑی ذمے داری سے انجام دے رہی ہے۔ پروفیسر صادق نے اپنی صدارتی تقریر میں خاص طور سے غالب کی فارسی مثنوی چراغ دیر کا ذکر کیا۔ آخر میں مدھویتا بوس نے غالب کی غزلوں کو موسیقی کے ساتھ پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 دسمبر 2014

شبلی کے تعلیمی افکار

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ایمریٹس (یوجی سی)، سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی

دائیں سے: پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی، پروفیسر مجیب الرحمٰن، پروفیسر ایوب تاج الدین ندوی، ڈاکٹر نعیم الحسن، ڈاکٹر مجیب اختر ندوی ودیگر

نے علامہ شبلی کے ادبی وقار اور تعلیمی افکار کے موضوع پر منعقد سیمینار کی ابتدا کی اور ان کے پختہ اور دل نشیں اسلوب نگارش کے نمونے پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ شبلی کا سب سے بڑا امتیاز ان کی مردم سازی اور نئی نسل کی ذہنی تربیت تھی۔ پروفیسر محمد ایوب تاج الدین ندوی صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شبلی اور ندوۃ العلما کے موضوع پر وقیع مقالہ پیش کیا۔ عظمت اللہ ندوی نے اپنے مقالے میں علامہ شبلی کی چار عربی کتابوں، بدء الاسلام، اسکات المعتدی، کتاب الجزیہ اور الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (جرجی زیدان) پر مفصل گفتگو کی۔ صدر جلسہ پروفیسر مجیب الرحمٰن ندوی صدر شعبۂ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے علامہ شبلی کی 57 سالہ مختصر زندگی کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمیں ان سے کئی سبق ملتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2014

سید حامد: حیات وخدمات

نئی دھلی: اسلامک کلچرل سینٹر میں جامعہ ہمدرد کے سابق چانسلر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد کی حیات وخدمات پر منعقدہ سیمینار میں مقررین نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے آخری دم تک ملت کی تعلیمی زبوں حالی کے خلاف جہاد کیا۔ سیمینار سے جسٹس راجندر سچر، بزرگ صحافی کلدیپ نیر، جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر ڈاکٹر جی این قاضی،

اسٹیج پر پروفیسر طلعت احمد، جسٹس راجندر سچر، کلدیپ نیر ودیگر

ثمر حامد، سید شاہد مہدی، ایس ظفر علی، آئی آئی سی سی کے نائب صدر صفدر ایچ خان اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے بھی خطاب کیا۔ معروف شاعر متین امروہوی نے سید حامد کی شخصیت پر قطعات پیش کیے۔ سراج الدین قریشی نے کہا کہ سید حامد تعلیمی میدان میں نہ صرف ملک بھر میں بلکہ اپنے ساتھیوں کے درمیان بھی ایک ممتاز شخصیت کے حامل تھے۔ جسٹس راجندر سچر نے کہا کہ سید صاحب نے جس ذاتی قربانی کا ثبوت دیا وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ بات بھی شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ جب وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو حکومت نے انھیں سعودی عرب میں ہندوستان کا سفیر بنا کر بھیجنے کی پیش کش کی، مگر سید صاحب نے انکار کردیا۔ بزرگ صحافی کلدیپ نیر نے کہا کہ سید صاحب کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ 1994 میں تعلیمی بیداری کارواں تھا۔ صفدر ایچ خان نے اس موقعے پر سید حامد کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ سید حامد کے پوتے شاذ حامد اور ان کی پوتی انعم حامد نے بھی اپنے دادا کے بارے میں باتیں کیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جنوری 2015

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو اساتذہ کے تربیتی پروگرام میں 'تدریس نامہ' کے اجرا کا منظر

جامعہ میں اردو اساتذہ کا تربیتی پروگرام

نئی دھلی: درس و تدریس اور اردو زبان کے فروغ سے متعلق اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ کی خدمات لائق ستائش ہیں۔ جس طرح کا کام جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اکادمی انجام دے رہی ہے دوسری اکادمیاں نہیں کر رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ کے زیر اہتمام جامعہ کے اردو اساتذہ کے 5 روزہ تربیتی پروگرام کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشن پروفیسر احرار حسین نے کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ادب وہ عطرِ مجموعہ ہے جس کے ذریعے تمام علوم وفنون کی خوشبو حاصل کی جا سکتی ہے اور زبان تمام علوم کی رابطہ کار ہے۔ افتتاحی اجلاس میں اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کا جدید تدریسی رجحانات کا ترجمان علمی و ادبی کتاب سلسلہ 5، 'تدریس نامہ' کا اجرا بھی کیا گیا۔ اکادمی کے استاد ڈاکٹر واحد نظیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پانچ روزہ تربیتی پروگرام کے اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر طلعت احمد، شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اسکولی سطح کی تدریس میں زبان و ادب کی تدریس اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ اس سے ہماری قوت تخیل کی تربیت ہوتی ہے۔ اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائریکٹر پروفیسر غضنفر نے اکادمی کی اب تک کی حصولیابیوں اور آئندہ کے منصوبوں کی تفصیلات پیش کیں۔ چند شرکا نے اساتذہ کی نمائندگی کرتے ہوئے اس پروگرام سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ آخر میں پروگرام کو آرڈینیٹر اور اکادمی کی ٹیچر ڈاکٹر حنا آفریں نے تمام مہمانان، شرکا، سامعین اجلاس، یونیورسٹی انتظامیہ اور اکادمی اسٹاف کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 و 23 دسمبر 2014

آندھرا پردیش:

اردو میں تحقیق کے طریقِ کار پر ورکشاپ

حیدرآباد: شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد کی کوششوں سے اردو میں تحقیق کے طریقِ کار پر ایک ورکشاپ کا اہتمام یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کی طرف سے کیا گیا۔ اردو ریسرچ اسکالروں کے لیے، یہ اپنی نوعیت کا نہ صرف پہلا بلکہ بے حد مفید ورکشاپ تھا۔

یہ ورکشاپ یکم دسمبر سے 6 دسمبر 2014 تک مختلف موضوعات پر مشتمل تھا۔ اس ورکشاپ کے کوآرڈینیٹر صدر شعبۂ اردو پروفیسر مظفر شہ میری تھے۔

یکم دسمبر کو صبح ساڑھے دس بجے ورکشاپ کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ابیتا بھاداس گپتا، ڈین ہیومانی ٹیز نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین شریک ہوئے، جنھوں نے اپنی تقریر میں ورکشاپ کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر مظفر شہ میری نے ریسرچ اسکالروں کا استقبال کیا۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائریکٹر پروفیسر وائی نرسمہولو نے سبھی شرکا کا استقبال کیا۔ صدر جلسہ نے تمام باتوں کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے ورکشاپ اور ریفریشر کورس آج کے نئے اسکالروں کے لیے نہایت ضروری ہیں، جن کی مدد سے وہ اپنے مقالے کو بہتر اور معیاری بنا سکیں۔

چائے کے وقفے کے بعد پہلی کلاس پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی تھی جس میں انھوں نے اردو تحقیق میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال کی جہتوں کو بتایا اور تھیسس اور ڈیزرٹیشن لکھنے کے اصول اور ضابطے بتائے۔ لنچ کے بعد جناب راج شیکھر نے میڈیا وکی Media Wiki کے فوائد کے بارے میں بتایا کہ کیسے اس پر اپنا اکاؤنٹ بنائیں اور اپنے مواد کو دوسروں کے ساتھ شیئر کریں اور پھر عملی طور پر مشق بھی کرائی۔

2 دسمبر کو پروفیسر مجید خان (دہلی) نے تحقیق کے طریقۂ کار پر لکچر دیا۔ 3 دسمبر کو پروفیسر محمد انوار الدین نے 'تحقیق کیا ہے' کے موضوع پر جامع و مدلل لکچر دیا۔ اس کے بعد جناب یعقوب صاحب نے لائبریری کے استعمال پر لکچر دیا کہ ہم لائبریری میں کتابوں کو کیسے تلاش کریں اور انٹرنیٹ کی مدد سے مواد کیسے حاصل کریں۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے اردو سافٹ ویئر کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ایک جامع لکچر دیا۔ 4 دسمبر کو ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب (علی گڑھ) نے 'تدوین متن اور اس کے طریقۂ کار' پر لکچر دیا۔ 5 دسمبر کی پہلی دو کلاسیں پروفیسر قاسم علی خان نے لیں، جن میں اُنھوں نے اردو املا کے مسائل پر بڑی اچھی گفتگو کی۔ دوپہر میں، پروفیسر مظفر شہ میری نے دو کلاسیں لیں۔

آخری دن یعنی 6 دسمبر کی پہلی کلاس پروفیسر مظفر شہ میری کی تھی جس میں اُنھوں نے عمدہ پیراگراف لکھنے کے ہنر سے واقف کرایا۔ 6 دسمبر کو پروفیسر خدیجہ بیگم (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے تحقیق، یو جی سی فنڈنگ اور پروجیکٹ کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد اختتامی اجلاس ہوا۔ اس اختتامی اجلاس میں تمام شرکا کو اسناد سے نوازا گیا۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائریکٹر نے شرکا کے تاثرات جاننے کی خواہش پر ڈاکٹر امین اللہ (لکچرر، ایس وی یونی ورسٹی، تروپتی) اور گیانویندر سنگھ (الہ آباد) اور بشریٰ چشتی (یونی ورسٹی آف حیدرآباد) نے تاثرات کا اظہار کیا۔ آخر میں ڈائریکٹر اور کوآرڈینیٹر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، مظفر علی شہ میری، صدر شعبۂ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، 29 دسمبر 2014

جہانِ اردو ڈاٹ کوم کا آغاز

حیدرآباد: موجودہ دور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔

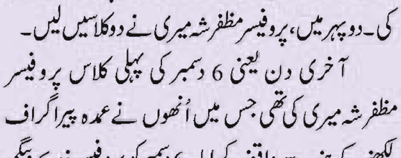

اس لیے نئی نسل کے ذوق کو بلند کرنا اور ان کی اخلاقی تربیت کرنا لازمی ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے

مولانا محمد علی جوہر کی حیات و خدمات پر منعقدہ سیمینار کا منظر

جہانِ اردو ڈاٹ کوم (jahan-e-urdu.com) کا آغاز کیا جارہا ہے۔ ہر عمر و جنس کے لیے وہ تمام مطلوبہ مواد شامل رہے گا جس کا تعلق اردو زبان و ادب اور ثقافت سے ہوگا۔ جہانِ اردو ڈاٹ کوم میں جہاں زبان و ادب کا پہلو بھی ہے وہیں سائنس وطب کا زمرہ بھی ہے، جامعات اور ان کی سرگرمیاں بھی ہیں، تعلیم اور روزگار کا ویژن بھی ہے، خواتین و بچوں کا گوشہ بھی، کتابوں پر تبصرہ کے علاوہ نئی کتابوں کا تعارف، علمی تقاریب کی رپورتاژ، فلم و اسٹیج اور دیگر فنون لطیفہ کی جھلکیاں علاوہ ازیں اردو میڈیا، آڈیو ویڈیو اور علمی و تہذیبی خبریں بھی شامل ہوں گی۔

پریس ریلیز، سید فضل اللہ مکرم، 31 دسمبر 2014

اتر پردیش:

مولانا محمد علی جوہر کی حیات و خدمات

سہارنپور: اس قوم کو صفحۂ ہستی سے نہیں مٹایا جاسکتا جس قوم میں مولانا محمد علی جوہر جیسے جانباز نڈر بیباک اور اپنے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والی شخصیات پیدا ہوتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ مظاہر علوم کے امین عام سید شاہد الحسنی نے گزشتہ شب شیخ محمد زکریا صدیقی ٹرسٹ کے زیر اہتمام محمد علی لائبریری میں مولانا محمد علی جوہر کی حیات و خدمات پر منعقد سیمینار میں اپنے کلیدی خطبہ میں کیا۔ مولانا شاہد نے کہا کہ انگریزیت اور عیسائیت سے ٹکر لینے والے جوہر کا چہرہ کسی مدرسے سے فارغ عالم کا چہرہ تھا۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ذمے دار محمد عارف عثمانی علیگ نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کی حیات و خدمات سے نئی نسل کو متعارف کرانا ضروری ہے برطانوی سامراج کے خلاف نعرہ حق بلند کرنے میں انھوں نے اپنی زندگی اور اپنی بھرپور توانائیاں صرف کردی تھیں۔ ش زبیری کی نظامت اور مولانا شاہد الحسنی کی صدارت میں ہوئے سیمینار کے آغاز سے قبل قاری صلاح الدین نے تلاوت کلام پاک اور محمد آصف شمسی اور محمد حبیب نے نعت پاک پیش کی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 دسمبر 2014

اتر پردیش میں اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان اور عملی صورت حال

رام پور: علمی ادبی و سماجی تنظیموں کے زیر اہتمام ایک اہم مذاکرہ بعنوان 'یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ اور عملی صورت حال' محلہ راجوارہ روڈ واقع شوکت علی خاں ایڈووکیٹ کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ تقریب کی صدارت تنظیم کے صدر محی الدین خاں ادیب نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق رکن اسمبلی خان محمد عاطف سابق صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ حال ہی میں عدالت عظمٰی نے اتر پردیش سرکار کے ذریعے 1989 میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے قانون کو درست قرار دیا۔ مہمان خصوصی خان محمد عاطف نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو اتر پردیش کے کروڑوں لوگوں کی زبان ہے۔ حکومت کو عوام کی ضرورت کے تحت اس قانون کا نفاذ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر شوکت علی خاں ایڈووکیٹ نے کہا کہ اردو کو کرناٹک، مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور جزوی طور پر مغربی بنگال میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ان صوبوں کی طرز پر اتر پردیش میں بھی اردو کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ مذاکرہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رضوان احمد صدیقی، سید قیصر علی ایڈووکیٹ، نوجوان صحافی ذیشان مراد، عبدالاحد فرقانی اور کنوینر مذاکرہ نعمان غازی نے اردو زبان کی بقا کے لیے خود اہل زبان کو اپنی ذمہ داری نبھانے کی ضرورت پر زور دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 دسمبر 2014

حنیف نقوی کی خدمات پر مذاکرہ

وارانسی: بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر حنیف نقوی مرحوم کے یومِ وفات کے موقعے پر 23 دسمبر کو ایک مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے پروفیسر بلراج پانڈے نے کی جبکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر احمد صدیقی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ پروفیسر ظفر احمد نے اپنے کلیدی خطبے میں حنیف نقوی کے طریقہ تحقیق پر مفصل گفتگو کی اور متعدد واقعات سنائے جن میں معمولی معمولی باتوں سے نقوی صاحب مرحوم نے تحقیق کے پہلو تلاش کر لیے۔ انھوں نے کہا کہ نقوی صاحب کی ہر تحقیق مستند ہوتی تھی اور ان کے مضامین اور کتابوں سے تحقیق کے طریقے سیکھے جاسکتے ہیں۔ بلراج پانڈے نے اپنے صدارتی خطاب میں نقوی صاحب مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ مرحوم کی شخصیت کے سبھی پہلو ان کی شخصیت میں نمایاں تھے۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے شعبہ کے استاد ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے تمہیدی کلمات پیش کیے۔ مذاکرہ میں پروفیسر شاہینہ رضوی، پروفیسر شمیم اختر، پروفیسر رفعت جہاں، جہانگیر عالم ایڈووکیٹ نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شاد عباسی نے نقوی صاحب کی زندگی کے مذہبی پہلو پر روشنی ڈالی اور خراج عقیدت کے طور پر ایک نظم پیش کی۔ شعبہ فارسی کے استاد ڈاکٹر محمد عقیل نے بھی منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ شعبۂ اردو بی ایچ یو کی ریسرچ اسکالرز شبنم خاتون، فردوس، تمنا شاہین اور مبشرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کا آغاز مدن موہن مالویہ کی تصویر کی گل پوشی اور یونیورسٹی کے ترانہ سے کیا گیا۔ شعبے کی لڑکیوں نے مہمانوں کو گلدستے پیش کیے اور پروگرام کے کنوینر اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر نسیم احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروگرام میں پروفیسر حنیف نقوی کے اہل خانہ کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ آخر میں نقوی صاحب مرحوم کی صاحب زادی نغمہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ انھوں نے نہایت جذباتی انداز میں کہا کہ نقوی صاحب کی پہچان ان کے شاگردوں سے ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ان کی دختر ہوں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 دسمبر 2014

سرسید اور ان کے معاصرین

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں ایک خصوصی لیکچر بعنوان 'سرسید اور ان کے معاصرین' منعقد ہوا۔ یہ لیکچر خصوصی مقرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور معروف رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے دیا۔ پروگرام کی صدارت، صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف

علی اور شکریے کی رسم محترم آفاق احمد نے انجام دیے۔
پروفیسر صغیر افراہیم کا تعارف پیش کرتے ہوئے فرقان سنبھلی نے کہا کہ صغیر افراہیم اردو فکشن تنقید کی نئی نسل کا معتبر اور مستند نام ہیں۔ اس موقعے پر خصوصی مقرر پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے خطبے 'سرسید اور ان کے معاصرین' میں عہد سرسید اور معاصرین کی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے حالی شبلی کے تعلق سے کہا کہ انھوں نے سرسید کا ساتھ دیتے ہوئے سرسید تحریک کو عوامی بنانے میں اپنا صدفی صد تعاون دیا۔ اس موقعے پر معروف شاعر اور ادیب طالب زیدی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر معراج الدین احمد نے اس موقعے پر صغیر افراہیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے سرسید اور ان کے ساتھیوں کے تعلق سے اہم جانکاریاں ہمیں دیں۔ راجہ مہندر پرتاپ کے والد سرسید کے دوست تھے۔ انھوں نے راجہ جی کو گود میں لے کر یہ کہا تھا اسے مجھے دے دو اور ان کی تعلیم و تربیت کی تھی۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 23 دسمبر 2014

غالب کے یومِ پیدائش پر سیمینار

موانہ: انجمن ارتقائے ادب اردو کی جانب سے مرزا اسداللہ خاں غالب کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے قصبہ پھلاودہ میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت مرزا حسیم الدین ہمدم نے کی اور مہمان خصوصی بزرگ شاعر انوار حق شاداں رہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان ایک لشکری زبان ہے اردو کو ہمارے بزرگوں نے عالمی پیمانے پر بلندی عطا کی تھی۔ مگر آج اردو کو پستی کی طرف لے جانے کے ہم خود ذمے دار ہیں۔ مرزا حسیم الدین نے کہا کہ جب صوبائی سرکار اور دیگر سرکاریں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہیں تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ہم بھی اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلائیں تبھی اردو کو اپنا حق دلا سکیں گے۔ اس موقعے پر مرزا نایاب الدین، خلیل احمد، ڈاکٹر یونس ہاشمی، مرزا منہاج الدین، دلشاد قریشی، ضیا انصاری، تنویر احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 دسمبر 2014

خواجہ حالی بحیثیت مصلح

مظفر نگر: ضلع کے گاؤں پھلت کے قدیم دینی ادارہ جامعہ امام ولی اللہ میں خواجہ الطاف حسین حالیؒ کے یوم وفات کی مناسبت سے 'خواجہ حالی بحیثیت مصلح' کے عنوان سے ایک اہم پروگرام منعقد ہوا، جس کا آغاز حافظ محمد ادریس قریشی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ صدارتی خطاب میں جامعہ کے مہتمم مولانا محمد طاہر ندوی نے کہا کہ خواب الطاف حسین حالیؒ پانی پتی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم مصلح تھے اور خاص کر عورتوں کے حقوق کے تئیں حد درجہ بیدار تھے۔ مولانا محسن ندوی نے کہا خواجہ حالی کا کلام زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے، ماہنامہ ارمغان کے مدیر مولانا وصی سلیمان ندوی نے خیر القرون اور بعد کے ادوار کے مصلح شاعروں کے کلام پر روشنی ڈالی اور کہا کہ الطاف حسین حالی اس اعتبار سے ممتاز مقام کے حامل ہیں کہ انھوں نے سماجی مسائل کو قریب سے بلکہ خود کو ان کا شکار ہوتے دیکھا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جنوری 2015

کامٹی اردو مرکز کی ادبی تقریبات

ملکہ غزل بیگم اختر

فیروز آباد: کامٹی اردو مرکز کے زیر اہتمام دسمبر ماہ کو ادبی ماہ کے طور پر منایا گیا، اسی سلسلے کی پہلی تقریب کے طور پر ایک سیمینار بعنوان 'ملکۂ غزل بیگم اختر' الہدیٰ ماڈل اسکول میں منعقد کیا گیا جس میں شہر کے ادیب و شعرا نے بیگم اختر کے حالات زندگی، ان کی گلوکاری اور کلاسیکل موسیقی کی خدمات و غزل گوئی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ تقریب کے نثری دور میں پہلے شہر کے ادیبوں نے بیگم اختر کی فنکاری پر اپنے اپنے مقالے پیش کیے، جس کے بعد شعری دور کا آغاز ہوا، جس میں شعرا نے منظوم انداز میں بیگم اختر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی صدارت اسلامیہ انٹر کالج میں شعبۂ کامرس کے استاد اظہر فہیم نے کی جبکہ مہمان خصوصی مشہور شاعر صوفی جمیل افغانی تھے۔ تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائے کینرہ بینک کے سابق مینیجر صغیر احمد نے لکھنؤ میں بیگم اختر کے ساتھ گزرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا کہ وہ جہاں رہتے تھے، انھیں کے سامنے بیگم اختر کی بھی رہائش ہوا کرتی تھی۔ تقریب کے دوران صغیر احمد نے بیگم اختر اور طلعت محمود کے ساتھ گزارے اپنے پرانے لمحات کے علاوہ ان کی کچھ غزلیں بھی سامعین کی نذر کیں۔

کامٹی اردو مرکز کے سکریٹری افضال احمد نے اپنے مقالے میں بتایا کہ صرف پندرہ سال کی عمر میں بیگم اختر کی پہلی پیشکش منظر عام پر آ گئی تھی۔ میاں بصار الدین نے بیگم اختر کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ اظہر فہیم نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ بیگم اختر کی پیدائش، ان کی شادی اور انتقال تینوں اکتوبر ماہ میں ہی ہوئے یعنی ان کا انتقال 30 اکتوبر 1974 کو احمد آباد میں ایک اسٹیج شو کے دوران ایسے لمحات میں ہوا جب وہ اسٹیج پر ایک غزل پیش کر رہی تھیں۔ تقریب کے شعری دور کی نظامت عرفان ساحل نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 9 دسمبر 2014

یادِ شبلی

فیروز آباد: علامہ شبلی نعمانی پر ایک سیمینار 'یادِ شبلی' کے نام سے مدرسہ حبیبیہ جامعۃ البنات، کشمیری گیٹ پر منعقد کیا گیا جس میں ادیب و شعرا نے شبلی کے کارہائے نمایاں حیات و خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے مولانا تنویر القادری نے بتایا کہ شبلی اعظم گڑھ میں ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب 1857 کے غدر کے بعد ہوئے قومی زوال نے ہر ذی شعور مسلمان کو بے قرار کر رکھا تھا۔ مہمان خصوصی اور ایس آر کے ڈگری کالج میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر شہریار علی نے اپنے خطاب میں بتایا کہ سید سلیمان ندوی ان کے سب سے قریبی جانشینوں میں سے تھے، جنھوں نے شبلی کے شاہکار یعنی 'سیرت النبیؐ' جس کی وہ دو جلدیں ہی مکمل کر پائے تھے ان میں پانچ مزید جلدوں کے اضافے کے ساتھ اُس کو سات جلدوں تک لے جا کر مسلمانوں کی تشنگی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کام کیا۔ کامٹی اردو مرکز کے صدر میاں بصار الدین نے شبلی کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ امام ابو حنیفہ کی تقلید کی مناسبت سے شبلی کے نام کے ساتھ لفظ نعمانی ان کے استاد محمد فاروق چریا کوٹی نے جوڑ دیا تھا۔ مرکز کے سکریٹری اور اردو زبان کے مدرس افضال احمد نے اپنے مقالے میں بتایا کہ چوبیس برس کی عمر میں جب شبلی علی گڑھ گئے تو بظاہر تو وہ پروفیسر تھے، لیکن حقیقتاً یہ ان کی طالب علمانہ زندگی کا دوسرا دور تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 17 دسمبر 2014

یادِ حالی

فیروز آباد: خواجہ الطاف حسین حالی پر ایک سیمینار 'یادِ حالی'

کے نام سے حالی پبلک اسکول میں منعقد کیا گیا، جس میں ادبا و شعرا نے حالی کے کارہائے نمایاں، حیات و خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی، تقریب کی صدارت عظیم شاعر صوفی جمیل افغانی نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر الحاج شمشاد احمد خاں نے بھی شرکت کی۔

کامنی اردو مرکز کے صدر میاں بصارالدین نے بتایا کہ حالی ایک عظیم شاعر، نثرنگار، نقاد، استاد اور اصلاح معاشرہ کے علمبردار تھے۔ فوزیہ بانو نے اپنے مقالے میں

کہا کہ اردو شاعری کی کایا پلٹنے کے علاوہ حالی نے اردو نثر میں بیش قیمتی اضافہ کیا، اردو زبان میں علمی تنقید کی بنیاد انھیں نے ڈالی۔ مرکز کے سکریٹری اور اردو زبان کے مدرس افضال احمد نے حالی کی تصنیف شدہ نظم 'مسدس حالی' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حالی اگر قوم کا یہ مرثیہ لکھ دیتے اور اس کے علاوہ کچھ نہ کرتے تب بھی قوم کے محسنوں میں ان کا شمار سرسید اور محسن الملک کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ گلشن رضا ویلفیئر سوسائٹی کے سکریٹری اور سینٹ جانس کالج آگرہ میں شعبۂ اردو کے مدرس حافظ محمد ارشد رضوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ حالی نے شعر کی بنیاد خالص جذبات پر رکھی، فنی خوبیوں اور لفظی تراش خراش پر نہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 22 دسمبر 2014

یادِ غالب

فیروز آباد: ادبی ماہ کی آخری تقریب کے طور پر 'یادغالب' کے نام سے ایک تقریب الہدیٰ ماڈل اسکول میں منعقد کی گئی، جس میں ایک طرف جہاں ادیبوں نے پہلے دور میں اپنے مقالوں کے ذریعے غالب کی یاد کو تازہ کیا تو وہیں تقریب کے دوسرے دور میں شعرا نے انھیں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی صدارت بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر وصوفی جمیل افغانی نے کی۔ اس موقعے پر کامنی اردو مرکز کے صدر میاں بصارالدین احمد نے اپنے مقالے میں بتایا کہ غالب نے کبھی اپنی سوانح حیات تو نہیں لکھی، لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے ایک ایک پہلو کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ اگر اس کو یکجا کر دیا جائے تو غالب کی مکمل سوانح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

ایس آر کے ڈگری کالج میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر شہریار علی نے کہا کہ غالب کے خطوط میں نثر کے تمام کمالات موجود ہیں۔ افضال احمد نے کہا کہ غالب کے حساس دل نے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کو دیکھا اور اس کا درد محسوس کیا۔ سینٹ جونس کالج آگرہ میں شعبۂ اردو کے لیکچرر حافظ محمد ارشد خان نے اپنے مقالے میں غالب کی مکمل حیات کا احاطہ کرتے ہوئے سلسلہ وار معہ تاریخوں کے ان کی مکمل حیات سامعین کے سامنے رکھیں۔ کینرا بینک کے سابق منیجر صغیر احمد نے غالب کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی۔ تقریب کے دوسرے دور میں شعرا نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 29 دسمبر 2014

بہار:

واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر کا پٹنہ میں خطاب

پٹنہ: آکسفیم کے سیمینار ہال میں طلبہ وطالبات سے خطاب کرتے ہوئے واشنگٹن یونیورسٹی سینٹ لوئس (امریکہ) کے پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی نے نوجوانوں کو بتایا کہ آج امریکہ اور یورپ کی دانش گاہوں میں ہندوستانی طلبہ و طالبات کے لیے اعلیٰ تعلیم کے کتنے وسیع مواقع

ہیں۔ انھوں نے خود اپنی زندگی کے کئی واقعات بتا کر نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ آپ اسی مضمون اور اسی شعبے کو اختیار کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں جس میں آپ کی گہری دلچسپی ہے۔ اگر آپ کو اچھی انگریزی نہیں آتی تو یہ آپ کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے، اچھی زبان اور خوبصورت سلیقہ اظہار ایک خوبی ضرور ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے، اس کے بغیر بھی آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں آپ کے لیے بے پناہ امکانات ہیں اور مالی کمزوری رکاوٹ نہیں بنتی۔ ہر شعبے میں وظائف اور اسکالرشپ ہیں، آپ اس کے لیے یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر براہ راست رابطہ کرسکتے ہیں۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات موجود تھے۔ آکسفیم کے ڈائریکٹر یعقوب اشرفی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ڈاکٹر وارثی سے اس معلومات افزا ملاقات کے لیے انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید کے شکرگزار ہیں۔ حاضرین سے احمد جاوید نے بھی مختصراً خطاب کیا۔ انھوں نے ان سے کہا کہ آپ ڈاکٹر وارثی کی کامیابیوں سے روشنی حاصل کریں یہی ہماری خواہش ہے۔ اس موقعے پر آکسفیم کی جانب سے مہمانوں کے ہاتھوں گلدستہ اور نشان یادگار پیش کر کے معروف فوٹو صحافی محمد آزاد کی عزت افزائی بھی کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 دسمبر 2014

ضلع سطح کی اردو کانفرنس

حاجی پور: اردو کونسل ہند ضلع شاخ ویشالی اور کاروان ادب، حاجی پور کے زیراہتمام 14 دسمبر 2014 کو ضلع سطح کی اردو کانفرنس بمقام انجمن فلاح المسلمین حاجی پور منعقد ہوئی جس کی صدارت بہار یونیورسٹی مظفرپور کے شعبہ اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے اخترالایمان سابق ایم ایل اے اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے اردو کونسل ہند کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے شرکت کی۔

تقریب کی نظامت انوارالحسن وسطوی نے فرمائی۔ سیاسی رہنما اخترالایمان نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پہلے اپنے بچوں کو مادری زبان کی تعلیم دینی چاہیے اس کے بعد ہی دوسری تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے 'اردو ماضی اور حال کے آئینہ میں' عنوان سے اپنے مقالہ پڑھا۔ اس موقعے پر انوارالہدیٰ، ڈاکٹر شفیع الزماں، شمیم احمد حاجی پوری اور الحاج محمد ابوصالح نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر رضیہ تبسم (پٹنہ) کی کتاب 'آموزش اردو' کا اجرا بدست ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اور مولانا ابوالخیر جبریل کے شعری مجموعہ مرتبہ مولانا صدر عالم ندوی کا اجرا بدست ڈاکٹر اسلم جاوداں انجام دیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 دسمبر 2014

مولانا مظہرالحق کا 148واں یوم پیدائش

پٹنہ: دیش بھوشن مولانا مظہرالحق ایک عظیم انسان اور سچے وطن پرست تھے۔ انھوں نے ملک کی آزادی کی خاطر اپنی پوری زندگی وقف کردی اور ہندو مسلم ایکتا کا ایک آفاقی پیغام دیا۔ یہ باتیں مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ میں، مجاہد آزادی مولانا مظہرالحق کے 148 ویں یوم پیدائش و یوم تاسیس تقریب کے موقعے پر بہار کے وزیراعلیٰ شری جیتن رام مانجھی نے کہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ یونیورسٹی مولانا کی ایک زندہ یادگار اور بہار

گلبرگہ میں 'کھلی کتاب: ایک مباحثہ' کے انعقاد کا منظر

کی ایک عظیم وراثت ہے اور اس کی ہمہ جہت ترقی ہماری ذمے داری ہے۔ اس موقعے پر وزیراعلیٰ نے مولانا مظہرالحق کی حیات وخدمات اور یونیورسٹی کی سرگرمیوں پر مبنی ایک یادگاری مجلّے کا بھی اجرا کیا۔ تقریب میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کررہے وزیر تعلیم شری برشن پٹیل اور وزیر اقلیتی فلاح جناب نوشاد عالم نے بھی خطاب کیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد، وائس چانسلر مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی نے کی۔ اس تقریب میں وزیر اقلیتی فلاح جناب نوشاد عالم چیئرمین بہار ریاستی حج کمیٹی، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، پرنسپل سکریٹری ہوم اور اقلیتی فلاح حکومت بہار جناب عامر سبحانی او ر بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر جناب شاہنواز خان، ڈائریکٹر ہائر ایجوکیشن پروفیسر سید محمد کریم اور مولانا مظہرالحق کے پوتے جناب وارث علی فاروقی نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے انھیں گلدستہ اور شال پیش کرکے ان کا اعزاز کیا۔ دوسرے سیشن میں یونیورسٹی کے طلبا و طالبات نے متعدد تعلیمی اور رنگارنگ ثقافتی پروگرام پیش کرکے اپنی صلاحیت اور فن کا مظاہرہ کیا۔ جس کی نظامت اکیڈمک کیمپس کے انچارج ڈاکٹر اعجاز عالم نے کی۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر چودھری شرف الدین نے اس تاریخ ساز تقریب کی شاندار کامیابی کے لیے اپنے معاونین اور کارکنان جامعہ کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب میں یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد شمس الضحیٰ سمیت دیگر عہدے داران ومعززین شہر موجود تھے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر انعام ظفر، ڈیولپمنٹ آفیسر، 24 دسمبر 2014

تلنگانہ

محفل خواتین کا سالانہ جلسہ

حیدرآباد: نئی نسل کو اردو سے قریب کرنا ضروری ہے تاکہ مستقبل میں اردو بولنے والی نسل موجود رہے۔ ان خیالات کا اظہار کینیڈا، مسقط، دبئی، سے آنے والے اکابرین نے مشترکہ طور پر کیا جو محفل خواتین کے سالانہ اجلاس سے مخاطب تھے۔ یہ جلسہ اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ مہمانان خصوصی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر فاطمہ پروین، جناب خواجہ کمال الدین اور کینیڈا سے آئے مہمان جناب سید بشیر بیگ، صدر حیدرآباد ایسوسی ایشن کینیڈا تھے۔ مہمانوں کا استقبال پروفیسر حبیب ضیا اور محترمہ عزیزالنساصبا نے کیا۔ بیرون ملک سے آنے والے ادب نواز حضرات کا خواجہ کمال الدین نے مختصر تعارف پیش کیا۔ محفل خواتین کے میگزین کی رسم اجرا بیگم سرور بابو خاں نے انجام دی۔ مہمان خصوصی پروفیسر فاطمہ پروین نے محفل خواتین کی ستائش کی۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ایڈیٹر ماہنامہ شگوفہ نے محفل خواتین کی کارکردگی کو سراہا اور 43 ویں سالگرہ پر مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر اشرف رفیع نے زبان کو عام کرنے اور کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ایس اے شکور سکریٹری و ڈائرکٹر اردو اکادمی نے کہا کہ اردو کی نئی نئی بستیاں بسائی جارہی ہیں اور ریاست تلنگانہ اردو پر توجہ دے رہی ہے۔ ادبی اجلاس میں نصرت ریحانہ آصف، شبینہ فرشوری، عطیہ نورالحق، ثریا جبین، عاصمہ خلیل، ڈاکٹر فریدہ زین، قمر جمالی، خیرالنسا علیم نے اپنے افسانے پیش کیے۔ تسنیم جوہر ادبی اجلاس کی کنوینر تھیں۔ محفل خواتین کی تین افسانہ نگاروں افروز سعیدہ، عاصمہ خلیل، خیرالنسا علیم کو کیلی فورنیا کے اخبار 'لنک' کی جانب سے ایوارڈ دیے گئے۔ بعد ازاں نکہت آرا شاہین کی نظامت میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں اسریٰ منظور، مظفر النسا ناز، عزیز محبوب، تسنیم جوہر، رخسانہ صبا، انجم قمر سوز نے اپنا کلام سنایا۔ تسنیم جوہر کے شکریے پر یہ خوبصورت محفل اختتام کو پہنچی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 26 دسمبر 2014

جموں و کشمیر

تحریک بقائے اردو کی ریاستی کانفرنس

رام بن: تحریک بقائے اردو نے رام بن میں ریاستی سطح کی اردو کانفرنس منعقد کی جس میں باتفاق رائے قرارداد پاس کرکے تحریک نے جموں کشمیر میں اردو وزارت قائم کرنے کا زوردار مطالبہ کیا۔ اس کانفرنس میں معروف شاعر و ڈائریکٹر آئی سی سی آر حکومت ہند، پروفیسر ایاز رسول ناز مہمان خصوصی تھے جبکہ کشمیر عظمیٰ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر رحمت اللہ رونیال اور معروف شاعر منشور بانہالی مہمانان ذی وقار تھے۔ تقریب کی صدارت تحریک کے سرپرست و ضلع ترقیاتی کمشنر رام بن فاروق شاہ بخاری نے کی۔ پروگرام میں 3 بڑے سالانہ ایوارڈ دیے گئے جن میں حامدی کاشمیری کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ ایوارڈ عشرت کاشمیری کو لالہ ملک راج صراف ایوارڈ اور نواب الدین کسانہ کو شان اردو ایوارڈ سے نوازا گیا جبکہ تحریک کی طرف سے بانہال میں منعقدہ تلاش ہنر پروگرام میں اول دوم وسوم آنے والے بچوں اور ان کے اساتذہ کو بھی توصیفی اسناد بانٹی گئی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر طارق تمکین نے کی جبکہ ایوارڈ کی نظامت محمد صغیر مرزا نے کی۔ خورشید تانترے کی طرف سے خطبہ استقبالیہ کے بعد تحریک کے مرکزی جنرل سکریٹری و ترجمان ذاکر ملک بھلیسی نے تحریک کی طرف سے کیے گئے 4 سالہ کارکردگی کو لوگوں کے سامنے رکھا۔ اس موقعے پر اکیسویں صدی میں اردو کے مسائل پر ڈاکٹر مشتاق وانی اور محی الدین زور کشمیری نے پرچے پڑھے جبکہ آفتاب منہاس نے قرارداد پیش کی۔ وہیں تحریک بقائے اردو و محکمہ اطلاعات کے اشتراک سے مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا جس میں کئی مقامی شعراء نے اپنا کلام پڑھا۔ اس نشست کی صدارت معروف شاعر ذوالفقار علی نقوی نے کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 26 دسمبر 2014

کرناٹک

گلبرگہ میں 'کھلی کتاب' پر مباحثے کا انعقاد

گلبرگہ: معروف افسانہ نگار، ڈراما نگار اور ترجمہ نگار قدیر زماں کی ادبی خدمات پر مشتمل محترمہ شیراز سلطانہ کی مرتب کردہ کتاب پر ایک مباحثہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر حمید سہروردی نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریب میں کہا کہ قدیر زماں کے فکر وفن کے مطالعے کے بعد یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ نو مارکسی ادیب ہیں یا جدید۔ ان کی ادبی جہات اور خدمات قابلِ ستائش ہیں۔

ممتاز خاکہ نگار ڈاکٹر وہاب عندلیب نے جناب

قدیر زماں کے ہم راہ رفاقت کو پُر اثر انداز میں بیان کیا اور انھیں ایک جیّد فن کار قرار دیا۔ سینئر صحافی وشاعر حامد اکمل نے کہا کہ قدیر زماں ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے کھلی کتاب کے خطوط والے باب کو بے حد اہم ترین قرار دیا اور کہا کہ ان خطوط سے ایک عہد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود جعفری نے کہا کہ قدیر زماں ہشت پہلو شخصیت ہیں۔ وہ قدیر زماں نہیں بلکہ نادر الزماں ہیں۔ افسانہ وناول نگار محترمہ قمر جمالی نے کہا کہ شب خون میں شائع شدہ قدیر زماں کا مضمون 'افسانے کے چار کھونٹ' کی حیثیت ایک کتابچہ کی ہے۔ اس مضمون سے فکر ونظر کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار جناب امجد جاوید نے کہا کہ قدیر زماں کے افسانوں میں تنوع ہے۔ علامات اور تشبیہات ان کے افسانوں کا خاصہ ہیں۔ آخر میں قدیر زماں نے اس مباحثہ کے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ حسن محمود نے نظامت کی اور ناصر عظیم نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، محمد حسن محمود، گلبرگہ، 23 دسمبر 2014

اشعارِ غالب سے مزین مصوری کے نمونوں کی نمائش

بنگلور: کرناٹک اردو اکادمی نے غالب کے 217 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر میسور کے مشہور مصور سید منور حسین کے غالب کے اشعار پر مبنی مصوّری کے نمونوں کی پانچ روزہ نمائش کا اہتمام کیا۔

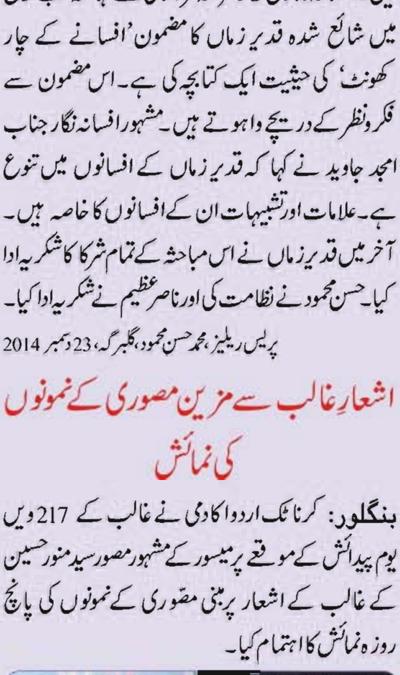

کرناٹک اسٹیٹ مائنارٹیز ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے چیرمین جناب مسعود فوجدار کے ہاتھوں اس نمائش کا افتتاح ہوا۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنی تقریر میں اردو اکادمی کو مبارکباد پیش کی کہ اس نے غالب کی سالگرہ کو بہت بامعنی انداز میں منایا ہے اور ایک غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک آرٹسٹ کی تخلیقات کو محبان اردو کے روبرو پیش کیا ہے۔ اس موقعے پر گوہر تریکیر وی اور عبدالقادر عارف نے سید منور حسین کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خدمت میں تہنیت پیش کی۔ اکادمی کے رکن عزیز اللہ بیگ نے مصوری اور شاعروں کے باہمی اور داخلی ربط پر روشنی ڈالتے ہوئے سید منور حسین کی بنائی ہوئی تصویروں کی ستائش کی اور کہا کہ انھوں نے غالب کے 27 منتخب اشعار کا احاطہ کیا ہے۔ اکادمی کی صدر ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے اپنی صدارتی تقریر میں سید منور حسین کے فن کو خراج تحسین پیش کیا۔ اکادمی کے رکن ملنسار اطہر احمد نے نظامت کی اکادمی کے رجسٹرار جناب صدیق پاشاہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور محترمہ نشاط بانو نے اپنی حمد سے جلسے کا آغاز کیا۔ رکن اکادمی جناب نعمت اللہ خان نے شکریے کی رسم انجام دی۔

پریس ریلیز، کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور، 31 دسمبر 2014

مہاراشٹر:

اردو ادب اور سماج

ناگپور: راشٹر وادی کانگریس پارٹی کی جانب سے، 'اردو ادب اور سماج' کے موضوع پر ایک اردو سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس کی صدارت کے فرائض ہیمنت ٹکلے نے انجام دیے۔ نظامت معروف ادیب ڈاکٹر اشفاق احمد نے انجام دی۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل

بطور مہمانِ خصوصی موجود تھے۔ ڈاکٹر ساحل نے اپنی تقریر کے دوران اردو میں مسلم ادیبوں شاعروں اور پبلشروں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے اولین، ناول نگار، (پنڈت رتن ناتھ سرشار) افسانہ نگار (منشی پریم چند)، شاعر (چندر بھان برہمن) تاریخ نویس (رام بابو سکسینہ) صحافی (راجہ راموہن رائے اور لالہ سکھ دیو) اور پبلشر (منشی نول کشور) کی خدمات اردو زبان کی ترقی میں غیر مسلموں کے زبردست تعاون کا کھلا ثبوت ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے اپنے مقالے میں سر سید کی تعلیمی تحریک کی تفصیلات بیان کی۔ ڈاکٹر صفدر نے 'اردو شاعری اور ہندوستان کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے اپنے مضمون میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں حقیقت نگاری، سماجی شعور اور بدلتی ہوئی قدروں کی عکاسی کا تجزیہ کیا۔ صدرِ جلسہ نے سامعین کی کثیر تعداد کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں کنو ینز اجے پاٹل کے علاوہ کامل انصاری، ڈاکٹر ساگر کھادی والا اور شہر کی ادب نواز شخصیات اور کئی قلم کار موجود تھے۔

پریس ریلیز، محمد اسد اللہ، ناگپور، مہاراشٹرا، 16 دسمبر 2014

جلگاؤں میں محفل افسانہ کا انعقاد

جلگاؤں میں محفل افسانہ کے انعقاد کا منظر

جلگاؤں: راشٹریہ اکا تمتا پبلک اُردو لائبریری اسلام پورہ جلگاؤں کے زیرِ اہتمام ریاستی محفلِ افسانہ کا انعقاد خورشید حیات کی صدارت میں کیا گیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں موصوف نے تمام افسانوں کا تجزیہ اپنے خاص انداز میں کیا۔ اس سے قبل اُنھوں نے اپنا افسانہ' آنگن میرے گھر کا' کی قرأت کی اور آج کے الجھے ہوئے رشتوں کی کہانی سامعین کو سنائی۔

افسانہ نگار نور الحسنین نے اپنے افسانے 'ایک دِن کی بات' کے ذریعے آج کی برہنہ حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر اکبر رحمانی نے افسانہ نگار معین عثمانی کے تعلق سے اپنا مقالہ 'خاندیس میں اردو افسانہ' کی قرأت کی اس کے بعد معین الدین عثمانی نے اپنی کہانی 'مراجعت' پیش کی۔

بھیونڈی سے تشریف لائے مہمان افسانہ نگار ایم مبین نے کہانی 'کاروائی' پیش کی۔ وحید اِمام نے اپنے افسانے 'لمحوں نے خطا کی تھی' میں ہندوستان کی چارسو سالہ تاریخ کے ساتھ ساتھ آج دہشت گردی کے نام پر ہونے والی کارگزاریوں کا دردانگیز احوال بھی پیش کیا، سہیل اختر رحمانی

ناگپور میں اردو کوچنگ کلاس کا منظر

نے اپنے منی افسانوں پشاور (1) اور پشاور (2) میں پشاور کے آرمی اسکول میں ہوئے بہیمانہ قتل کا بیورا پیش کیا۔

شہر جلگاؤں کے معروف ماہر قانون اور مراٹھی اور اُردو کے مستند افسانہ نگار احتشام دیشمکھ کے ناگہانی سانحہ ارتحال پر تعزیتی و پشاور کے آرمی اِسکول میں دہشت گردانہ حملہ میں شہید ہونے والے معصوم طلبہ کی ہلاکت کے خلاف مذمتی قرارداد پیش کی گئی۔ وحید امام نے محفل کی نظامت دلنشین انداز میں کی، رسم شکریہ سہیل رحمانی نے ادا کی۔

پریس ریلیز، اے وحید انصاری، 26 دسمبر 2014

ناگپور میں اردو کوچنگ کلاس

ناگپور: ودربھ ساہتیہ سنگھ ناگپور کے زیر اہتمام ہفت اردو کوچنگ کلاس کے 102 ویں بیچ کا اختتام گزشتہ دنوں عمل میں آیا۔ ایک سادہ اور پروقار تقریب کی صدارت ودربھ ساہتیہ سنگھ کی جنرل سکریٹری شریمتی شوبھا اُبگڑے نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے معروف ادیب واسکالر ڈاکٹر محمد اظہر حیات شریک جلسہ تھے۔ واضح ہو کہ یہ کلاس گزشتہ 35 برسوں سے ودربھ ساہتیہ سنگھ سیتابرڈی کی وسیع وعریض عمارت میں جاری ہے۔ فری اردو کوچنگ کلاس کے مدرس جناب محمد قمر حیات 1979 سے اب تک غیر اردو داں حضرات کو اردو سکھا رہے ہیں۔ قمر حیات صاحب کی بے لوث خدمات کی ستائش کرتے ہوئے صدر شریمتی شوبھا ابگڑے نے حاضرین طلبا و طالبات کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ بھاشا اور زبان سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو ڈکشنری استعمال کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اختتامی جلسہ کے آغاز میں کلاس سے فارغ طلبا و طالبات نے اپنے مشاہدات و تجربات بیان کیے۔ تمام غیر مسلم طلبا و طالبات اردو کی شیرینی اور مٹھاس سے بہت ہی متاثر نظر آئے۔ اس موقعے پر کلاس کے استاد محمد قمر حیات نے طلبا کو سہ ماہی اردو کورس مکمل کرنے پر مبارکباد پیش کی اور انھیں اردو پڑھنے لکھنے کی عادت ڈالنے کا مشورہ دیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر آرتی کیلکر نے کی۔ جبکہ ایڈوکیٹ سنجے مورے نے اظہارِ تشکر کیا۔

بذریعہ ڈاک، محمد عادل، ناگپور، 10 دسمبر 2014

کاوش کی سالانہ تقریب

ممبئی: 1 جنوری کو 'ہم ہوں گے کامیاب' کے زیرعنوان 'کاوش' کی تیسری سالانہ تقریب کا نہرو سینٹر آڈیٹوریم میں کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام میں امسال ایس ایس سی امتحان میں شریک ہونے والے اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے وقت کی منصوبہ بندی، بورڈ امتحان کے تناؤ، سوالیہ پرچہ حل کرنے کا فن پر ماہرین کے ذریعے سیر حاصل روشنی ڈالی گئی۔ نیز مختلف شعبۂ حیات میں نمایاں مقام حاصل کرنے والے ٹاپرس کے ساتھ طلبہ کی بات چیت کا سیشن بھی رکھا گیا۔ اس معلوماتی وترغیبی پروگرام میں کشمیر سے تعلق رکھنے والے مسلم آئی اے ایس آل انڈیا ٹاپر اور موجودہ ڈیولپمنٹ کمشنر شاہ فیصل کے ساتھ مقتدر تعلیمی شخصیات اور عمائدین نے شرکت کی۔ علاوہ ازیں بذریعہ اردو میڈیم تعلیم حاصل کرکے اعلیٰ ترین اور پرکشش عہدوں پر فائز ہونے والے حضرات نے بھی تقریب ہٰذا میں شرکت کرکے رونق بخشی۔ تقریب کو تین سیشن میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے سیشن میں طلبہ کو مقصد کے تعین، امتحان کی تیاریوں اور دیگر اہم موضوعات پر ماہرین تعلیم نے مفید مشوروں سے نوازا۔ دوسرے سیشن میں رول ماڈل حضرات کے ساتھ طلبہ کا ٹاک شو رکھا گیا نیز تعلیمی ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔ تیسرے سیشن میں مہمانان خصوصی اور ماہرین تعلیم نے تقریب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر شاہ فیصل نے خوبصورت کشمیری لب ولہجے میں والدین کو نصیحت آمیز انداز میں کہا کہ سرپرست حضرات اپنے اطراف ایسا تعلیمی ماحول تشکیل دیں جس میں بچے قوم وملت کا نام روشن کرسکیں۔ اس تعلیمی پروگرام میں ممبئی کی غیر معروف اردو میڈیم اسکولوں میں نمایاں نمبرات سے کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو شاہ فیصل کے ہاتھوں اسناد سے نوازا گیا۔ نیز اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے عرفان خان (جلگاؤں)، ذیشان باغبان (پونے) اور فیصل انصاری (بھیونڈی) کو بطور رول ماڈلس متعارف کروایا گیا۔ بعد ازیں آڈیٹوریم میں موجود طلبہ نے مختلف موضوعات پر ان رول ماڈلس سے سوالات پوچھے جن کا انھوں نے تسلی بخش جواب دیا۔

تقریب ہٰذا سے انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی، ڈاکٹر صادق پٹیل (گرانٹ میڈیکل کالج، جے جے ہاسپٹل) اور سماجی خدمت گار علی ایم شمسی نے بھی خطاب کیا۔ بعد ازیں ظہیر قاضی اور پروگرام کے مہمان خصوصی شاہ فیصل کے ہاتھوں 'گرامر ایکٹیویٹیز' نامی رہنما کتاب کا اجرا کیا گیا۔ پروگرام کاوش کے جنرل سکریٹری شیخ اخلاق کے ہدیہ تشکر پر اختتام پزیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جنوری 2015

مغربی بنگال:

مٹیابرج ہندوستانی لائبریری کا 75 سالہ جشن

مٹیابرج: 30 نومبر، مٹیابرج میں ہندوستانی لائبریری کے 75 سال پورے ہونے پر 'پلاٹینیم جبلی جشن' پوری ریاست میں اپنی نوعیت کا منفرد پروگرام رہا۔ ہندوستانی لائبریری کے 75 سالہ جشن کا انعقاد خاتون محل سنیما ہال میں کیا گیا۔ عمائدین شہر، دانشوران قوم، مختلف دانشگاہوں کے پروفیسر، شعراء اور ادباء کی کثرت سے شرکت نے جشن کو کامیابی کے اوج ثریا تک پہنچا دیا۔ محمد داؤد قریشی نے تلاوت کلام پاک سے بزم کا آغاز کیا۔ محمد اقبال خان نے نعتِ پاک کے چند اشعار ترنم سے پڑھ کر پروگرام کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد جناب شکیل انصاری صدر ہندوستانی لائبریری نے اپنے صدارتی خطبے میں لائبریری کے عہدِ رفتہ کی کچھ یادیں، پروگرام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ محمد اقبال قریشی نے سکریٹری رپورٹ پیش کی۔ مجلّہ 'کہکشاں' کا اجرا مولانا محمد قاسم علوی کے ہاتھوں ہوا۔ بعد ازاں مولانا علوی نے بانیان لائبریری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے موجودہ صدرِ لائبریری شکیل انصاری اور سکریٹری محمد اقبال اور ان کے جملہ اراکین کو اردو والوں کے لیے عظیم الشان پروگرام آراستہ کیے جانے پر مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے اردو اساتذہ وطلبا اور خصوصاً صدرِ تقریب شمس الزماں انصاری (ایم ایم آئی سی) سے لائبریری کے آئندہ کے منصوبوں کی تکمیل اور اس کی ترقی کے لیے آگے آنے کی درخواست کی۔ اس موقعے پر بانیانِ لائبریری اور مٹیابرج کے وقار کو بلند کرنے اور اس سرزمین کو تابناکی عطا

کرنے والے 42 نمائندہ منتخب افراد کو جنھوں نے سماجی، ادبی، علمی، سیاسی، ملی اور کھیل کود کے میدان میں نمایاں کارنامہ انجام دیے۔ 'نازش مٹیابرج' ایوارڈ اور ایک سند سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کولکاتہ، یکم دسمبر 2014

خضر پور کالج میں خصوصی لیکچر

کولکاتا: خضر پور کالج کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ایک خصوصی تقریب میں شعبے کی سینئر استاد ڈاکٹر دیبا ہاشمی کی قیادت اور شعبے کی صدر ڈاکٹر درخشاں زریں کی نظامت میں سینٹرل یونیورسٹی آف بہار (CUB)، گیا سے تشریف لائے ڈاکٹر احمد کفیل نے 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا' پر خصوصی لیکچر دیا۔ انھوں نے اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے اس بات کا انکشاف کیا کہ اردو کی پیدائش میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کا حصہ رہا ہے۔ لسانیات کا فارمولا بتاتا ہے کہ صدیوں اور ہزاروں برسوں میں غیر محسوس طریقے سے کسی زبان کا ڈول تیار ہوتا ہے اردو نے سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنشوں سے گزرتی ہوئی کھڑی بولی پر اپنی بنیاد قائم کی۔ خصوصی لیکچر سے قبل ڈاکٹر دیبا ہاشمی نے مہمانِ خصوصی کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر درخشاں زریں نے اظہارِ تشکر ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کولکاتا، 4 جنوری 2015

ہریانہ:

مدن لال گرگ کے شعری مجموعوں کا اجرا

نئی دھلی: این سی آر کے فرید آباد میں ہندی ساہتیہ کی ادبی تنظیم اردو دوست رجسٹرڈ کے زیر اہتمام تقریب رسم اجرا اور شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ نیلم روڈ باٹا راج مندر ہوٹل کے امنگ ہال میں پیشہ سے میکینکل انجینئر مدن لال گرگ کے دیوناگری میں شائع ایک ساتھ 4 شعری مجموعوں اضطراب، سکھ کی راہ، تیری محبت اور عشق ہے عشق کا اجرا عمل میں آیا۔ اس پرمسرت موقعے پر آئے مہمانوں کا گلدستہ اور پھول مالاؤں کے ساتھ گرم جوشی سے استقبال کیا گیا، اور رسم اجرا پر ایم ایل گرگ کو شرکا نے مبارکباد پیش کیں۔ مہمانِ خصوصی ایم ایل اے وپل گوئل کے چھوٹے بھائی رہے۔ کلاوتی پبلشنگ گروپ نئی دہلی کے مالک کے علاوہ ڈائس پر ادب نواز شخصیات نے کتابوں کی رسم رونمائی ادا کی۔ صدارت مکیش گمبھیر، جے پی گپتا نے مشترکہ طور پر کی جبکہ نظامت نرگس خاموش نے کی۔ سلیکھا جین نے ایم ایل گرگ کی شاعری اور اس کے پیچ وخم دور کرنے نیز اصلاح کا تذکرہ کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 15 دسمبر 2014

تہذیب و ثقافت:

مولانا آزاد کے فکروفن پر فلم کی نمائش

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے اشتراک سے مسکان فاؤنڈیشن نے مولانا آزاد کے یوم پیدائش کے موقعے پر مولانا آزاد پر ایک ڈاکیومینٹری فلم کی نمائش کی جس میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا گیا۔ اس موقعے پر اقلیتی امور کی مرکزی وزیر نجمہ ہپت اللہ، دہلی کی سابق وزیر اعلیٰ شیلا دکشت، آئی آئی سی سی کے صدر سراج الدین

نجمہ ہپت اللہ، شیلا دکشت اور سراج الدین قریشی کے ساتھ
بڑی تعداد میں لوگ فلم دیکھتے ہوئے

قریشی، نائب صدر صفدر حسین خان کے علاوہ بورڈ آف ٹرسٹیز اور ایگزیکیٹیو ممبران خاص طور سے موجود تھے۔ فلم کی ڈائریکٹر لولین کھڈانی نے فلم کے حوالے سے بنیادی باتیں بتائیں۔ فلم میں مولانا آزاد کی ملک کے اندرونی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد، ملکی وقومی خدمات اور گاندھی جی کے ساتھ تقسیم وطن کو روکنے کے لیے تحریکی خدمات کو دکھایا گیا ہے۔ فلم میں مولانا آزاد کے اس جملے پر خاص ارتکاز ہے کہ اگر ملک تقسیم ہوا تو خوفناک نتائج منظرِ عام پر آئیں گے اور تقسیم کے بعد وہی ہوا جو مولانا آزاد نے کہا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 دسمبر 2014

اعزاز و اکرام:

ظفر سریش والا

نئی دھلی: گجرات کے تاجر اور مولانا آزاد اردو یونیورسٹی

کے نومنتخب چانسلر ظفر سریش والا نے اردو زبان کے فروغ کے معاملے میں کہا کہ آزادی کے بعد اردو کو ایک طبقہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور اس سے اس زبان کا بہت نقصان ہوا۔ ہمیں اردو کو اس دائرے سے باہر نکالنا ہوگا۔ حکومت نے مجھے ایک ذمے داری دی ہے اور میں اردو کے فروغ میں اسے پوری ایمانداری کے ساتھ نبھانے کی کوشش کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کو ترقی کی مین اسٹریم میں لانے کا نظم کرنے کی ضرورت ہے اور وزیر اعظم نریندر مودی پورے ملک کے ساتھ مسلم طبقے کی ترقی کو لے کر سنجیدہ ہیں۔ گزشتہ دنوں حیدرآباد واقع مولانا آزاد یونیورسٹی کے چانسلر مقرر کیے گئے گجراتی صنعت کار اور پرسولی کارپوریشن لمیٹڈ کے ایم ڈی ظفر سریش والا نے ایجنسی سے کہا کہ وزیر اعظم مودی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے ہی ہوسکتی ہے۔ انھوں نے گجرات میں کئی بار کہا کہ مسلمانوں کو پڑھاؤ اور آگے بڑھاؤ۔ وہ اس طبقے کی ترقی کو لے کر سنجیدہ ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 جنوری 2015

بین الاقوامی جشن ادب 2014 کا ایوارڈ

نئی دھلی: جشن ادب سوسائٹی فار پوئٹری اینڈ لٹریچر کے زیر اہتمام ملٹی پرپز ہال انڈیا انٹرنیشنل میں تیسرے 'بین الاقوامی جشن ادب 2014' کی تقریب ایوارڈ کا اہتمام کیا گیا جن میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ کویتا اور شاعری سے انھیں بچپن سے محبت ہے۔ انھیں ہماچل کے لوک گیت بھاتے تھے اور پھر انھیں سن کر وہ ڈوگری میں گیت لکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں اس ریاست کی نمائندگی کرتا ہوں جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے حالانکہ وہاں کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اردو شاعری سے بھی بے حد محبت ہے۔ سنسکرت کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ کالی داس کی شاعری کا جواب نہیں ہے۔ یہ سب ہماری اور اس ملک کی ہی نہیں پوری دنیا کی وراثت ہے جس کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کرن سنگھ اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر ایچ خان کے ہاتھوں اردو کے معروف شاعر اور نقاد ش ک نظام کو 'شان اردو' اور ہندی کے معروف کوی ڈاکٹر کنور بے چین کو 'شان ہندی' کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر کرن سنگھ کو چیف گیسٹ ٹرافی اور پاکستان کی معروف شاعرہ کشور ناہید کو مومنٹو پیش کیا گیا۔ بعد ازاں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کشور ناہید نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 دسمبر 2014

چنئی میں ادبی تقریب کا منظر

چنئی میں ادبی تقریب

چینئی: 30 دسمبر 2014 کو شعبۂ عربی، فارسی اور اردو، یونیورسٹی آف مدراس اور تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز کے زیر اہتمام بمقام او آر آئی پلاٹینم جوبلی ہال، چینئی میں ایک شاندار ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس اجلاس کی صدارت جناب مختار بدری، کرشنا گری نے کی جبکہ اس کا افتتاح ڈاکٹر سید سجاد حسین نے کیا۔ جناب علیم صبا نویدی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے محفل میں شرکت کی اور مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے جناب ایم جی، داؤد میاں خان، الحاج ضیاء الدین احمد، محترمہ منوری بیگم، ممبر قومی اردو کونسل، جناب الیس۔ کندا سوامی (ایوارڈ یافتہ ساہتیہ اکادمی)، جناب ایم کندن کرشنا گری، جناب نا کی پرساد اور جناب ڈاکٹر صغیر افراہیم علی گڑھ نے محفل کی رونق بڑھائی جلسہ کی نظامت جناب اشفاق الرحمن مظہر نے کی۔

خطبۂ استقبالیہ میں جناب علیم صبا نویدی نے بتایا کہ اس اجلاس میں سات صوبوں کے معتبر ادبا، شعرا نے دور دراز مقاموں کا سفر کر کے شرکت کی اور اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغات سے نوازا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے جناب ایم کندن، ڈپٹی ڈائرکٹر آف جیالوجی، کرشنا گری، کو نواب سی عبدالحکیم ایوارڈ 2014، سے بدست الحاج ضیاء الدین احمد، مسلم ہائر سکنڈری اسکول نوازا گیا۔ اس کے بعد جناب مختار بدری کی تصانیف جیتے جاگتے کردار (تمل افسانوں کے تراجم) اور اردو کدائی گل (تمل سے اردو افسانوں کے تراجم) کی رسم اجرا کی گئی اور ان کی پہلی کاپیاں ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اور جناب الیس کندا سوامی نے حاصل کیں۔ اس محفل میں کئی کتابوں اور رسائل کا اجرا کیا گیا۔ اس تقریب میں مختلف صوبوں سے آئے ہوئے شعرا و ادبا اور تمل ناڈو کے معروف فنکاروں کو ان کی دینی، ادبی اور محققانہ کارناموں کے اعتراف میں تمغات سے نوازا گیا جو اس طرح ہیں:

حضرت العلام مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی ایوارڈ 2014

(1) الحاج ایچ عبدالعزیز (2) ڈاکٹر محبوب راہی، اکولہ (3) پرنسپل علی منیر، ہزاری باغ، (4) ڈاکٹر سید نیاز احمد، چینئی کو دیا گیا۔

مولانا مولوی باقر آگاہ ویلوری ایوارڈ 2014

(1) ڈاکٹر راہی فدائی، بنگلور، (2) جناب علیم صبا نویدی، چینئی، (3) ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، نئی دہلی، (4) ڈاکٹر محمد علی اثر، حیدرآباد کو دیا گیا۔

نواب سی عبدالحکیم ایوارڈ 2014

(1) جناب کندن، کرشنا گری، (2) ڈاکٹر انیس چشتی، پونہ کو دیا گیا۔

قائدِ ملت محمد اسماعیل ایوارڈ 2014

(1) ڈاکٹر حاجا کے مجید، چینئی (2) ڈاکٹر کے رضی الدین احمد، چینئی (3) جناب ابرار احمد، میل وشارم کو دیا گیا۔

قلندر دکن حضرت کاوش بدری ایوارڈ 2014

(1) ڈاکٹر الف انصاری، کولکاتہ، (2) ڈاکٹر سلیمان خمار، بیجاپور (3) ڈاکٹر رونق شہری، دھنباد، (4) جناب شان بھارتی، دھنباد، (5) جناب قطب سرشار، محبوب نگر، (6) ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، (7) جناب مجتبیٰ فہیم، حیدرآباد، (8) جناب نٹ کھٹ، عظیم آبادی، (9) ڈاکٹر محمد زاہد انصاری، کولکاتہ، (10) ڈاکٹر عبیداللہ چودھری، گورکھپور، (11) جناب عثمان انجم، وشاکھاپٹنم، (12) پروفیسر اودو مہاجن بسمل، پونہ، (13) ڈاکٹر صغیر افراہیم، علی گڑھ، (14) ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، کشمیر، (15) ڈاکٹر راشد انور اللہ، علی گڑھ کو دیا گیا۔

قرۃ العین حیدر ایوارڈ 2014

(1) ڈاکٹر پروین فاطمہ، چینئی، (2) ڈاکٹر جاویدہ حبیب، چینئی، (3) ڈاکٹر آمنہ تحسین، حیدرآباد، (4) ڈاکٹر سیما صغیر، علی گڑھ کو دیا گیا۔

لنچ کے وقفہ کے بعد مشاعرے کا آغاز جناب کاوش بدری اور حیات مدرسی کے نعتیہ کلام سے کیا گیا جسے شاہد مدراسی نے پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب علیم صبا نویدی نے کی اور نظامت کے فرائض جناب منیر احمد جامی بنگلور نے نبھائی۔

پریس ریلیز، اشفاق الرحمان مظہر، سبق سکریٹری/رجسٹرار، تملناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی، چینئی، 1 جنوری 2015

محمد علی جوہر اکادمی کا 26واں جلسہ تقسیم انعامات

نئی دھلی: عظیم مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر اس ملک کی سیاست کے پہلے مرد آہن تھے۔ وہ محض ایک سیاست داں ہی نہیں بلکہ بے باک صحافی، جید عالم دین، مفکر، مدبر، شاعر اور فلسفی بھی تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انھیں بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا جاتا لیکن افسوس حکومت ہی نہیں خود ہم نے بھی ان کی قربانیوں کو فراموش کر دیا اور ان کی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان خیالات کا اظہار جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کے 136ویں یوم پیدائش پر مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 26ویں جلسہ تقسیم ایوارڈ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔

تقریب کی صدارت قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین نسیم احمد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض معصوم مرادآبادی نے انجام دیے۔ 'بی اماں' ایوارڈ حاصل کرنے والی معروف حقوق انسانی کارکن تیستا سیتلواڈ نے کہا کہ ہم تاریخ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ معروف اداکار ٹام آلٹر نے کہا کہ مولانا آزاد پر ڈرامہ کرتے وقت انھیں مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ مولانا محمد علی جوہر پر بھی ڈرامہ لکھا جائے جس میں وہ ان کا رول کریں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر طلعت احمد نے مولانا جوہر کے نام سے منسوب ایوارڈ دیے جانے پر اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ مولانا محمد علی جوہر نے جس یونیورسٹی کا قیام کیا تھا آج وہ اس کے وائس چانسلر ہیں اور آج جامعہ ایک ثمر آور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس سے قبل مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے صدر خواجہ شاہد نے اکادمی کے کام کاج اور حصولیابیوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس موقعے پر اکادمی کے بانی ایم سلیم مرحوم کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کوششوں اور کاوشوں سے اس اکادمی نے اپنی شناخت بنائی اور اب تک اس نے ملک کی متعدد مایہ ناز شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اس موقعے پر تیستا سیتلواڑ کو بی اماں ایوارڈ اور نوجوان ٹی وی صحافی شکیل اختر کو ایم سلیم میموریل ایوارڈ برائے صحافت پیش کیا

محمد علی جوہر اکادمی کے 26 ویں جلسہ تقسیم انعامات کا منظر

گیا۔اس کے علاوہ معروف اداکار ٹام آلٹر، آندھرا پولیس میں ڈائریکٹر جنرل سید انوار الہدیٰ، اتر پردیش قانون ساز کونسل کے سابق رکن خواجہ محمد حلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر طلعت احمد، معروف صحافی منصور آغا اور طب یونانی کے ڈاکٹر (حکیم) اسلم جاوید کو مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ روزنامہ'راشٹریہ سہارا'دہلی، 11 دسمبر 2014

رسم اجرا:

آئین ہند کا عربی ترجمہ

قاہرہ: آئین ہند کے مسودے اور جمہوری اداروں کو برقرار رکھنے میں اس کی ضرورت کے پیش نظر اس کا پہلا عربی ترجمہ جاری کیا گیا۔ کتاب کی رسم اجرا کی تقریب کا انعقاد عرب لیگ کے سکریٹریٹ میں کیا گیا۔ ہندوستانی سفارت خانے نے عرب لیگ کے اشتراک سے اس پروگرام کا انعقاد کیا۔ عرب لیگ کے سکریٹری جنرل نبیل العربی نے وزارت خارجہ کے سکریٹری انیل وادھوا کے ساتھ آئین ہند کا ترجمہ جاری کیا۔ مصر میں ہندوستانی سفیر نودیپ سوری نے آئین ہند کا عربی ترجمہ جاری کیے جانے کو ایک سنگ میل قرار دیا۔ جنرل نبیل العربی نے ہندوستان کے آئین سازوں کا تعارف کرتے ہوئے کہا کہ آئین ہند سماج کے تمام طبقوں کی توقعات پر مکمل اترتا ہے۔

روزنامہ'انقلاب'دہلی، 10 دسمبر 2014

ایک شام بھگوت گیتا کے نام

مقدس گیتا تمام انسانیت کی بہبود اور بقا کے لیے

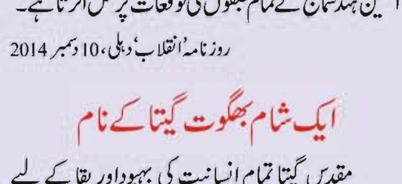

فقط ایک نسخۂ کیمیا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے ہمیں اخوت، امنِ عالم اور کارزارِ حیات میں مسلسل جدو جہد کا پیغام بھی ملتا ہے۔ انور جلالپوری کا یہ تخلیقی کارنامہ جس کے تحت انھوں نے گیتا کے مقدس کلمات کو نہایت ہی آسان اور رواں اردو کا لباس زیب تن کرایا یہ اردو زبان وادب اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کے سفر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تاثرات کا اظہار بین الاقوامی شہرت یافتہ فلم ہدایت کار، فیشن ڈیزائنر اور کلچرل ایکٹیوسٹ مظفر علی نے قیصر باغ واقع اپنی رہائش گاہ کوٹوارہ ہاؤس میں مقبول شاعر انور جلالپوری کی کتاب'اردو شاعری میں گیتا' کی رسم رونمائی کے موقعے پر کیا۔ نشست میں اولاً سید مظفر علی راجہ کوٹوارہ، انور جلالپوری، شہر کے معروف سوشل ورکر اور تاجر عطر فرخ جاوید علوی اور ڈاکٹر منتظر قائمی کے بدست انور جلالپوری کی ذولسانی (اردو۔ ہندی) تخلیق 'اردو شاعری میں گیتا' کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ سامعین میں دیگر معزز افراد کے علاوہ ڈاکٹر خورشید عالم اور آدرش بالیکا ڈگری کالج، گومتی نگر میں شعبۂ تاریخ سے وابستہ ڈاکٹر شمشیر خان نے خصوصی طور سے شرکت کی۔

روزنامہ'انقلاب'لکھنؤ، 5 جنوری 2015

سرسید کے منتخب مضامین، سرسید اور ان کی خدمات

علی گڑھ: قومی اقلیتی کمیشن کے صدر نسیم احمد نے پروفیسر رضاء اللہ خاں کی ترتیب کردہ کتاب'سرسید کے منتخب مضامین' اور'سرسید اور ان کی خدمات' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں ایک خاموش انقلاب کے بانی تھے جنھوں نے برصغیر ہند میں نہ صرف تعلیمی انقلاب برپا کیا بلکہ سماجی اصلاح کے میدان میں بھی قابل ذکر تعاون پیش کیا۔ مسٹر نسیم احمد نے داعلی گڑھ موومینٹ میگزین کے ذریعے سرسید احمد خاں کو بھارت رتن سے سرفراز کیے جانے کے لیے چلائی جارہی دستخطی مہم کے تحت اپنے دستخط ثبت کرتے ہوئے کہا کہ سرسید ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور جدید ہندوستان کی تعمیر میں ان کی خدمات کسی ایک میدان تک محدود نہیں تھیں۔ داعلی گڑھ موومینٹ کے مدیر اعلیٰ جسیم محمد نے کہا کہ سرسید کے تعلق سے کافی غلط فہمیاں رائج ہیں جبکہ سرسید نے ہندو مسلم اتحاد اور قومی تعمیر کے میدان میں جو خدمات انجام دیں وہ ہمارے ملک کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔ پروفیسر رضاء اللہ خاں، پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر شیخ مستان، پروفیسر فرحت اللہ خاں اور پروفیسر شنبھو ناتھ تیواری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ'عزیز الہند'دہلی، 7 دسمبر 2014

سکوت شب

رامپور: رامپور کے مردم خیز قصبہ ٹانڈہ میں زاہد ٹانڈوی کے دوسرے مجموعہ کلام'سکوتِ شب' کی تقریب رسم اجرا کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت محمود الظفر رحمانی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو اتر پردیش نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر ایس ٹی حسن سابق میئر مرادآباد اور مہمان ذی وقار کی حیثیت سے سین شین عالم صدر صولت پبلک لائبریری شریک ہوئے۔ مہمان خصوصی کے دست مبارک سے'سکوت شب' کے اجرا کے بعد صولت لائبریری کی جانب سے صدر لائبریری نے زاہد ٹانڈوی کو اردو ایوارڈ کے ساتھ ہی دوشالہ، اعزاز وسند اعزاز اور ٹرافی بھی پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر زیبا ناز اور سین شین عالم نے زاہد ٹانڈوی کی شاعری پر مقالے پیش کیے بعد ازاں ایک مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔

روزنامہ'عزیز الہند'دہلی، 14 دسمبر 2014

نیلم کی آواز

دربھنگہ: پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ میں 6 دسمبر 2014 کو ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ڈاکٹر امام اعظم کے دوسرے شعری مجموعہ'نیلم کی آواز' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ اس مجموعے میں شاخ کی لچک ہے، پھولوں کی مہک ہے اور اگتے ہوئے خار کی چبھن ہے۔ اس موقعے پر عبدالغنی (ریسرچ اسکالر)، ڈاکٹر آفتاب اشرف، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی، ڈاکٹر ارشد جمیل، پروفیسر انیس صدری (صدر شعبۂ اردو)، ڈاکٹر امام اعظم (صاحبِ کتاب)، پروفیسر رئیس انور، عطا عابدی اور ڈاکٹر اوبناش امن بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ، 15 دسمبر 2014

مولانا احمد رضا خاں حیات وخدمات جدید تحقیقات کی روشنی میں

ملک کے معروف ادیب، محقق اور بچوں کے شاعر ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی کی محققانہ تصنیف'مولانا احمد رضا خاں: حیات وخدمات جدید تحقیقات کی روشنی

ماہنامہ 'گونج' کے اجرا کا منظر

نوائے ادب کا علی سردار پر خصوصی شمارے کے اجرا کا منظر

میں' کی رسم اجرا انجمن فروغِ اردو، دہلی کے زیرِ اہتمام 30 نومبر 2014 کو سنبھل کے چیئرمین کوثر احمد کے دستِ مبارک سے غالب اکادمی دہلی کے آڈیٹوریم میں انجام دی گئی۔

پروگرام کی صدارت پدم شری پروفیسر اختر الواسع صاحب نے فرمائی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پرویز میاں (چیئرمین دہلی حج کمیٹی) زینت بزم ہوئے اور مہمانان اعزازی کے طور پر ڈاکٹر محسن ولی (صدر جمہوریہ ہند کے طبیبِ خاص) سید محمد فاروق (ہمالیہ ڈرگس) مولانا محمد میاں سنبھلی شریک محفل ہوئے۔ رسمِ اجرا کے اس پروگرام میں مہمانانِ اعزازی کے ساتھ ہی دیگر معززین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت درد دہلوی نے کی۔

پریس ریلیز: معین اختر انصاری، صدر انجمن فروغِ اردو، دہلی 6 دسمبر 2014

ماہنامہ 'گونج' کا محمد اسلم فاروقی پر خصوصی شمارہ

نظام آباد: نظام آباد تلنگانہ سے جمیل نظام آبادی کی ادارت میں نکلنے والے موقر اردو ادبی رسالہ 'گونج' نے ماہ دسمبر کی اپنی اشاعت کے طور پر 'ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی فن اور شخصیت نمبر' جاری کیا ہے۔ رسالے کی رسم اجرا تقریب فاروقی ہال کھوجہ کالونی نظام آباد میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت محمد اظہر فاروقی ریٹائرڈ پالی ٹیکنیک لیکچرر نے کی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے جناب جمیل نظام آبادی نے کہا کہ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے دین اور دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہوئے حفظ قرآن کے ساتھ اپنے ادبی اور معلوماتی مضامین کے ساتھ ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ ان کی خدمات نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نے کہا کہ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی اردو کے دانشور ادیب ہیں اور اپنے اختراعی کاموں سے اردو کو ٹیکنالوجی سے جوڑ رہے ہیں۔ محمد عابد علی لیکچرر کامرس گری راج کالج نے کہا کہ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی تحریروں میں روانی ہوتی ہے اور اردو تعلیم و ادب کو پروان چڑھانے میں ان کی خدمات مثالی ہیں۔ محمد عبدالبصیر اور ڈاکٹر محمد عبدالعزیز سہیل نے بھی اسلم فاروقی کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ صدارتی خطاب میں جناب اظہر فاروقی نے کہا کہ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی اپنے خاندان کی علمی وراثت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ گونج خاص نمبر کی اشاعت پر مدیر گونج جناب جمیل نظام آبادی سے اظہار تشکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے کہا کہ علم کی زکوۃ یہ ہے کہ اسے عام کیا جائے اسی مقصد کے تحت وہ اردو کو عام کرنے کے لیے تحریک چلا رہے ہیں۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی، نظام آباد، 7 دسمبر 2014

نوائے ادب کا علی سردار جعفری پر خصوصی شمارہ

مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے زیر اہتمام 'علی سردار جعفری، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس جنم صدی کے موقعے پر دو روزہ قومی سیمینار منعقد ہوا۔ جس میں ہندوستان کے مشہور مایہ ناز ادیبوں نے اپنے مقالات پیش کیے اس سیمینار کے پہلے اجلاس میں نوائے ادب کے خصوصی شمارہ 'علی سردار جعفری' کا اجرا ہوا۔ اس شمارے میں اردو ادب کے مشہور ادیبوں کے کل 28 مضامین شامل ہیں۔

پریس ریلیز: فواد پاٹکا، ممبئی، 8 دسمبر 2014

آواز کا لمس

حیدرآباد: جناب زاہد علی خان ایڈیٹر روزنامہ 'سیاست' نے اردو ادیبوں اور شعرا پر زور دیا کہ وہ سماج کے سلگتے ہوئے مسائل اور سماجی برائیوں کو اپنی تخلیقات کے ذریعہ نمایاں کریں۔ شاعری دراصل مشاہدات اور احساسات کا اظہار ہے اس لیے اردو شعرا کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے کلام کے ذریعہ عوام میں بیداری پیدا کریں۔ جناب زاہد علی خان نامور شاعر سید محمد وزیر آواز جلیلی مرحوم کے شعری مجموعہ 'آواز کا لمس' کی رسمِ اجرا انجام دینے کے بعد گولڈن جوبلی ہال 'سیاست' (عابڈز) میں 'ادارۂ ہماری منزل' کے زیرِ اہتمام منعقدہ ادبی اجلاس کو مخاطب کر رہے تھے۔ جناب عابد صدیقی صدر ایم ڈی ایف، نے صدارت کی۔

بذریعہ ڈاک، شفیع اقبال، ایڈیٹر پروانہ دکن حیدرآباد، 30 دسمبر 2014

ایک ایڈیٹر کی زندگی کا غیر معمولی سفر

کوزی کوڈ: اردو کے مشہور صحافی مرحوم محمد مسلم کی زندگی پر مبنی ملیالم زبان میں پہلی کتاب 'ایک ایڈیٹر کی زندگی کا غیر معمولی سفر' کا اجرا عمل میں آیا۔ اسلامک پبلشنگ ہاؤس کے چیف ایڈیٹر وی اے کبیر کی تحریر کردہ اس کتاب کا اجرا ملیالی روزنامہ مادھیم اور میڈیا ون ٹی وی چینل کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن نے کیا۔ رسم اجرا تقریب کی صدارت کیرالہ جماعت اسلامی کے امیر ٹی عارف علی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 دسمبر 2014

آب رود گنگا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبۂ اردو کی سابق صدر اور عبداللہ ہال کی سابق پرووسٹ پروفیسر ثریا حسین کی نئی کتاب 'آب رود گنگا' کا یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس نمبر ون میں رسم اجرا عمل میں آیا۔ حال ہی میں امریکہ میں مقیم پروفیسر ثریا حسین یونیورسٹی تشریف لائی تھیں۔ پروفیسر ثریا حسین کی کتاب 'آب رود گنگا' ان کی زندگی کے مختلف ادوار کی کہانی ہے جس کو انھوں نے تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پریس ریلیز: محمد فرقان سنبھلی، علی گڑھ، 4 جنوری 2015

بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سینئر استاد پروفیسر سید محمد ہاشم نے کہا ہے کہ دیگر زبانوں کے ادب کو اردو زبان میں منتقل کر کے اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا جا سکتا ہے۔ وہ آج 'حرف زار لٹریری سوسائٹی علی گڑھ' کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام میں علی گڑھ کے ممتاز قلم کار رفیق شاہین کے افسانوی مجموعے 'بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے' کا اجرا کے موقعے پر اپنے ان تاثرات کا اظہار کر رہے تھے۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ رفیق شاہین علی گڑھ کے ممتاز افسانہ نگار اور شاعر ہیں اور اان کی خوبی یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً بیرونی ممالک کے قلم کاروں کی تخلیقات کا اردو

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی کتاب 'متن اور معنی' کے اجرا کا منظر

ڈاکٹر شیخ طاہرہ عبدالشکور کی کتاب 'انقلابی خاتون ساوتری بائی پھولے حیات اور کارنامے' کا اجرا

زبان میں ترجمہ کر کے اسے اردو دنیا سے متعارف کراتے رہتے ہیں۔ پروگرام کی نظامت اویس جمال شمسی نے کی۔ ڈاکٹر مجیب شہزر نے کہا کہ اردو کا نثری ادب خود میں موضوعات کا ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہے پھر بھی دیگر زبانوں کے ادب کی اردو زبان میں ترجمہ کی سخت ضرورت ہے۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 دسمبر 2014

اسلام زد پر کیوں

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ڈاکٹر غلام زرقانی کی تحقیقی کتاب 'اسلام زد پہ کیوں؟' کی رسم اجرا کی تقریب میں کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ آج ہم اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اپنے حقوق نہ ملنے کے شکوہ کناں ہیں لیکن جہاں ہم اکثریت میں ہیں، وہاں کی اقلیت کو وہ سارے حقوق دینے کے لیے کیوں تیار نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ مسئلہ اسلام کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے نام پر اپنا کام چلاتے ہیں۔ پروگرام کے کنو ینز غلام رسول دہلوی نے کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ جلد ہی اس کتاب کے ترجمے ہندی اور انگریزی زبان میں بھی آنے والے ہیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر غلام زرقانی لون اسٹار کالج ہیوسٹن امریکہ میں استاد ہیں۔ پروگرام سے آل انڈیا علما مشائخ بورڈ کے جنرل سکریٹری سید بابر اشرف اور مسجد فتح پوری کے امام مفتی مکرم احمد نے بھی خطاب کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2014

'متن اور معنی'

پٹنہ: جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کے پروفیسر انور پاشا نے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی کتاب 'متن اور معنی' کا اجرا کرتے ہوئے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں کہا کہ شہاب ظفر اعظمی کی تحریروں کو کسی ازم یا چوکھٹے میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اچھا ناقد ہمیشہ اپنے زاویے کھلا رکھتا ہے، وہ تازہ ہواؤں کو نئے دریچوں سے حاصل کرتا ہے، جو شہاب ظفر اعظمی کا وصف ہے۔

واضح ہو کہ شعبۂ اردو میں 10 دسمبر کو ایک اہم تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں شعبے کے استاد اور نوجوان ناقد شہاب ظفر اعظمی کی نئی تصنیف 'متن اور معنی' اور شعبے کے ترجمان 'اردو جرنل' کے تازہ شمارے (5) کی رسم اجرا ادا کی گئی۔ تقریب کی صدارت صدر شعبہ ڈاکٹر جاوید حیات نے کی، جبکہ مہمانان خصوصی و اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر اسلم آزاد، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر اظہار احمد (ایم ایل اے) شریک ہوئے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر ابوبکر رضوی نے کی جبکہ شکریے کی رسم ڈاکٹر ایم عظیم اللہ نے منظوم شکل میں ادا کی۔ پریس ریلیز، شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ، 28 دسمبر 2014

انقلابی خاتون ساوتری بائی پھولے کی حیات اور کارنامے

پونے: 3 جنوری کو ساوتریبائی پھولے کی یوم پیدائش کے موقعے پر پونے مہانگر پالیکا اور پونے سیشن منڈل کی جانب سے پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر اساتذہ کو ساوتری بائی ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقعے پر اردو ادب میں پہلی بار ڈاکٹر شیخ طاہرہ عبدالشکور کی ساوتری بائی پھولے کی زندگی اور ان کے کارناموں پر لکھی مفصل کتاب 'انقلابی خاتون ساوتری بائی پھولے حیات اور کارنامے' اجرا عمل میں آیا۔ ساوتری بائی کی حیات، ان کی سماجی خدمات اور ادبی خدمات پر مراٹھی ادب میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اردو ادب میں ساوتری بائی پھلے کی حیات اور کارناموں پر کتاب دور حاضر کی اشد ضرورت تھی جو ڈاکٹر شیخ طاہرہ کی ادبی کوشش سے پوری ہوئی۔ اس کتاب کو عادل پبلی کیشن پونے نے شائع کیا۔ عادل پبلی کیشن کے کنو ینز شیخ محمد کامل ریاض الدین نے پروگرام کے آخر میں شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جنوری 2015

وفیات

سید حامد

نئی دھلی: سرسید تحریک کے نقیب، حکیم عبدالحمید کے تعلیمی جانشین، قوم کے بے لوث خدمت گار، جامعہ ہمدرد کے سابق چانسلر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد کا مجیدیہ اسپتال میں 29 دسمبر شام تقریباً 5:45 بجے انتقال ہوگیا۔ وہ 94 سال کے تھے۔ بخار کے بعد سینے میں انفکشن اور نمونیا کی شکایت پر انھیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کے پسماندگان میں 2 بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ ان کی تدفین قبرستان پنج پیران حضرت نظام الدین میں عمل میں آئی۔ سرسید کو اپنا آئیڈیل ماننے والے سید حامد کی پیدائش 28 مارچ 1920 کو فیض آباد اتر پردیش میں سید مہدی حسن کے یہاں ہوئی تھی جن کا بنیادی تعلق مرادآباد سے تھا۔ جب سید حامد

چھٹی جماعت میں تھے تب ان کے والد نے رام پور اسٹیٹ کی ملازمت اختیار کرلی تھی، اس لیے ان کے گھر والے رام پور منتقل ہوگئے لیکن ایک سال کے بعد ہی وہ پھر مرادآباد لوٹ آئے اور انھوں نے گورنمنٹ انٹر کالج مرادآباد سے انٹر کیا۔ وہ اپنے کالج کی ہاکی ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ انٹر کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 39-1937 میں بی اے مکمل کیا۔ اس کے بعد اے ایم یو سے ہی انگریزی اور فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد وہ سول سروسز سے جڑ گئے اور اس دوران انھوں نے بجنور، مرادآباد اور بلند شہر میں خدمات انجام دیں۔ 1940 میں انھوں نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا اور حکومت ہند کے کئی اہم محکموں اور وزارتوں میں ذمے داریاں سنبھالیں۔ وہ وزارت خارجہ، تجارت اور انڈسٹری کے علاوہ، پلاننگ کمیشن میں بھی جوائنٹ سکریٹری رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 دسمبر 2014

ایم سلطان

میرٹھ: اردو کے معروف صحافی ایم سلطان کا 30 دسمبر بروز منگل کو علی الصبح مقبرہ ابو چوک، بجریا واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 90 سال تھی اور کافی وقت سے بیمار چل رہے تھے۔ واضح ہو کہ ایم سلطان نے سابقہ 5 دہائیوں سے بھی زیادہ وقت سے اردو و ہندی

اے ایم یو میں (سابق وائس چانسلر سید حامد) تعزیتی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے راحت ابرار، اسٹیج پر وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ، پرو وائس چانسلر سید احمد علی اور دوسری تصویر میں اساتذہ

صحافت میں اپنی اہم خدمات پیش کی ہیں۔ سماج کے تئیں کیے گئے ان کے قابل تحسین کاموں کے لیے اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے انھیں اعزاز سے نوازا تھا۔ ان کی وفات پر شہر کے مختلف اداروں و تنظیموں اور معزز افراد نے غم و رنج کا اظہار کیا۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 31 دسمبر 2014

مقدر حمید

نئی دهلی: اردو کے معروف افسانہ نگار مقدر حمید کا ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ وہ دو بار دل کے دورے جھیل چکے تھے، مگر گزشتہ کچھ دنوں سے 'ہارپک' کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ستر اور اسی کی دہائی میں نئی دہلی سے شائع ہونے والے 'شمع' جریدے میں ان کے افسانے تواتر سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات اور کردار ان کی اطراف کے واقعات اور کرداروں سے ہی اخذ کیے ہوئے ہوتے تھے۔ مقدر حمید کے تین افسانوی مجموعے جن میں 'زربیل' اور 'ابرکاری' وغیرہ شامل ہیں، شائع ہو چکے تھے۔ 1980 کے بعد جب ممبئی میں مقدر حمید کا تعلق انور خان، سلام بن رزاق، ساجد رشید، انور قمر، حفیظ آتش، علی امام نقوی اور مشتاق مومن جیسے تخلیق کاروں سے ہوا تو ان کی تحریروں میں اور زیادہ گہرائی پیدا ہوگئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی 4 جنوری 2014

محمد احمد

نئی دهلی: پرانی دہلی کے کوچہ پنڈت علاقہ کے معروف شاعر و نعت خوان محمد احمد کا 76 برس کی عمر میں دہلی کے لوک نائک جے پرکاش اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ ضعیف العمری کے باعث کافی عرصے سے بیمار چل رہے تھے۔ اچانک طبیعت بگڑنے پر انھیں دلی کے لوک نائک جے پرکاش اسپتال لایا گیا جہاں وہ رو بہ صحت نہ ہو سکے اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ پسماندگان میں بیوی، تین بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ واضح ہو کہ مرحوم محمد احمد پرانی دہلی میں نعت خوانی کے لیے مشہور تھے، ان کی نماز جنازہ مسجد درگاہ فیض الٰہی میں ادا کی گئی جبکہ دہلی گیٹ قبرستان میں سیکڑوں سوگوران کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم ملنسار اور خوش مزاج شخصیت کے مالک تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 14 دسمبر 2014

جبار راجن پردیسی

یہ اطلاع انتہائی رنج و غم سے دی جا رہی ہے کہ ہندوستان کے معروف و مقبول افسانہ نگار ڈاکٹر جبار راجن پردیسی (اترولی، علی گڑھ) کا مورخہ 30 نومبر بروز اتوار 2014 کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔

بذریعہ ڈاک، محمد قیوم میو، نئی دہلی، نومبر 2014

خراج عقیدت

سید حامد

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ سید حامد کا انتقال یونیورسٹی کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے جس کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ جنرل شاہ نے ایڈمنسٹریٹیو بلاک کے کانفرنس روم میں منعقدہ تعزیتی میٹنگ میں تعزیتی قرارداد پڑھتے ہوئے کہا کہ سید حامد صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مایہ ناز سابق طالب علم تھے اور انھوں نے 10 مارچ 1980 کو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنی مادرِ علمی کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ انھوں نے یونیورسٹی کے معاملات کو بہتر بنانے اور اس کو دوبارہ علم و دانش کا بڑا مرکز بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ 1981 کا نفاذ انھیں کے دور میں عمل میں آیا اور طلبہ کے لیے سول سروسز کی تیاری کے لیے انھوں نے خصوصی انتظامات کیے۔ تعزیتی جلسے میں اے ایم یو کے آفیسر برائے رابطہ عامہ ڈاکٹر راحت ابرار نے سید حامد کے کارناموں اور خدمات پر روشنی ڈالی۔ بزنس ایڈمنسٹریشن شعبہ کے پروفیسر پرویز طالب اور یونیورسٹی ہیلتھ سروس کے سی ایم او ڈاکٹر شارق عقیل نے بھی اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے میٹنگ میں دو منٹ کی خاموشی بھی رکھی گئی۔

جامعہ اردو علی گڑھ نے بھی اپنے تعزیتی جلسے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید حامد کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 دسمبر 2014

پروفیسر ریحانہ سلطانہ

حیدر آباد: پروفیسر ریحانہ سلطانہ ڈین اسکول آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسس و صدر شعبۂ تعلیمات نسواں کا 10 دسمبر کو انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی وفات پر تعزیتی نشست کا سی پی ڈی یو ایم ٹی آڈیٹوریم میں انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر محمد میاں وائس چانسلر نے اپنے خطاب میں کہا کہ پروفیسر ریحانہ کافی بیمار تھیں لیکن ان کے کام کرنے کا جذبہ کافی قوی تھا۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے بھرنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، پرو وائس چانسلر نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہم نے ایک بہت ہی اچھی رفیق کھو دی ہے۔ ایسی ہمہ پہلو شخصیت کا چلا جانا ہمارے لیے نقصان کا باعث ہے۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار نے اپنے خطاب میں کہا کہ پروفیسر ریحانہ سلطانہ نے اپنے شعبہ میں بطور خاص اپنے ٹارگیٹ گروپ کو موضوع بنایا۔

اسی طرح کی ایک اور تعزیتی نشست شعبہ تعلیم نسواں اور سینٹر فار ویمن اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے منعقد کی گی۔ جس میں شعبہ کے طلبا، ریسرچ اسکالرس اور تدریسی و غیر تدریسی اسٹاف شریک ہوئے۔

پریس ریلیز: عابد عبدالواسع، پبلک ریلیشنز آفیسر، حیدر آباد، 12 دسمبر 2014

وقار قادری

هزاری باغ: وقار قادری کی رحلت پر ایک تعزیتی نشست زیر اہتمام سخنوران ادب ہزاری باغ منعقد ہوئی۔ ادبی تنظیم کے سبھی ممبران نے مختلف انداز میں جناب وقار قادری کی ناقدانہ محققانہ ادبی شخصیت پر روشنی ڈالی اور موصوف کی رحلت پر افسوس کا اظہار کیا۔ تنظیم کے سکریٹری نے کہا کہ وقار قادری نے 'سخنوران جھارکھنڈ' (حصہ اوّل) جیسی کتاب میں مقدمہ اور 'تذکرۂ شعرائے جھارکھنڈ' لکھ کر ریاست بھر کے چھوٹے بڑے شاعروں کو اردو دنیا میں ایک صف میں کھڑا کر کے سب سے بہترین کارنامہ انجام دیا ہے۔ سرور الزماں سرور نے اپنی نقابت و صدارت میں کہا کہ جناب وقار قادری ایک مخلص انسان تھے۔

پریس ریلیز: حسن امام فدائی، سکریٹری، سخنوران ادب، ہزاری باغ، (جھارکھنڈ)، 16 دسمبر 2014

کتاب میلے کے دلکش مناظر

URDU DUNIYA Monthly, February-2015, Vol.17, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: **24/01/2015**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

کتاب میلے کے دلکش مناظر

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

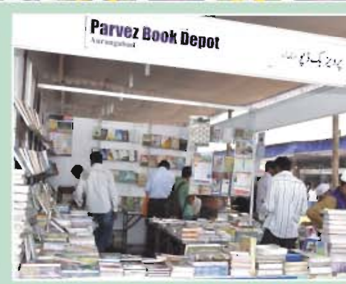

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000